باپو کے قدموں میں

مصنفہ

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد

(صدر جمہوریہ ہند)

کا ترجمہ

ناشر

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

عنوان

PRINTED AT Q PRESS
29 MOHAMMADALI ROAD BOMBAY 3

فہرست مضامین

پیش لفظ

یہ کتاب ایک مثال ھے اس مصیبت کی جو چھاپے خانوں کی بد انتظامی بے پرواھی اور بد معاملگی کی وجہ سے کتابوں کے شایع کرنے والوں اور لکھنے والوں پر نازل ھوا کرتی ھے۔

نومبر سنہ ۵۱ میں اس کتاب کی طباعت کا معاھدہ ایک پریس سے ھوا تھا اور معاھدے کی ایک شرط یہ تھی کہ تین ماہ کے اندر اس کتاب کی چھپائی مکمل ھو جائیگی۔ جب سینکڑوں خوشامدوں اور تقاضوں کے بعد بھی جنوری سنہ ۵۳ تک یہ پریس آدھی کتاب بھی نہ چھاپ سکا، تب میں نے کسی نہ کسی طرح مسودات اس سے واپس لئے، اور میں مشکور ھوں بمبئی کے «کیو» پریس اور محبی خلیل شرف الدین صاحب کا جنھوں نے میری خاطر بقیہ کتاب کے چھاپنے کی ذمہ داری قبول کی اور بہت توجہ اور محنت سے اس کتاب کو تیار کر دیا۔ اسطرح ۷ سو صفحات کی یہ کتاب ۱۴ مہینوں کی بے انتہا پریشانی اور کوفت کے بعد شایع ھو سکی۔

میں اپنا دکھڑا لے بیٹھا، ورنہ سب سے پہلے تو مجھے

صدر جمہوریہ محترم ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نیازمندانہ شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ موصوف نے مجھے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی. پھر مجھے اس کتاب کی ہندی اشاعت کے پبلشر شری اجنٹا پریس پٹنہ کا شکریہ بھی ادا کرنا ھے جنہوں نے اس بات کا لحاظ کرکے کہ انجمن ترقی اردو پبلک کی خدمت کرنے والا ادارہ ھے اور کوئی تجارتی ادارہ نہیں ھے، بغیر کسی معاوضہ کے اپنے حق اشاعت کو انجمن کی طرف منتقل کرنے کی اجازت دی.

ملک کے محترم اور محبوب رهنما «راجندر بابو» کے قلم سے اس زمانے کی داستان — جب پہلی دفعہ هندستان آنے کے بعد مہاتما گاندھی خدمت خلق کے میدان میں آئے اور پہلی مرتبہ «راجندر بابو» انکے ساتھیوں کی صف میں نمایاں ہوئے — هندستان کی آزادی کی تاریخ کا ایک بہت اهم جزو ھے. کسطرح مہاتماجی نے اپنے ساتھیوں کی اخلاقی تعمیر شروع کی اور کسطرح سول نافرمانی کا بیج اپنے وطن کی سر زمین پر ڈالا — یہ ایک بصیرت افروز کہانی ھے، جو بہت سیدھے سیدھے اور سادہ الفاظ میں بیان کی گئی ھے.

ایک قابل قدر نمونہ ھے اور میں سمجھتا ھوں کہ انجمن ترقی اردو نے اسکو اردو رسم الخط میں منتقل کرکے اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ھے.

میں نہایت ادب کے ساتھ محترم صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں انجمن کا یہ ھدیہ عقیدت پیش کرتا ھوں.

۱۸ اگست سنہ ۵۳ ع
علی گڈھہ

محمد عبد الغفار
جنرل سکریٹری
انجمن ترقی اردو (ھند)

ب

دیباچہ

گنگا کی مقدس دھار حسب دستور چل رہی ہے ۔ کچھ بزرگ اور عقیدتمند اپنی محبت اور پریم کی پیاس بجھانے کے لئے اس میں سے تھوڑا بہت پانی لے لیتے ہیں جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے وہ اتنا ہی اس میں سے پانی لے سکتا ہے ۔ کوئی ہردوار ہی کے پاس سے سیکڑوں کوس کی نہر نکال کر جنتا کی خدمت کے لئے کروڑوں بیگہ زمین کو سیراب کرتا ہے ۔ کوئی بدنصیب اسی گنگا کے کنارے رہ کر اس کے فیض سے محروم رہتا ہے ۔ چھوٹے موٹے لوگ اپنی طاقت کے موافق بڑے گھڑے یا چھوٹے لوٹے ہی میں اس متبرک پانی کو لے سکتے ہیں ۔ لیکن گنگا ہے کہ بہتی

ھی چلی جا رھی ھے اور جہاں جہاں اس کی دھار پہونچتی جاتی ھے ۔ وھاں کی زمین سیراب اور سرسبز ھوتی جاتی ھے ۔ یہی صورت مہاتما گاندھی کی ھے کہ جس میں جتنی سکت اور چاہ تھی ۔ اس نے اسی کے موافق اس گنگا روپ مہاتما سے فیض حاصل کرلیا ۔ اگر مین اس فیض سے محروم رھا تو یہ میری بدنصیبی ھے ۔ بہرحال ان معاملات کی جو کچھ بڑائی اور ھمت اپنی سمجھ میں آئی ان کو میں نے یہاں بیان کرنے کوشش کی ھے ۔

اس کی کتابت کا کام والمیکی چودھری نے بڑی محنت سے کیا ۔ جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ھوں ۔

راجندر پرشاد

نئی دھلی

۲۴ جون ۱۹۵۰ع

اور ادھوری تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ نہیں کے برابر تھی تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ بہار کے نوجوانوں کے نیتا مرحوم برجکشور پرشاد جی تھے وہ وہاں کی شکایتوں سے کافی واقف تھے۔ کیونکہ اس زمانہ کی "لیجسلیٹیو کونسل" کے وہ ممبر تھے جہاں انہوں نے اس معاملے مین کئی بار سوالات کئے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقہ سے بھی اس بات کا چرچا کونسل میں کیا تھا۔ شری راجکمار شکل پہلے مہاتما گاندھی سے ملے اور انکو چمپارن کا دکھڑا سنایا بابو برجکشور پرشاد جی بھی شاید ان لوگوں کے ساتھ گاندھی جی سے ملے۔ اور سب نے گاندھی جی پر زور دیا کہ وہ چمپارن کے متعلق کانگرس میں ایک ریزولیوشن خود پیش کرکے منظور کرائیں تو بہت اچھا ہو لیکن گاندھی جی نے ریزولیوشن پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انکا کہنا تھا کہ جب تک میں خود دیکھکر ان باتوں کو اچھی طرح نہ جانچ لوں اسوقت تک مین ریزولیوشن پیش نہیں کر سکتا۔ ہاں، میں اس کے لئے چمپارن جا کر خود دیکھونگا کہ جو کچھ تم لوگ کہتے ہو وہ کہانتک ٹھیک ہے۔ چنانچہ یہ تجویز بابو

برجکشور نے پیش کی اور شری راجکمار شکل نے تائید
کی اور وہ تجویز کمیٹی میں اتفاق رائے سے پاس ہوگئی.
یہ شاید پہلا ہی موقع تھا کہ ایک دیہاتی ان پڑھ کسان
کانگرس کے پلیٹ فارم سے کسی ریزولیوشن کی تائید میں
بولا ہو. لکھنؤ میں گاندھی جی سے ملاقات کا یہ پہلا موقع
تھا لیکن پھر بھی اس کو صحیح معنوں میں ملاقات نہیں
کہا جا سکتا.

کانگریس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے.
لیکن راجکمار شکل نے گاندھی جی سے یہ وعدہ لے لیا
تھا کہ جب کبھی وہ بہار کی طرف سے گذریں گے تو
چمپارن بھی جائیں گے اور وہاں کی حالت دیکھیں گے. مارچ
سنۂ ۱۹۱۷ میں گاندھی جی کو ایکبار کلکتہ جانا پڑا، چنانچہ
انہوں نے راجکمار شکل کو خط لکھا کہ وہ ان سے کلکتہ
میں ملیں اور وہاں سے وہ ان کو چمپارن لیجائیں. لیکن
بد قسمتی سے وہ خط راجکمار شکل کو اس وقت ملا جبکہ
گاندھی جی کلکتہ سے واپس چلے جا چکے تھے. بہار کے
دیہاتوں میں ڈاکیہ (چٹھی رساں) ہفتہ میں ایک یا دو بار سے

زیادہ ڈاک لیکر نہیں جاتا۔ راجکمار شکل ضلع چمپارن کے رہنے والے تھے۔ جو ایک چھوٹا ضلع سمجھا جاتا اور اس کے بھی اس حصہ میں وہ رہتے تھے جو سب سے زیادہ دور افتادہ ھے۔ اس لئے اس خط کا وقت پر نہ ملنا کچھ اچنبھے کی بات نہ تھی۔

اپریل سنہ ۱۹۱۷ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ایسٹر کی چھٹیوں میں کلکتہ میں ھونیوالا تھا۔ گاندھی جی اسمیں شریک ھونے کے لئے کلکتہ گئے۔ جس کی اطلاع انھوں نے راجکمار شکل کو دے دی۔ وہ اس دفعہ خط کے وقت پر مل جانے سے کلکتہ پہنچ گئے۔ اور شری بھوپندر ناتھ باسو کے مکان پر۔ جہاں گاندھی جی ٹھہرے ہوئے تھے۔ جا کر ان سے ملے۔ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر تھا۔ اور اس جلسہ میں شریک تھا۔ اتفاق سے جلسہ میں میں گاندھی جی کے بہت نزدیک ھی بیٹھا تھا۔ لیکن وہ مجھے نہیں جانتے تھے اور نہ میں یہ جانتا تھا کہ وہ کلکتہ سے ھی سیدھے بہار جانے والے ھیں۔ راجکمار شکل ان کے ساتھ جلسہ تک تو گئے لیکن باھر ھی ٹھہر گئے اس لئے

میری ملاقات ان سے بھی نہیں ہوئی. جلسہ ختم ہونے پر
میں « جگ.ساتھ پوری » چلا گیا، اور ادھر گاندھی جی
راجکمار شکل کے ساتھ پٹنہ چلے آئے. ایک دوسرے سے
جان پہچان نہونےکی وجہ سے، پاس بیٹھے رہنے پر بھی، ہم
ایک دوسرے کے پروگرام کو نہ جان سکے ورنہ میں شاید
ان کے ساتھ ہی بہار چلا جاتا. ادھر میں « پوری » پہونچا
اور ادھر گاندھی جی میرے گھر پٹنہ پہنچے.

میں کلکتہ میں وکالت کیا کرتا تھا. مگر جب مارچ
سنۂ ۱۹۱٦ میں بہار کے لئے پٹنہ میں الگ ہائی کورٹ کھلا
تو میں پٹنہ چلا آیا اور وہیں وکالت کرنے لگا، کرایہ کے
مکان میں رہتا تھا، گھر کے لوگ ساتھ نہیں رہتے تھے. وہ
لوگ بھائی کے ساتھ چھپرا یا موضع « جیروانی » میں رہا کرتے
تھے، اس لئے پٹنہ میں نوکر ہی ساتھ رہا کرتے تھے.
کلکتہ بہار سے بہت دور پڑتا تھا، اور بہاریوں کیلئے وہ
ایک اجنبی جگہ تھی، اس لئے جب کوئی معمولی آدمی
وہاں ہائی کورٹ میں مقدمہ کے لئے جاتا، تو وہ زیادہ تر
کسی وکیل یا مختار کے پاس ٹھرتا، ایک تو کوئی دوسری

جگہ اس کو ایسی نہین ملتی جہاں وہ ٹہر سکتا، اور دوسرے اس زمانہ میں نہ تو ہوٹلوں کا اتنا رواج تھا اور نہ ہمار کے گاؤں کا رہنیوالا کوئی آدمی ہوٹل میں رہکر وہاں کھانا پسند کرتا اس لئے ہماری وکیلوں کا گھر موکلوں کے لئے تو دھرم شالہ جیسا تھا۔ کوئی کوئی وکیل تو موکلوں سے کھانے کے دام بھی لے لیتے تھے مگر مین ایسا نہین کرتا تھا، جو کوئی میرے یہاں ٹہر جاتا تھا اس کو مین بغیر دام لئے ہی اپنے گھر پر ٹہراتا اور کھانا کھلاتا تھا۔ ہم لوگ جب کلکتہ سے پٹنہ آئے تو یہ دستور بھی اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اس لئے پٹنہ مین بھی کبھی کبھی موکل آ کر ہمارے گھر پر ٹہر جایا کرتے تھے۔ ان کے لئے ایک کمرہ بھی مخصوص کر رکھا تھا۔ نوکر لوگ بھی جان گئے تھے کہ موکلوں کو کہاں ٹہرانا چاہئے۔ اور ان کیساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے جب مین آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ مین شریک ہونے کیلئے کلکتہ گیا تھا، اور وہاں سے «پوری» چلا گیا، تو پٹنہ کے وہ نوکر جو میرے ساتھ نہین گئے تھے، چھٹی مین اپنے اپنے گھر چلے گئے

تھی ، صرف ایک نوکر ، جو نرا دیہاتی تھا ، مکان کی دیکھ بھال کے لئے رہ گیا تھا.

پٹنہ میں پہنچ کر راجکمار شکل گاندھی جی کو میرے گھر لے گئے. کیونکہ وہ کسی اور کو نہیں جانتے تھے. جن کے یہاں وہ گاندھی جی کو ٹھہراتے ، میں بد نصیب وہاں موجود نہ تھا. نوکر نے گاندھی جی کو ایک دیہاتی موکل سمجھ لیا. اسمیں اس بیچارے کا کوئی قصور نہ تھا. کیونکہ راجکمار شکل تو دیہاتی موکل تھے ہی. دیہاتی بولی میں اور رہنے سہنے میں بھی وہ چمپارن ہی کے تھے. گاندھی جی کی وضع قطع بھی کچھ ویسی ہی تھی. میں نے اوپر لکھا ہے کہ جلسہ وغیرہ میں گاندھی جی. دھوتی ، اچکن کاٹھیاواڑی پگڑی استعمال کیا کرتے تھے. اسی وضع میں میں نے ان کو کلکتہ کے استقبالی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں دیکھا تھا ، لیکن عام طور سے وہ دھوتی ، کرتا اور دیسی ٹوپی پہنا کرتے تھے ، جو بعد میں «گاندھی ٹوپی» کے نام سے مشہور ہوئی. اس قطع کی ٹوپی بہار اور یو پی (صوبہ متحدہ) میں بہت سے لوگ پہنا کرتے تھے.

مگر «گاندھی ٹوپی» اور ان ٹوپیوں میں بڑا فرق یہ تھا کہ «گاندھی ٹوپی» ہمیشہ کھادی کی ہوا کرتی تھی، «گاندھی جی» کی وضع قطع سے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کوئی بڑے آدمی ہیں. اس لئے اس نے ان کو موکل ہی کیطرح ٹھرایا اور ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا، یہاں تک کہ اس پاخانے کو بھی نہیں استعمال کرنے دیا، جو خاص گھر کے مالک کے استعمال میں رہا کرتا تھا. گاندھی جی نے روزانہ کے معمول کے موافق غسل بھی نہیں کیا اور سوچ ہی رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے کہ اتنے میں مظہرالحق صاحب کو خبر لگی کہ گاندھی جی پٹنہ آئے ہوئے ہیں اور میرے ہاں ٹھرے ہیں، مظہرالحق صاحب گاندھی جی کے دکھنی افریقہ کے کاموں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو بہت پہلے سے بھی جانتے تھے کیونکہ بیرسٹری پاس کر کے دونوں ایک ہی جہاز میں لوٹے تھے، گاندھی جی کو میرے مکان سے اپنے گھر لے گئے اور ان کو انہوں نے اپنے ساتھ ٹھرایا، گاندھی جی چمپارن پہونچنے کے لئے بے چین تھے. لیکن شام سے پہلے

وھاں کے لئے کوئی گاڑی نہیں تھی. اس لئے شام ھی کی گاڑی سے جانے کا فیصلہ کرنے وہ روانہ ھو گئے. مظفر پور راستہ میں پڑتا ھے. جہاں ترھٹ ڈویژن کا کمشنر رھتا تھا. نیل والوں کی انجمن بنام "بہار پلانٹر ایسوسی ایشن" کا دفتر بھی وھیں تھا اور اس کا صدر بھی وھیں رھا کرتا تھا اس لئے انھوں نے یہ سوچ کر کہ چمپارن پہنچنے سے پہلے ان لوگوں سے مل لینا اچھا ھوگا، مظفر پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا.

جو تجربہ انکو پٹنہ میں میرے گھر پر ٹھہرنے میں ھوا تھا اسکی وجہ سے انھوں نے راجکمار شکل پر اپنے ٹھہرنے ٹھہرانے کا بوجھ نہ ڈالا بلکہ انھوں نے خود ھی اس کا بندوبست کر لیا. اچاریہ کرپلانی اس زمانے میں مظفر پور میں پروفیسر تھے. گاندھی جی سے ان کی ملاقات تو نہیں تھی. لیکن ان سے خط و کتابت رھتی تھی اس لئے گاندھی جی ان کو جانتے تھے. چنانچہ پٹنہ سے چلتے وقت انھوں نے کرپلانی جی کو تار دے دیا تھا. کرپلانی جی چند شاگردوں کے ساتھ اسٹیشن پر ان سے ملنے آئے. گاڑی

وہاں آدھی رات کے وقت پہنچتی تھی۔ کرپلانی جی بھی گاندھی جی کے رہن سہن سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے اس لئے سب لوگ اسٹیشن پر ان کو اونچے درجے کے ڈبے میں تلاش کرنے لگے۔ گاندھی جی اس وقت تک اپنی چھوٹی گٹھری لئے ہوئے۔ راجکمار شکل کے ساتھ تیسرے درجے کے ڈبہ سے اتر کر پلیٹ فارم سے باہر جانے کے لئے پھاٹک کیطرف جا رہے تھے جب کرپلانی جی اور ان کے ساتھیوں کو گاندھی جی اونچے درجہ میں نہ ملے تو وہ لوگ پلیٹ فارم پر ان کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ راجکمار شکل ان کی دوڑ دھوپ سے سمجھ گئے۔ کہ یہ لوگ گاندھی جی کی تلاش میں ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک سے انہوں نے پوچھا کہ آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں۔ شکل جی کو نرا دیہاتی سمجھ کر کسی نے جواب تک نہ دیا اس وقت راجکمار شکل نے خود ہی کہا «کیا آپ لوگ کرم ویر گاندھی جی کو تلاش کر رہے ہیں؟ وہ میرے ساتھ یہ ہیں» یہ بات سن کر سب لوگ جمع ہو گئے۔ گاندھی جی دھوتی۔ کرتا اور ٹوپی پہنے

ہوئے تھے۔ بغل میں ایک چھوٹی گٹھری تھی، جس میں بچھانے کے لئے بستر وغیرہ اور پہننے کے کپڑے تھے۔ جس سے سوتے وقت تکیہ کا کام بھی لے لیا کرتے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ٹین کا ڈبہ تھا۔ جس میں کھانے کے لئے کھجوریں اور مونگ پھلیاں تھیں۔ راحکمار شکل اپنا سامان اور لوٹا اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔

گاندھی جی سے مل کر سب بہت خوش ہوئے۔ کرپلانی جی جو کالج کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ گاندھی جی کو اپنے ساتھ ہوسٹل میں لے گئے اور انہوں نے ان کو وہیں ٹھہرایا۔ اگرچہ یہ پورا گورنمنٹ کالج نہیں تھا لیکن چونکہ اس کو گورنمنٹ سے کافی امداد ملا کرتی تھی اس لئے اس پر گورنمنٹ کا پورا پورا اختیار تھا، کہ کالج کا پرنسپل اس زمانہ میں کوئی نہ کوئی انگریز جو آئی۔سی۔ایس (ایجوکیشنل سروس) کا ہی ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ مجھکو یاد نہیں کہ اس وقت کون پرنسپل تھا۔ کرپلانی جی نے گاندھی جی کو اپنے ہاں ہوسٹل میں ٹھہرا تو لیا لیکن وہ ان کو وہاں رکھ نہ سکے۔ چنانچہ دوسرے دن گاندھی جی

ایک وکیل کے گھر جا کر ٹھہر گئے، تھوڑے ہی دنوں میں اس قصور پر کرپلانی جی کو نوکری سے استعفاء دینا پڑا، اور وہاں سے چھٹی پا کر گاندھی جی کے ساتھ چمپارن میں کام کرنے لگے۔

گاندھی جی کمشنر اور نیل والوں کی « انجمن » کے صدر سے ملے۔ اور ان کو اپنا مقصد بتایا۔ ان لوگوں نے گاندھی جی کو چمپارن جانے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ « رعایا کی شکایتوں کی جانچ گورنمنٹ کرا رہی ہے۔ چمپارن میں « مروے سٹلمنٹ » کے افسر کام کر رہے ہیں اس لئے جو کچھ بھی شکایت ہوگی اس پر غور کر کے گورنمنٹ مناسب کار روائی کرے گی، آپ کے جانے سے رعایا بھڑکے گی۔ اس طرح سے لڑائی کے زمانہ میں گڑ بڑ ہو سکتی ہے جو کسی طرح مناسب نہیں ہے » اس وقت جرمنی کا فرانس پر دھاوا ہوا تھا۔ اور بہت شدت سے لڑائی ہورہی تھی ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ « بہت سے نیل والے لڑائی پر چلے گئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں کسی بڑی تحریک کا اٹھانا ٹھیک نہیں ہوگا » اس طرح کی باتیں کہکر گاندھی جی

کو وہاں جانے سے روکا اور رعایا کی شکایتوں کو مبالغہ آمیز
اور غلط بتایا، گاندھی جی نے تار دیکر بابو برجکشور پرشاد
کو دربھنگہ سے بلا لیا تھا، کیونکہ وہی اس معاملے کو
اچھی طرح جانتے تھے، گاندھی جی کہتے تھے کہ «جس
قدر وہ لوگ روکنے میں زور دیتے تھے اسی قدر ان کے
دل میں شک بڑھتا اور خیال مضبوط ہوتا جاتا تھا، کہ کچھ
دال میں کالا ضرور ہے، انہوں نے آخر مین دو تین
ملاقاتوں کے بعد چمپارن جانیکا ارادہ کر ہی لیا.

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چمپارن کی بہت سی
رعایا یہ سن کر کہ گاندھی جی انکی مدد کیلئے مظفر پور
تک آگئے ہیں چمپارن سے ان کے پاس چلے آئے، اور ان
لوگوں نے اپنا اپنا دکھڑا ان کو سنایا جس سے راجکمار شکل
کی کہی ہوئی باتونکی تصدیق ہوگئی، چمپارن کی رعایا اتنے
عرصہ تک ظلم سہتے سہتے ڈرپوک بھی ہو گئی تھی،
جسکی وجہ سے نیل والوں کے خلاف کچھ کہنے کی ہمت
نہیں پڑتی تھی، نیل والوں کا گورنمنٹ کے افسروں پر بہت
اثر تھا. کیونکہ ان کے دوست اور مددگار مقامی حکام

سے لیکر ولایت تک میں تھے۔ ان کے مظالم کی خبریں مقامی حکام تک پہنچتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ بھی کسانوں کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتے تھے اور جب معاملہ بگڑ جاتا تو گورنمنٹ بھی کچھ نام نہاد کارروائی کر دیا کرتی، جس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا تھا، کبھی کبھی رعایا بھی بگڑ کر بلوہ اور فساد کرنے لگتی تھی۔ نیل والوں میں سے دو ایک کو انہوں نے مار بھی ڈالا اور انکی دو ایک کوٹھیوں کو جلا بھی دیا، لیکن اس قسم کے بلوہ اور فساد کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اور بھی پیسے جاتے۔ کچہریوں کے ذریعہ سے پھانسی اور قید کی سزا کے علاوہ دوسرے قسم کی سزائیں بھی انہیں ملتیں۔ ان کے گھر اور کھیت لوٹ لئے جاتے، مویشی وغیرہ بھگا دئے جاتے، گھروں میں آگ لگا دی جاتی، وہ خود بھی پیٹے جاتے اور ساتھ ہی انکی بہو بیٹیوں کی عزت بھی برباد کی جاتی۔ فساد کے بعد « نیل والے » اور سرکاری کارکن ان کو اتنا دباتے کہ بہت دنوں تک تو ضلع بھر میں موت کا سا سناٹا چھایا رہتا۔ جس علاقہ میں فساد ہوتا، وہاں تعزیری پولس بٹھا

دی جاتی، جہاں اس کا یہ کام تھا کہ کسانوں کو خوب لوٹے اور کھسوٹے، اس کے علاوہ پورا خرچ بھی گورنمنٹ رعایا سے وصول کرتی. دو ایک بار گورنمنٹ نے جانچ کرنے کیلئے خاص افسروں کو بھیجا. ان کی رپورٹ کسی حد تک ان کے موافق ہوتی لیکن کونسل میں بہت چرچا ہونے کے باوجود وہ شائع نہیں کی گئی، کسان اتنے ڈر گئے تھے کہ کسی نیل والے یا اس کے ملازم کے خلاف کسی قسم کی شکایت لیکر کسی عدالت و کچہری میں نہیں جاتے تھے، جب انکی شکایتیں کونسل میں پیش کی جاتیں تو گورنمنٹ کا جواب یہی ہوتا کہ کسانوں کو اگر موٹی شکایت ہوتی تو وہ خود ہی عدالت میں پیش کرتے، چونکہ وہ لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں، اس لئے یہ تو کچھ باہر ہی کے شورشی لوگونکی شرارت ہے جو « نیل والوں » کی شکایت کرتے ہیں، یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کسانوں میں سے کسی نے ہمت کر کے نالش کر بھی دی، تو « نیل والوں » کے جو آدمی وہاں لگے رہتے تھے، وہ اس کو مجسٹریٹ کے سامنے ہی اجلاس سے گھسیٹ کر باہر

لاتے اور اس کو خوب پیٹتے. اس لئے شکایتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ لوگ ڈر کی وجہ سے کچہری تک نہیں پہنچ پاتے تھے.

گاندھی جی کے دو چار آدمیوں کے سوا. جنہوں نے یا تو کہیں کچھ سن لیا تھا. اور یا اخباروں میں پڑھ لیا تھا. کسانوں میں سے شاید ہی کوئی کچھ جانتا ہوگا. میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ مجھ جیسا ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا اور پبلک مسئلوں مین کچھ دلچسپی رکھنے والا آدمی بھی ان کے بارے میں بہت تھوڑا ھی جانتا تھا. تو بیچارے محض جاھل کسانوں کو کیا معلوم ہوتا. جو چمپارن جیسے پست ضلع کے گاؤں کے رہنے والے اور نیل والوں کے ستائے ہوئے خوفزدہ تھے لیکن انھوں نے اتنا سن لیا تھا کہ انکی مدد کرنیوالا کوئی مظفر پور تک آ گیا ھے اور نہ معلوم ان کے دل میں یہ خیال کیسے جم گیا تھا کہ وہ آدمی ان کا ھمدرد بھی ھے. نہ معلوم وہ ڈر جو ھمیشہ ان کو ستایا کرتا تھا، کہاں چلا گیا اور ان میں سے سیکڑوں مظفر پور آ کر گاندھی جی سے ملے.

گاندھی جی نے چمپارن جانیکا ارادہ کر ھی لیا، یہانتک کہ تاریخ اور وقت بھی طے ہو گیا۔ موتی ھاری نے مشہور وکیل بابو گورکھ پرشاد جو کسانونکی کچھ مدد کیا کرتے تھے، مظفر پور آ گئے۔ انھوں نے اپنے گھر پر ٹھرنے کیلئے گاندھی جی کو دعوت دی۔ گاندھی جی کیلئے دشواری یہ تھی کہ وہ وھاں کی دیہاتی بھوجپوری بولی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ کچھ ھندی جانتے تھے لیکن وہ بھی اتنی نہیں کہ وہ اس سے اپنا سب کام نکال سکیں۔ کسان بھی ٹھیک طرح سے اپنی بولی کے سوا دوسری بولی خاص کر گاندھی جی کی، نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے ایسے آدمیونکی ضرورت تھی، جو ترجمانی کا کام کر سکیں۔ بابو برج پرشاد جنکی وکالت بہت بڑھی چڑھی تھی، اس وقت کسی خاص مقدمہ کی وجہ سے دو چار روز تک گاندھی جی کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ایک دوست ، بابو دھرنی دھر ، کو جنکی وکالت بھی اچھی چمک گئی تھی اور بابو رام نومی پرشاد کو جو ابھی نوجوان تھے اور تھوڑے ھی دنوں سے وکالت کر رہے تھے

ترجمانی کیلئے گاندھی جی کے ساتھ کر کے خود اپنے کام سے کلکتہ چلے گئے۔

مظفر پور میں دو ھی تین دن گاندھی جی ٹھرے اور اسی درمیان میں یہ سب باتیں ہوئیں، اس کیساتھ ھی انہوں نے آس پاس کے گاؤں کی حالت بھی دیکھی چاھی چنانچہ مظفر پور کے کچھ دور کے کئی مواضعات کو جا کر دیکھا بھی، بہار ایک غریب صوبہ ھے۔ زمین اگرچہ بہت زرخیز ھے لیکن پھر بھی مفلسی بہت ھے۔ خاص کر اتری بہار میں جہاں آبادی بھی بہت ھے۔ گاندھی جی کو دیہات کی ابتری اور گندگی دیکھکر بہت تکلیف ہونی۔ اور غریب عورتونکی حالت کو دیکھ کر تو بہت ھی دکھ ہوا انہوں نے فوراً ھی اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ جب تک ان غریب گانوں والوں اور ان گانووں کی حالت نہیں سدھرے گی اس وقت تک ھندوستان کا بھلا کیسے ھو سکتا ھے۔ ان دو تین دنوں ھی میں گاندھی جی کی بات چیت سن کر اور ان کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر بہتیرے لوگ دنگ رہ گئے۔ گاندھی جی چمپارن ضلع کے صدر مقام

موتی هاری پہنچے تو وہاں سیکڑوں کسان ان کے استقبال
کیلئے ریلوے اسٹیشن پر آ گئے. گورکھ بابو کے گھر پر
ان کے پہنچتے ہی لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور وہ اپنی اپنی
آپ بیتی سنانے لگے. گاندھی جی پر ان باتوں کا اثر ضرور
ہو رہا تھا لیکن پھر بھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے
یہ سب کچھ نہ دیکھ لیتے اس وقت تک ان کو پورا
یقین نہ ہوتا. اتفاق سے ان کے پہنچنے سے دو ہی چار
روز پہلے ایک عزت دار کسان کو ایک نیل والے نے بہت
ستایا تھا. وہ شخص سیکڑوں بیگھہ زمیں جوتتا تھا اور اتنا
دھنی اور مالدار تھا کہ اس کے دروازے پر ہاتھی بندھا رہتا
تھا، جو بہت دھنی اور عزت والے ہی رکھ سکتے تھے.
نیل والوں نے پولس کی مدد سے اس نے گھر کو لٹوا
لیا تھا، اس کے کھیت کی کھڑی فصل کو مویشیوں سے
چروا دیا تھا، اس کے باغ کے درختوں خاص کر کیلے کے
درختوں کو ہاتھیوں سے روندوا دیا تھا اور اس کے کھپریلوں
کو، چھپروں کو لاٹھیوں سے توڑوا کر چور چور کرا دیا
تھا. کسی وجہ سے ناخوش ہو کر یہ برتاؤ کیا گیا تھا.

اس لوٹ کھسوٹ کے سب نشانات جوں کے توں موجود تھے۔ اس نے گاندھی جی کے پاس آ کر اپنی رام کہانی سنائی۔ گاندھی جی نے ارادہ ظاہر کیا کہ اس لوٹ کھسوٹ کے نشانات بہ خود جا کر دیکھیں گے۔ لہذا سواری کے لئے اس نے اپنا ہاتھی بھی لا کر پیش کیا۔ موتی ہاری پہنچنے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر ہی یہ فیصلہ ہو گیا تھا۔ لہذا دوسرے ہی دن نو دس بجے گاندھی جی اپریل کی دوپہر کی دھوپ کی پروا نہ کرتے ہوئے اس گانوں کے لئے جو وہاں سے دس گیارہ میل تھا۔ روانہ ہو گئے۔

ادھر گاندھی جی کی وجہ سے سرکاری حلقوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی اور مظفر پور کے کمشنر نے چمپارن کے ضلع مجسٹریٹ کو حکم بھیج دیا تھا کہ گاندھی جی کو چمپارن سے چلے جانے کا حکم دے دے۔ ضلع مجسٹریٹ نے یہ حکم پاتے ہی ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱٤٤ کے موافق گاندھی جی کو حکم دیا کہ " آپ چمپارن سے پہلی گاڑی سے چلے جائیے " وہ حکم گاندھی جی کو موتی ہاری سے گاؤں کیلئے روانہ ہونے تک نہیں ملا کیونکہ وہ بابو دھرنی دھر

اور بابو رام نومی پرشاد کیساتھ روانہ ہو چکے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے پولس سب انسپکٹر ضلع مجسٹریٹ کا ایک خط لیکر کچھ میل دور گاندھی جی سے ملا اور اس نے ان سے کہا کہ "ضلع مجسٹریٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں" گاندھی جی اس پولس افسر کیساتھ اسی سواری پر مجسٹریٹ سے ملنے کیلئے روانہ ہو گئے لیکن انہوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ سب لوگ گاؤں تک جا کر وہاں کا سب حال دیکھیں اور شام یا رات تک واپس آجائیں۔ موتی ہاری لوٹنے پر پہلے مجسٹریٹ نے ان سے واپس جانے کیلئے کہا لیکن جب انہوں نے اسکی یہ بات نہ مانی تو اس باضابطہ حکم دے دیا۔ گاندھی جی نے بھی اسی طرح سے جواب دے دیا کہ "وہ حکم نہ مانینگے مجسٹریٹ جو چاہے کر لے" اس پر مجسٹریٹ نے کہا کہ "عدول حکمی کا مقدمہ آپ پر چلایا جائیگا" اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ "جب تک باضابطہ کارروائی نہ ہو اس وقت تک آپ دیہاتوں میں نہ جائیں" گاندھی جی نے اس حکم کو مان لیا اور باضابطہ کارروائی کا انتظار

کرنے لگے اس کے لئے بہت دنوں تک نہ ٹھہرنا پڑا کیونکہ اسی دن "سمن" آیا اس کے دوسرے ہی دن مقدمہ کی پیشی مقرر تھی۔

گاندھی جی نے اس رات بہت محنت کی۔ سب سے پہلے انہوں نے تمام دوستوں اور مددگاروں کو تار کے ذریعہ سے مقدمہ کی خبر دی۔ میرے نام بھی ایک تار پہونچا جس میں لکھا تھا کہ "مجسٹریٹ نے مجھے چمپارن چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ھے میں نے اسکی تعمیل نہیں کی اسلئے اب مقدمہ چلنے والا ھے۔ جس کا انتظار کر رھا ھوں۔ ایک تار انہوں نے اپنے جنوبی افریقہ کے ساتھی اور دوست "مسٹر پولک" کے نام پریاگ (الہ‌آباد) بھیجا۔ جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے تھے۔ گاندھی جی سے سمندر پر ہندوستانیوں کے مسئلوں کے متعلق ان سے اچھی ملاقات تھی، مہاتما جی نے ان کے نام ایک خط بھیجا جس میں تمام واقعات کے ساتھ برٹش گورنمنٹ سے اپنا پرانا تعلق بھی بتایا اور آخر میں یہ لکھا کہ "اسی گورنمنٹ نے ان

کو پبلک خدمات کے صلہ میں سونے کا « قیصر ہند »
تمغہ دیا ہے، جس کی وہ کافی قدر کرتے ہیں. مگر جبکہ
گورنمنٹ کا ان پر بھروسہ نہیں رہا اور وہ ان کو رعایا کی
خدمت کرنے دینا نہیں چاہتی تو یہ ان کے لئے ناموزوں
ہے کہ وہ اس تمغہ کو رکھیں اور اسلئے انہوں نے جن
لوگوں کے پاس وہ تمغہ رکھا ہے ان کو لکھ بھیجا ہے
کہ وہ اس کو آپ کے پاس واپس کر دیں» انہوں نے تار
کے علاوہ بہت سے دوستوں کے پاس خطوط بھی لکھے
جس میں اس وقت تک کا پورا تفصیلی حال لکھ بھیجا،
اس کے علاوہ اس مقدمہ کی پیشی کیلئے اپنا ایک بیان
تیار کیا، جس کو انہوں نے دوسرے دن پیشی کے
وقت پڑھا.

یہ سب کرتے ہوئے رات کا بڑا حصہ گذر گیا. ان
تاروں، خطوں اور بیان کو صرف لکھا ہی نہیں. تقریباً
سب کی نقلیں بھی کر کے اپنے پاس رکھیں، آدھی رات
کے بعد « بابو دھرنی دھر » اور « بابو رام نومی » اس گاؤں
سے جہاں ان کو گاندھی جی نے تحقیقات کرنے کے لئے

بھیجا تھا. لوٹے. اسی وقت گاندھی جی نے وہاں کا حال
سن لیا اور جو کچھ ان لوگوں سے الگ ہونے کے بعد
ہوا تھا وہ سب ان سے کہہ دیا. ان لوگوں نے یہ بھی کہہ
دیا کہ مقدمہ کی پیشی کے بعد ان کو سزا ضرور ہو گی اور
جیل چلے جائیں گے، اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ "اس
کے بعد آپ لوگ کیا کرینگے؟" یہ سوال ایسا تھا کہ اس کا
جواب دینا ان لوگوں کیلئے مشکل تھا کیونکہ اس قسم کے
واقعہ کا ان لوگوں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا کوئی
دوسرا موجود بھی نہ تھا جس سے رائے لیتے. اور اسکے
ساتھ ھی بغیر جواب دئے رہ بھی نہیں سکتے تھے. بابو
دھرنی دھر ایک بڑے صاف اور کھرے بولنے والے. اپنی
قسم کے بے ڈھنگے آدمی تھے. وکالت خوب چل رھی تھی
اور سوال جواب کرنا جانتے ھی تھے. انہوں نے جواب
دیا کہ "آپ تو ہم لوگوں کو ترجمانی کے کام کیلئے لائے
تھے. وہ کام آپ کے جیل جانے کے بعد ختم ہو جائیگا.
اور ہم لوگ بیکار ہوجائینگے اس لئے ہم لوگ اپنے گھروں
کو لوٹ جائینگے" مہاتما جی نے پوچھا "اور کیا آپ لوگ

ان غریب کسانوں کو یوں ھی چھوڑ دینگے؟» انہوں نے جواب دیا « اور ہم لوٹ کر ھی کیا سکتے ھیں کیونکہ ہم سمجھ ھی نہیں سکتے ھیں کہ ہم لوگ اور کیا کر سکتے ھیں لیکن اگر آپ چاھیں تو جس طرح ان کی حالت دیکھی اور ان کی شکایتوں کی جانچ کرنی آپ چاہتے تھے. اس طرح جب تک ہم لوگوں سے یہ ھو سکیگا، ہم کرینگے. مگر گورنمنٹ نے اگر ہم لوگوں کو بھی آپ ھی کی طرح ضلع چھوڑ کر چلے جانیکا حکم دیا تو ہم لوگ آپکی طرح عدول حکمی نہیں کرینگے بلکہ اسکی تعمیل کر کے چپ چاپ چلے جائینگے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو سب باتیں سمجھا کر کام جاری رکھنے کیلئے بھیج دینگے» مہاتما جی یہ گفتگو سن کر خوش ھوگئے لیکن پوری طور پر مطمئن نہیں ھوئے، اور کہا « بہت اچھا ایسا ھی کیجئے گا اور جہاں تک ھو سکے سلسلہ جاری رکھئے گا. یہ باتیں سن کر کے وہ سب لوگ سونے چلے گئے، رات تھوڑی ھی رہ گئی تھی.

جواب تو گاندھی جی کو ان دونوں نے دے دیا تھا، مگر وہ خود بھی مطمئن نہ تھے، وہ آپس میں بات چیت کرنے

لگے کہ ہم لوگ جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور کسانوں کی مدد کا دم بھرا کرتے ہیں، دو چار دن کے بعد اپنے گھروں کو چلے جائینگے. وکالت سے پیسے کمانے اور چین آرام سے دن گذارنے لگیں گے اور یہ ایک اجنبی اور انجان آدمی، جس کا نہ تو اس صوبہ سے تعلق ہے اور نہ کسانوں سے کوئی پہلے کی واقفیت یا واسطہ. ان غریبوں کے لئے جیل خانہ میں پڑا رہے گا. یہ بات تو کچھ ٹھیک نہیں ہوگی. ادھر وطن میں دوستوں کو جیل جانے کی اطلاع کرنی تو الگ بات ہے. خود سوچا بھی نہیں تھا، بال بچوں کا کیا ہوگا؟ اور سزا ہونے کے بعد اگر وکالت کی سند چھین لی گئی تو پھر کیا ہوگا؟ اس ادھیڑ بن میں باتیں کرتے کرتے باقی رات بھی گذر گئی.

گاندھی جی کا طریقہ بہار ھی کے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے نیا تھا. کسی نے اس سے پہلے اس طریقہ سے کام کرنا نہیں سکھایا تھا. اس سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے اس کا اندازہ بھی کسی کو نہ تھا، ان میں محنت کی عادت اور کام کرنے کی طاقت بھی حیرت میں ڈالنے والی تھی.

ساری رات جاگ کر لکھنا اور دوسرے دن کے لئے سب کچھ تیار کر لینا ایک ایسی حیرت انگیز بات تھی جس کی مثال وہاں کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

جب مجھے تار ملا تو میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ بابو برجکشور کو جو ہم لوگوں کے گرو تھے اور جو اسوقت کلکتہ گئے ہوئے تھے، میں نے سب باتیں تار کے ذریعہ بتائیں اور لکھا کہ "آپ کل صبح تک پہونچ جائیے" مہاتما جی سے میں نے تار کے ذریعہ سے پوچھا کہ مجھ سے کیا خدمت ہوسکتی ہے؟ میں سمجھا کہ شاید مقدمہ کی پیروی میں وکالت کرنی پڑے اور کچھ کتابیں بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ اس قسم کا حکم اس دفعہ کی تحت دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مظہرالحق صاحب سے بھی ملا اور سب باتیں ان کو بتائیں۔ تار کا جواب مل چکا تھا کہ دوستوں کے ساتھ آجاؤ، ادھر مسٹر پولک کا بھی تار پٹنہ پہنچ گیا کہ وہ پٹنہ آرہے ہیں اور گاندھی جی کے بلانے پر سیدھے چمپارن چلے جائینگے۔ ہم نے ارادہ کرلیا کہ مرحوم "شمبھو سرن" اور شری انوگر نارائن سنگھ

کو اپنے ساتھ لیکر دوسرے روز سویرے کی گاڑی سے چمپارن چلے جائینگے۔ مظہرالحق صاحب نے بھی جانے کا ارادہ کرلیا۔ مسٹر پولک تو جانیوالے تھے ھی، بہت سویرے بابو برجکشور بھی پہنچ گئے۔ اب ہم لوگ سب چمپارن کیلئے روانہ ہوگئے۔ وہ گاڑی موتی ھاری دن میں تین بجے پہنچا کرتی تھی۔ مسٹر پولک نے راستہ میں گاندھی جی کے کام کرنے کا پورا طریقہ پوری تفصیل سے ہم لوگوں کو بتایا اور یہ بتایا کہ وہ تمہاری وکالت کی مدد وہاں نہیں چاھیں گے۔ بلکہ کسی دوسری طرح سے تم لوگوں کو اس کام میں لگا دیں گے جو وہاں کرنا چاھتے ھیں۔ ہم لوگ راستہ میں باتیں کرتے جارھے تھے اور ادھر مقدمہ کی پیشی ھو رھی تھی۔ دوسرے دن گاندھی جی سویرے ھی تیار ھو کر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ھوکر کچہری کیلئے روانہ ہوئے وہ دونوں جو کچھ رات بھر سوچتے رھے تھے، اسی سوچ میں اب بھی تھے، لیکن اب ان سے نہ رھا گیا اور انہوں نے گاندھی جی سے کہا ” اگرچہ ہم نے اس بارے

میں اس سے پہلے کبھی سوچا تو نہیں تھا مگر جب آپ اتنی دور سے آ کر ان غریبوں کے لئے جیل خانہ جا رہے ہیں تو پھر یہاں کے رہنے والے ہم لوگ آپ کو اکیلا چھوڑ دینا کیسے برداشت کرسکیں گے اس لئے اب ہم نے بھی سوچا ہے کہ جب آپ جیل چلے جائیں تو ہم لوگ کام جاری رکھیں گے۔ اور ضرورت پڑے پر ہم لوگ بھی جیل جائیں گے» یہ سنتے ہی گاندھی جی کا چہرہ کھل گیا اور وہ فوراً کہہ اٹھے «تب تو فتح ہے» انہوں نے جنوبی افریقہ کی بہت کچھ باتیں سنائیں، اس عرصے میں وہ کچہری تک پہنچ گئے۔

کچہری میں آج ایک نیا سماں تھا، گاندھی جی کے مقدمہ کی خبر پھیل چکی تھی اور کسانوں کی ایک بھیڑ وہاں جمع ہوگئی تھی، وہ لوگ اپنے ہمدرد کا درشن کرنے اور مقدمہ میں کیا ہوتا ہے یہ دیکھنے کیلئے گانوں سے آگئے تھے، وہ لوگ وہی کسان تھے جو ڈر کے مارے کبھی کچہری کے نزدیک نیل والوں کے خلاف نالش کرنے نہیں آتے تھے لیکن آج گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی

کرنے والے کے مقدمہ کی پیشی دیکھنے وہاں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور جب مجسٹریٹ کے پہنچنے پر مقدمہ شروع ہوا، تو کمرہ کے اندر گھسنے میں اتنی دکھم دکھا اور گڑ بڑ ہوئی کہ کواڑوں کے شیشے بھی ٹوٹ گئے اور پولس ہکی بکی رہ گئی۔ نہ معلوم لوگوں کا وہ ڈر کہاں چلا گیا۔ اور وہ جوش و ہمت کہاں سے آ گئی۔

صرف ہم نے ہی یہ سوچنے میں غلطی نہیں کی تھی کہ گاندھی جی کے مقدمہ کی پیروی ہمیں کرنی پڑے گی۔ سرکاری وکیل نے بھی سوچا کہ مقدمہ کی پیروی کیلئے گاندھی جی کی طرف سے بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹر آئیں گے۔ گاندھی جی خود بھی بیرسٹر ہیں اس لئے وہ قانون کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر اور تیار ہوکر کچہری آئیں گے۔ یہ ایک قانونی سوال اس مقدمہ میں ضرور اٹھتا تھا کہ وہ حکم قانون کے مطابق ٹھیک تھا یا نہیں۔ اور اگر وہ ٹھیک نہیں تو اس کی خلاف ورزی کیلئے سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ میں جو کچھ تھوڑا سا سوچا تھا تو اس وقت اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ضلع مجسٹریٹ کا حکم قانوناً غلط ہے۔ اور ان کو اس کی

عدول حکمی پر سزا نہیں ہو سکتی تھی، شاید سرکاری وکیل نے بھی سوچا تھا کہ اس طرح کی بحث کی جائیگی اور اس کا جواب دینے کے لئے انہوں نے مسالہ تیار کر لیا تھا، لیکن جب مقدمہ پیش ہوا تو یہ ساری کتابی محنت بیکار اور غیر ضروری ثابت ہوئی، مقدمہ پیش ہونے پر سرکاری وکیل نے گواہ پیش کیا۔ اور اس سے اس طرح پوچھنے لگے۔ جس کے جواب سے یہ ثابت ہوا کہ گاندھی جی پر وہ حکمنامہ باضابطہ تعمیل ہوگیا تھا، جسکی خلاف ورزی کرنے پر مقدمہ چل رہا تھا گاندھی جی نے حاکم سے کہا کہ گواہی غیر ضروری ہے اس میں کیوں ہمارا اور آپ کا وقت ضائع کیا جائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ حکم مجھکو ملا تھا اور میں نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو مجھے جو بیان کرنا ہے اور جس کو میں لکھ کر لایا ہوں پڑھ دوں۔

مجسٹریٹ اور سرکاری وکیل دونوں کیلئے اور دوسرے جتنے لوگ کچہری میں موجود تھے، سب کے لئے مقدمہ کی پیروی کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ تھا، اور سب اچنبھے

مین رہ گئے کہ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے. مجسٹریٹ نے بیان پڑھنے کی اجازت دیدی گاندھی جی نے اسے اسطرحسے سنایا.

« عدالت کے حکم سے میں مختصر طور پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ نوٹس کے ذریعہ سے مجھسے جو حکم دیا گیا اس کی خلاف ورزی میں نے کیونکی. میرے خیال میں یہ میرے اور مقامی حاکمون کے درمیان اختلاف رائے کا سوال ہے. میں اس صوبہ میں قومی اور انسانی خدمت کرنیکے خیال سے آیا ہون یہان آ کر ان کسانون کی مدد کرنے کیلئے. جنکے ساتھ کہا جاتا ہے کہ « نیل والے صاحب لوگ » اچھا برتاؤ نہیں کرتے مجھ پر بہت زور دیا گیا تھا لیکن جب تک میں سب باتیں اچھی طرح نہ جان لیتا اس وقت تک کسانون کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا. اسلئے میں اگر ہوسکے تو حاکمونکی اور نیل والونکی مدد سے سب باتیں جاننے کیلئے آیا ہون میں کسی دوسرے مقصد سے یہاں نہیں آیا ہون مجھسے یقین نہیں ہوتا کہ میرے یہان آنیسے کسی قسم کی بدامنی یا بے چینی ہوسکتی ہے. میں کہہ سکتا ہون کہ ایسی باتون کا مجھسے خود بہت خیال رہتا ہے حکام کو جو مشکلات ہوتی ہیں انکو میں سمجھتا ہون میں یہ بھی مانتا ہون

انکو جو حکم ہوتا ہے صرف اسی کے مطابق وہ کام کرسکتے
ہیں ، قانون ماننے والے شخص کی طرح میرا رجحان یہی ہونا
چاہئے تھا . اور یہی رجحان ہوا بھی کہ میں اس حکم کی تعمیل
کروں لیکن میں ان لوگوں کی خاطر جن کیلئے یہاں آیا ہوں
اپنے فرض سے ہٹ نہیں سکتا تھا . میں سمجھتا ہوں کہ میں
ان لوگوں میں رہ کر ہی ان کی بھلائی کیلئے کچھ کرسکتا ہوں
اس لئے خوشی سے میں اس مقام سے نہیں جا سکتا تھا . دو
فرائض کے باہم اختلاف کی حالت میں میں صرف یہی کرسکتا
تھا کہ اپنے آپ کو یہاں سے ہٹانے کی ساری ذمہ داری حاکموں
پر ڈال دوں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہندوستان کی
پبلک زندگی میں مجھ جیسی حیثیت کے لوگوں کو نمونہ یا مثال
پیش کرنے میں بہت ہی متوجہ رہنا پڑتا ہے . میرا مضبوط
بھروسہ ہے . کہ جس حالت میں میں ہوں . اسی حالت میں
ہر ایک عزت دار شخص کیلئے وہی کام کرنا سب سے اچھا ہے
جسے کرنے کا اس وقت میں نے ارادہ کرلیا ہے اور وہ یہ
ہے کہ بغیر کسی قسم کی مخالفت کے حکم نہ ماننے کی سزا
سہنے کیلئے تیار ہوجاؤں میں نے جو بیان دیا ہے وہ اسلئے

نہیں ھے کہ جو سزا مجھے ملنے والی ھے وہ کم کی جائے بلکہ یہ دکھانے کے لئے کہ میں نے سرکاری حکم کی خلاف ورزی اس وجہ سے نہیں کی کہ میرا سرکار کے بارہ میں عقیدہ نہیں ھے بلکہ اس وجہ سے کی ھے کہ میں نے اس سے بھی بڑھ کر حکم یعنی اپنی عقل کے حکم کی تعمیل کو مناسب سمجھا »

یہ بیان سنتے ھی سب لوگ دنگ رہ گئے اس طرح کا بیان اس سے پہلے شاید ھندوستان کے کسی برٹش کچہری میں نہ کسی نے دیا تھا اور نہ سنا تھا. مجسٹریٹ بھی ھکا بکا رہ گیا، اس نے تو سوچا تھا کہ اور مقدموں کی طرح اس میں بھی گواھی ھوگی اور اس کے بعد بحث ھوگی اور ان سب باتوں میں کافی وقت لگیگا. اس وقت تک وہ ضلع مجسٹریٹ سے بھی مشورہ کرسکے گا کہ اسے کیا فیصلہ کرنا چاھئے اور کتنی سزا دینی چاھئے وغیرہ وغیرہ لیکن اس بیان کے بعد نہ تو گواھی کی ضرورت رھی اور نہ بحث کی اب صرف ایک بات رہ گئی تھی. وہ یہ کہ کیا اور کتنی سزا دینی چاھئے، اس کے لئے ابھی وہ تیار نہ تھا. اس نے کہا:

آپ نے بیان تو پڑھ دیا لیکن جو کچھ آپ نے ابتک کہا ھے اس میں آپ نے صاف نہیں کہا ھے کہ آپ قصور وار ھیں یا نہیں »

گاندھی جی نے جواب دیا کہ « مجھسے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا » اس پر اس نے یہ سوچ کر کہ ابھی بحث کی گنجائش ھے کہا کہ « تو پھر مجھسے گواھی بھی لینی اور بحث بھی سننی پڑیگی » گاندھی جی بھی بھلا کب چوکنے والے تھے انہوں نے فوراً جواب دیا کہ « اگر ایسا ھے تو لیجئے میں اقبال کرتا ھوں کہ میں قصور وار ھوں » اب اس کے پاس کوئی بھی راستہ وقت ٹالنے کا نہیں رھا اس لئے اس نے کہا کہ « میں چند گھنٹوں کے بعد حکم سناؤنگا » اس عرصے کیلئے آپ ضمانت دے کر جاسکتے ھیں » گاندھی جی نے جواب دیا کہ « میرے پاس کوئی ضمانت دینے والا نہیں ھے اس لئے میں ضمانت نہیں دونگا » اب اس کیلئے پھر ایک سخت مشکل سوال سامنے آ گیا کہ آیا گاندھی جی اسوقت تک پولس کی حوالات میں رکھے جائیں یا کیا کیا جائے ؟ اس نے کہا کہ « اگر ضمانت نہیں دے سکتے ھیں تو ذاتی مچلکہ دیدیجئے

گاندھی جی نے جواب دیا کہ "میں یہ بھی نہیں کرسکتا ھوں" اس پر اس نے کہا کہ "اچھا میں تین بجے حکم سناؤنگا اس وقت آپ حاضر ھوجائیے" گاندھی جی نے کہا "ھاں وقت پر ضرور حاضر ھوجاؤنگا"

مجسٹریٹ اجلاس سے اٹھکر چلا گیا. گاندھی جی کہیں دوسری جگہ جانیوالے تھے کہ ضلع سپرنٹنڈنٹ پولس کی طرف سے پیام آیا کہ وہ ان سے ملنا چاھتا ھے. پولس سپرنٹنڈنٹ انگریز تھا. جو شاید جنوبی افریقہ کا رھنے والا تھا یا جنوبی افریقہ سے اس کا کوئی تعلق تھا. اس سے وہ ملے اور وہ کچھ دیر تک باتیں کرتا رھا. جس میں شاید جنوبی افریقہ کے متعلق بھی کچھ باتیں تھیں. جب تین بجے کا وقت قریب آیا تو مجسٹریٹ نے گاندھی جی کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ اس دن حکم نہیں سنائیگا اور اس کے لئے پانچ چھ روز کے بعد کا کوئی دن مقرر کردیا. یہ سن کر گاندھی جی اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے. وھاں بھی کسانوں کی بھیڑ جمع تھی.

ادھر تقریباً اسی وقت ھماری گاڑی پہونچی اور ھم لوگ

سیدھے گاندھی جی کی قیام گاہ پر پہنچے کہ وہ بھی کچہری سے تھوڑی دیر پہلے واپس آئے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھکر خاص کر مظہرالحق صاحب اور مسٹر پولک کو دیکھکر خاص طور سے خوش ہوئے۔ ہم لوگوں کا ایک ایک کر کے تعارف کرایا گیا، جب میری باری آئی تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے «آپ بھی آ گئے میں تو آپ کے گھر گیا تھا» یہ پہلے الفاظ تھے جو انہوں نے خاص طور پر مجھ سے کہے اور میں نے سنے۔ میں یہ سن کر شرمندہ ہوا، کیونکہ جو برتاؤ ان کے ساتھ میرے گھر پر ہوا تھا وہ میں نے سن لیا تھا، انہوں نے سمجھ لیا کہ میں کچھ شرمندہ ہو رہا ہوں۔ بس فوراً یہ بات کاٹ کر مقدمے کی باتیں ہم لوگوں سے کرنے لگے، اس وقت تک جو کچھ ہوا تھا مختصر طور پر وہ سب بتا دیا اور آخر میں کہا کہ آپ لوگوں کے جو دو ساتھی ہیں ان سے پوری کیفیت سب لوگ سن لیجئے۔ میں مسٹر پولک سے بات کرتا ہوں اس قیام گاہ میں ایک برآمدہ تھا جس میں ایک چوکی رکھی تھی اس پر گاندھی جی بیٹھے ہوئے تھے، وہ چوکی اتنی

بڑی نہیں تھی کہ اس پر سب بیٹھ سکتے۔ اس لئے کچھ بیٹھ کر اور کچھ کھڑے ہوکر باتیں سنتے رہے، آخر میں ہم لوگ کمرہ کے اندر چلے گئے اور وہاں سب باتیں پوری تفصیل کے ساتھ اپنے دوستوں سے سن لیں۔ ان لوگوں کے جیل جانے کے ارادوں کو بھی سن لیا اس کے بعد وہی سوال ہم لوگوں سے بھی کیا گیا۔ ان دونوں کے ارادوں کے بعد ہم لوگ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے بھی وہی ارادہ کر لیا۔

گاندھی جی جب مسٹر پولک سے باتیں کر چکے۔ اور ہم لوگوں کے پاس آئے تو انہوں نے ہم سے پوچھا کہ سب باتیں معلوم ہو گئیں۔ ہمارے «ہاں» کہنے کے بعد ایکبارگی انہوں نے جیل جانے کا سوال بھی کر لیا۔ ہم لوگوں نے اس سوال کا جواب جیسا ہونا چاہئے تھا ویسا دے دیا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے لیکن اسی حد تک وہ بات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لیکر کہا کہ «ہمارے جیل چلے جانے کے بعد آپ لوگ دو دو آدمیوں کی ٹولی میں جانچ کا کام جاری

رکھیں گے اور جب گورنمنٹ ایک ٹولی کو جیل بھیج دے تو دوسری ٹولی آجائے اور اس طرح سے آپ لوگ کام چلاتے رہئے، اور اگر دوسرے بھی آپ ھی کی طرح تیار ہوجائیں تو وہ بھی ایسا ھی کریں۔ یہ کہکر انہوں نے موجودہ لوگوں کی تین ٹولیاں بنادیں۔ جس میں سے مظہرالحق صاحب، بابو برجکشور اور مجھے لیڈر بنادیا۔ اور سب کے نام بھی لکھ ڈالے۔ ہم لوگوں میں سے کوئی بھی اسکے لئے تیار ہوکر نہیں آیا تھا یہ پہلا کام اچانک کرنا پڑا تھا، ہم نے سوچا کہ یہ اچھا ہوا کہ پانچ چھ روز کا وقت مل گیا اس درمیان میں ہم سب اپنا نجی کاروبار سمیٹ لینگے۔ مظہرالحق صاحب کے پاس ایک سشن (دورہ) کا مقدمہ تھا جس کی پیشی اسی زمانہ میں ہونے والی تھی، انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس عرصے میں وہ اس مقدمہ کو اس دن تک جس روز مجسٹریٹ حکم سنانے والا تھا، ختم کر کے واپس آجائینگے تا کہ گاندھی جی کے جیل جانے کے بعد چمپارن کی لیڈری سنبھال لیں۔ بابو برجکشور پرشاد بھی اسی طرح کچھ کام پورا کر کے اس دن تک واپس

آجائیں گے، یہ ارادہ کر کے وہ دونوں دوسرے روز سویرے چلے گئے، ہم لوگ رہ گئے.

گاندھی جی کے پاس ضلع مجسٹریٹ کا خط آیا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ "ساری باتیں اس نے گورنمنٹ کو لکھ بھیجی ہیں" اور زور دیا کہ جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوجائے، گاندھی جی گانوؤں میں نہ جائیں. گاندھی جی نے اس بات کو مان لیا اور ہم لوگ وہیں اس دن کا انتظار کرنے لگے. لیکن اس خط کے پہنچنے پر گاندھی جی کو کچھ ایسا خیال ہوگیا کہ شاید اب گورنمنٹ اس چیز کو آگے نہیں بڑھائیگی اور جیل جانے کا مسئلہ نہیں ہوگا. پھر بھی یہ تو غیر یقینی تھا ہی، انہوں نے اس دن جو کچھ ہوا تھا اس کی اطلاع دوستوں کے پاس اور بڑے بڑے اخباروں کے ایڈیٹروں کے پاس لکھ بھیجی. ایڈیٹروں کو سب باتوں سے واقفیت کے لئے انہوں نے اطلاع دیدی. لیکن ان کی طرف سے کچھ چھاپنے کے لئے نہیں تھا. البتہ اخباروں میں جو کچھ چھپا وہ نامہ نگاروں کی دی ہوئی خبر تھی گاندھی جی کی دی ہوئی نہیں.

باب دوم

گاندھی جی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی جس میں ان سے میری دو بدو باتیں ہوئیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا ہو کہ میرے دل پر کوئی بہت بڑا اثر ہوا ہے یا ساتھ ہی ساری زندگی کا رخ اس ملاقات کے ہوتے ہی بدل گیا ہو بہرحال یہ کیسے ہوا میں نہیں کہہ سکتا، مرحوم گوکھلے سے میری ملاقات کئی برس پہلے ہوئی تھی انہوں نے مجھے بلایا تھا اور «سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی» میں شریک ہونے کیلئے کہا تھا، کچھ دیر تک باتیں ہوئی تھیں، دل پر اثر ہوا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ جیسا وہ کہتے ہیں ویسا کرنا چاہئے، کئی روز تک اس پر میں سوچتا بھی رہا لیکن ویسا کر نہ سکا، اس دفعہ کیوں اور کیسے یہ خیال ہوگیا میں نہیں کہہ

سکتا، صرف جیل خانہ جانے ھی کی بات اس دفعہ میرے سامنے آئی. ساری زندگی کو ملک کی خدمت میں لگا دینے کا خیال سامنے نہیں تھا لیکن اس طرح اپنی خوشی سے جیل جانے کا طریقہ بھی تو میرے ھی لئے نہیں بلکہ سارے ملک کیلئے نیا تھا. اسوقت ہم لوگ جیل جانے کا کام کرتے ہوئے بھی اپنے تئیں جیل سے بچانے ھی میں عقلمندی اور ہوشیاری سمجھتے تھے اگر بغاوت کی کوئی بات ہم کرنی چاھتے. تو کرتے تو تھے لیکن ایسی باتیں کرتے وقت ہمیشہ تعزیرات ہند دفعہ ۱۲٤ (الف) کو سامنے رکھ کر اس طریقہ سے کرتے تھے کہ جس سے اس کے جال میں نہ پھنسیں. ہم سانپ بھی مارنا چاھتے اور ساتھ ھی لاٹھی بھی بچا لینا چاھتے تھے. اور جو اس طرح جتنی کامیابی سے باتیں کرسکتا تھا وہ اتنا ھی ہوشیار سمجھا جاتا. انقلاب پسند لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لیکر کام کرتے تھے لیکن ساتھ ھی جہاں تک ہوسکتا تھا اپنی بچت کا بھی راستہ کھلا رکھتے، جان بوجھ کر کوئی آگ میں کودنا نہیں چاھتا تھا. مقدمہ چلتا تھا تو بچاؤ کیلئے وکیلوں کی مدد لی جاتی

تھی اور جو کچھ بھی بچاؤ کیلئے مقدمہ کی پیروی میں ضروری سمجھا جاتا، کیا جاتا تھا۔ شاید ھی کوئی اپنے قصور کا اقبال کرتا۔ ہم تو اسی طریقہ کو اس وقت تک جانتے تھے اور اس وقت ہم نے اس طرح کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا تھا، میں اپنے کو خیالات اور مزاج کے اعتبار سے نرم دل سمجھتا تھا اور آج بھی سمجھتا ہوں۔ کیوں اور کیسے؟ اچانک ایسا ارادہ میں نے کرلیا جو صرف ذاتی یا انفرادی زندگی کیلئے ھی ایک نیا راستہ نہیں بتاتا تھا بلکہ اس نے ملک کے سب لوگوں کی زندگی کیلئے بھی ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا، البتہ ہمارے سامنے اپنے ان دو دوستوں کا ظاہر کیا ہوا ارادہ تھا جو وہاں پہلے سے گاندھی جی کیساتھ آئے تھے لیکن ہمارے ساتھ مظہرالحق صاحب اور بابو برجکشور پرشاد آئے تھے۔ وہ دونوں ھی ان سے بڑے سمجھے جاتے تھے۔ تو کیا دھرنی دھر اور بابو رام نومی نے بغیر سوچے سمجھے ھی پیروی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا؟ اور کیا ہم نے بھی اسی طرح ان کی پیروی کی؟ کیا یہ صرف

ایک بھیڑیا چال تھی ؟ ان سب باتوں کی چھان بین کچھ وقفہ کے بعد ھی کی جاسکتی ھے لیکن اس تھوڑے وقت میں مجھے جہاں تک یاد ھے میں نے کوئی خاص غور نہیں کیا اور جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ھوں پہلے ملاقات کا میرے خیال میں کوئی اتنا بڑا اثر مجھ پر نہیں ھوا تھا کہ جو بات مرحوم گوکھلے کی ملاقات اپنے گہرے اثر کے باوجود نہیں کر سکی تھی وہ یہ ملاقات کر دیتی پھر بھی ایسا ھوا تو یہ ھوسکتا ھے کہ باپو کی قوت کشش نے خفیہ طور پر کام کیا اور ھم کو ان کے اثر کا پتہ بھی نہ لگنے دیا۔

میں نے پہلی ملاقات کی باتوں کی اتنی پوری وضاحت اس لئے کی ھے کہ پڑھنے والے پوری طرح سے صحیح باتوں سے واقف ھوجائیں، کیونکہ جو کچھ ان چند دنوں میں گاندھی جی نے چمپارن میں کیا اسی کا اثر " نان کواپریشن " تحریک کے ذریعہ سارے ملک میں بھی پھیلا۔ وھاں انہوں نے پیپل کا وہ بیج لگا دیا جس کو کسی نے دیکھا بھی نہیں اور وقت پا کر وھی اگا اور بڑا درخت ھوگیا جس

کے سائے میں ملک نے غیر ملکی راج سے نجات پانی
اور اسی کے سایہ میں ہم سچے آریہ سوراج پانے کی
امید رکھتے ہیں۔

اس پر کچھ اور سوچیں اور دیکھیں، غریب جنتا کی
دکھ بھری کہانی نے ان کو اپنی طرف کھینچا لیکن جب
تک سب باتوں کی پوری طرح وہ جانچ نہ کرلیں اور انکو
یہ پورا یقین نہ ہوجائے کہ جن شکایتوں کو وہ دور کرنا
چاہتے ہیں وہ سچی ہیں وہ کچھ کرنا چاہتے تھے یہاں تک
کہ وہ بہت زور دینے پر بھی کانگریس میں ایک ایسے
کمزور ریزولیوشن پر بولنے کیلئے راضی نہ ہوئے، جس
میں گورنمنٹ پر صرف اتنا ہی زور دیا گیا تھا، کہ وہ
شکایتوں کی جانچ کرائے ساتھ ہی موقع پاتے ہی۔ انہوں
نے جاننے کیلئے جانچ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو
پورا کیا، مظفر پور پہونچکر انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ
وہ جو کرنا چاہتے تھے اسکی اطلاع انہوں نے مخالفوں کو
دی اور ان کی مدد بھی انہوں نے مانگی۔ دو مخالف تھے
ایک نیل والے جن کی زیادتیوں کے متعلق وہ جانچ

کرنے آئے تھے، اور دوسرے سرکاری ملازمین جو ان شکایتوں سے رعایا کا بچاؤ نہیں کرسکتے تھے، اور جن کے خلاف یہ شکایت کی کہ وہ نیل والوں کی طرفداری کرتے ہیں اور غریبوں کو ستانے میں مدد دیتے ہیں، ان دونوں مخالفوں کے نمائندوں سے انہوں نے ملاقات کی، نیل والوں کی انجمن کے صدر اور ترہٹ ڈویژن کے کمشنر سے بھی سب باتیں کیں اور ان کو اپنا مقصد بتایا۔ اور اس کی تکمیل کیلئے ان سے مدد مانگی، مدد نہ ملنے اور ان کے منع کرنے پر بھی اپنا مقصد انہوں نے نہ چھوڑا اور اپنے کام میں لگے رہے۔ چمپارن کی غریبی کا حال وہ سن چکے تھے لیکن وہاں پہونچنے کے پہلے ہی مظفر پور میں انہوں نے گاوؤں کی بری حالت کا نمونہ دیکھ لیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک ان گانوؤں کی حالت نہ سدھریگی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

موتی ہاری پہونچکر انہوں نے اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ کمشنر سے بات چیت کے بعد ہی شاید ان کو سندیسہ مل گیا تھا کہ گورنمنٹ ان کو چمپارن میں جانچ

نہ کرنے دیگی اس لئے وہ جلد سے جلد وہاں پہونچنا چاہتے
تھے اور گورنمنٹ کی کار روائی سے پہلے جہاں تک جو
کچھہ ہوسکتا تھا اسے دیکھہ لینا چاہتے تھے۔ ستیہ گرہ کا کام
تو لکھنؤ میں شروع ہوا، جو مظفر پور اور موتی ہاری
میں جاری رہا لیکن دیکھنے کا کام مظفر پور ہی سے
شروع ہوگیا۔ اور موتی ہاری پہونچکر تو اور گہرائی میں
جانے کا ارادہ پیدا ہوگیا۔ صرف ارادہ ہی نہیں ہوا
بلکہ اس ارادے کے مطابق کام بھی شروع ہوگیا،
شروع ہی میں گورنمنٹ کی طرف سے رکاوٹ
بھی پڑی۔ دفعہ ١٤٤ کی نوٹس کے نہ ماننے کا فیصلہ
بھی اسی تیزی کیساتھہ کیا گیا۔ جس تیزی کیساتھہ اور سب
کام کئے جارہے تھے۔ مقدمہ چلنے پر اپنا بچاؤ نہ کر
کے ان سبھی باتوں کا اقبال کرلیا جن کو انہوں نے کیا
تھا، اس لئے جو بھی سزا ہو اسے مستقل مزاجی سے
برداشت کرنے کا ارادہ بھی مجسٹریٹ پر ظاہر کر دیا۔
یہ ایک نئی چیز تھی اس وقت جو بیان انہوں نے دیا تھا
اس میں ایک طرح سے ان کے اس بیان کی گونج تھی جو

انہوں نے سنہ ۱۹۲۲ میں اپنے اوپر بغاوت کا مقدمہ چلنے پر احمدآباد سشن جج کے سامنے دیا تھا وہ بیان یہاں نیچے لکھا جاتا ہے محنت اور پوری توجہ کا نمونہ ہم لوگوں کیلئے تو تھا ہی لیکن وہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا. سادگی اور ضبط بھی ہمارے لئے نئی باتیں تھیں. مگر ان کی زندگی کا تو وہ بھی پہلے ہی سے جز بنے ہوئے تھے. جو روز بروز اور بھی ویسے ہی بڑھتے گئے جیسے جیسے کام کا میدان بڑھتا گیا.

«احمدآباد کا بیان*»

میری پبلک زندگی کا آغاز سنہ ۱۸۹۳ میں جنوبی افریقہ کے سخت حالات میں ہوا کیونکہ اس ملک کے برٹش حاکموں کے ساتھ میرا ابتدائی میل جول اچھا نہ رہا. مجھے معلوم ہوا کہ ایک انسان اور پھر ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میرا وہاں کوئی مرتبہ ہی نہیں ہے. میں نے یہ بھی پتہ لگا لیا کہ بحیثیت انسان وہاں میرا کوئی مرتبہ

* یہ مقدمہ احمدآباد کے دورہ' جج کے اجلاس پر سنہ ۱۹۲۲ میں ۱۸ مارچ سے شروع ہوا.

اس وجہ سے نہیں ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری؛ میں یہ سمجھا تھا کہ ہندوستانی کے ساتھ برا برتاؤ کئے جانے کا گناہ ایک اچھی خاصی منظم حکومت میں یونہی آ کر گھس گیا ہے۔ میں نے خود بھی سرکار کے ساتھ دل سے تعاون کیا، جب کبھی میں نے سرکار میں کوئی قصور پایا تو میں نے اس کی خوب تحقیقات کی؛ میں نے اس کی تباہی کی خواہش کبھی نہیں کی۔

جب سنہ ۱۹۸۰ میں بوئروں کے چیلنج نے سارے برطانوی سامراجیوں کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا تھا، تب میں نے اس موقع پر اپنی خدمات پیش کی تھیں، یعنی زخمیوں کے لئے ایک خدمتی جماعت بنائی، اور «لیڈی اسمتھ» کی حفاظت کے لئے جو لڑائی لڑی گئی اس میں میں نے کام کیا، اسی طرح جب سنہ ۱۹۰۶ میں «زولو*» قوم نے بغاوت کی تو میں نے اسٹریچر (زخمیوں کا پلنگ) پر زخمیوں کو لیجانیوالا گروہ بنایا اور جب

---

* افریقہ کے جنگلی باشندے [م]

تک بغاوت دب نہ گئی برابر کام کرتا رہا۔ ان دونوں موقعوں پر مجھے تمغے ملے اور خریطوں تک میں میرا ذکر کیا گیا۔ جنوبی افریقہ میں میں نے جو کام کیا اس کے لئے لارڈ ہارڈنگ نے مجھے قیصر ہند تمغہ دیا۔ جب سنہ ۱۹۱۴ء میں انگلستان اور جرمنی میں لڑائی چھڑی تو میں نے "لندن" میں ہندوستانیوں کی ایک والنٹیر کور (رضاکار جماعت) بنائی۔ اس میں بیشتر طلباء تھے۔ حکام نے اس جماعت کے کاموں کو سراہا۔ جب سنہ ۱۹۱۷ میں "لارڈ چمسفورڈ" نے دلی کی جنگی کونسل میں خاص طور سے اپیل کی تو میں نے "کھیڑا" میں رنگروٹ بھرتی کرتے ہوئے اپنی تندرستی تک جوکھوں میں ڈال دیا تھا مجھے اس میں کامیابی ہو رہی تھی کہ لڑائی بند ہوگئی۔ اور حکم دیا گیا کہ اب مزید رنگروٹ نہیں چاہئیں۔ ان ساری خدمتوں میں میرا صرف ایک ہی یقین رہا کہ اس طرح سے میں سامراج میں اپنے ہم ملکوں کے لئے برابری کا درجہ حاصل کرسکوں گا۔ ان خیالات کے سلسلہ کا پہلا دھکا مجھے رولٹ ایکٹ (کالا قانون) نے دیا۔

یہ قانون جنتا کی اصلی آزادی کو تہس نہس کرنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس قانون کے خلاف مجھے ایک زبردست تحریک اٹھانی چاہئے۔ اس کے بعد پنجاب کے خوفناک باب کا نمبر آیا جو "جلیانوالہ باغ" کے قتل عام سے شروع ہوا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ نہ صرف وہاں کے لوگ پیٹ کے بل رینگائے گئے اور کھلے بندوں ان کے بید لگائے گئے۔ بلکہ اس کے علاوہ بیان سے باہر بے عزتی کی گئی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وزیر اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو امید دلائی تھی۔ کہ ترکوں اور اسلام کے مقدس مقاموں کی حرمت اور بزرگی کا خیال رکھا جائیگا۔ وہ محض وعدہ ہی رہے گا۔

سنہ ۱۹۱۹ کی امرتسر کانگرس میں کئی دوستوں نے مجھے متنبہ اور آگاہ کیا اور میری معقول پالیسی میں رخنہ ڈالا لیکن پھر بھی میں اس یقین پر جما رہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ وزیراعظم نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کیا جائیگا۔ پنجاب کے زخم بھرے جائیں گے اور

نئی اصلاحات نا کافی اور غیر اطمینان بخش ہونے پر بھی ہندوستان کی زندگی مین ایک نئی امید پیدا کرینگے اسی لئے میں تعاون اور « مانٹیگو چمسفورڈ سکیم » کو مفید بنانے کی بات پر جما رہا.

لیکن میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں. خلافت کے متعلق وعدہ پورا کیا جانے والا نہیں تھا. پنجاب کے متعلق زیادتیوں پر لیپا پوتی کر دی گئی. ادھر آدھے پیٹ بھوکے رہنے والے ہندوستانی آہستہ آہستہ فنا ہو رہے ہیں جو یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں جو تھوڑا بہت آرام مل جاتا ہے. وہ بدیشی لٹیروں کی دلالی کرنے کی وجہ سے ہے. اور سارا نفع اور دلالی جنتا کے خون سے نکالی جاتی ہے. وہ یہ نہیں جانتے کہ برطانوی ہند میں جو حکومت قانوناً قائم ہے وہ جنتا کا مال لوٹنے کیلئے چلائی جاتی ہے، چاہے جتنے جھوٹے سچے طریقوں سے کام لیا جائے، ہندوستان کے ساتھ چاہے جیسی چالاکی کی جائے لیکن بے شمار گانوؤں مین، جو قحط زدہ دکھائی دے رہے ہیں. ان کی کھلی ہوئی گواہی کسی طرح جھٹلائی

نہیں جاسکتی۔ اگر ہمارا کوئی خدا ہے تو مجھے اس کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ تاریخ میں اپنے ڈھنگ کا نرالا کہلانے کے قابل جو یہ گناہ کیا جارہا ہے اس کی جواب دہی انگلستان کی پبلک اور ہندوستان کے شہریوں پر ہوگی۔ اس ملک میں قانون کا استعمال بدیشی لٹیروں کے فائدے کیلئے کیا گیا ہے۔ پنجاب کے فوجی قانون کے متعلق میں نے جو غیر جانبدارانہ جانچ کی ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ نوے (۹۰) فی صد معاملوں میں سزا کے فیصلے بالکل غلط رہے۔ ہندوستان کے سیاسی مقدموں کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ نوے (۹۰) فی صد سزا یافتہ آدمی بالکل بے قصور تھے۔ ان آدمیوں کا صرف اتنا ہی جرم تھا کہ وہ اپنے ملک سے محبت کرتے تھے۔ ۹۹ فی صد معاملات میں دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان کی عدالتوں میں ہندوستانی کے ساتھ یوروپین کے مقابلہ میں انصاف نہیں کیا جاتا۔ میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں جتنے ہندوستانیوں کو اس قسم کے معاملات میں کام پڑا ہے، ان کا تجربہ یہی ہے

میری رائے میں قانون کا غلط استعمال جان بوجھ کر سہی یا بغیر جانے بوجھے. مال لوٹنے کیلئے کیا جاتا ھے.

سب سے بڑی بد نصیبی کی بات یہ ھے کہ جن انگریزوں اور انکے ھندوستانی مددگاروں کے ذمہ اس ملک کی حکومت کا بوجھ ھے، وہ خود یہ نہیں جانتے کہ یہاں بیان کئے ہوئے جرموں میں ان کا بھی ھاتھ ھے، میں اچھی طرح سے واقف ہوں کہ بہت سے انگریز اور ھندوستانی حاکم اس پر دل سے یقین رکھتے ھیں کہ ملک کا جو انتظام وہ کر رھے ھیں وہ دنیا بھر کے ملکی انتظاموں میں سے ایک ھے اور ھندوستان اگرچہ آھستہ آھستہ لیکن یقینی طور سے ترقی کر رھا ھے. وہ یہ نہیں جانتے کہ کسقدر خوبصورتی کیساتھ مگر خاص ڈھنگ سے خوف کا سکہ بٹھایا گیا ھے اور کس طرح ایک اور طاقت کا اجتماعی مظاھرہ کر کے دوسری طرف حفاظت خود اختیاری کی یا جواب میں وار کرنے کی تمام طاقتیں چھین کر لوگ بے جان اور ذلیل کر دئے گئے ھیں، اس سے لوگوں کو اب اسی طرح رھنے کی عادت پڑ گئی ھے کہ جس سے حکومتی طبقہ

کی جہالت اور خود فریبی اور بھی بڑھ گئی ھے جس دفعہ
۱۲٤ (الف) کے تحت مجھ پر مقدمہ چلایا گیا وہ شہریوں
کی آزادی کو تہس نہس کرنے میں تعزیرات ہند کی دفعات
مین سرتاج ھے، محبت نہ تو پیدا کی جاسکتی ھے اور نہ
قاعدہ قانون کے ماتحت رہ سکتی ھے۔ اگر کسی
آدمی کے دل میں کسی دوسرے آدمی کی محبت کا
جذبہ نہ ھو تو جب تک وہ اپنے خیال یا عمل
سے کوئی تشدد ظاھر نہ کرے اس وقت تک اسے
اپنے جذبۂ نفرت کے ظاھر کرنے کا پورا پورا اختیار
ہونا چاھئے، لیکن « شری یت بیکر » اور مجھ پر جس
دفعہ کو لگایا گیا ھے اس کے مطابق نفرت پھیلانا جرم
ھے، اس دفعہ کے مطابق چلائے ھوئے چند مقدموں
کا میں نے مطالعہ کیا ھے اور جانتا ھوں کہ اس دفعہ
کے مطابق ملک کے کئی محبوب لیڈروں کو سزا دی
گئی ھے اس لئے اس دفعہ کے مطابق مجھ پر جو مقدمہ
چلایا گیا ھے اس میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ھوں۔
میں نے مختصراً اپنی نفرت کے اسباب کو ظاھر کر دیا

ہے، کسی حاکم کے بارہ میں میرے دل میں کسی قسم کا برا خیال نہیں ہے۔ خود بادشاہ کی شخصیت کے بارے میں تو مجھ میں نفرت کا جذبہ بالکل نہیں ہے۔ لیکن جس مہذب حکومت نے اس ملک کو دوسری ساری منظم حکومتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ اس کے بارے میں میں نفرت کا جذبہ رکھنا عمل صالح سمجھتا ہوں۔ انگریزوں کی عملداری میں ہندوستان میں بمقابلہ دوسری عملداریوں کے انسانیت کا مرتبہ بہت گر گیا ہے۔ اس عقیدے کے ہوتے ہوئے اس مہذب حکومت کے بارے میں محبت کا جذبہ رکھنا میں گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں نے اپنی ان تحریروں میں جو میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کی گئیں ہیں۔ جو کچھ لکھا ہے اسے لکھنا اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔

حقیقت میں میرا یقین تو یہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان۔ جس غیر فطری شکل سے رہتے ہیں۔ اس سے عدم تعاون کے ذریعہ نجات پانے کا راستہ بتا کر میں نے دونوں ملکوں کی ایک خدمت کی ہے۔ میری رائے میں

جس طرح اچھائی سے تعاون کرنا ایک خدمت ھے اسی طرح برائی سے عدم تعاون کرنا بھی ایک خدمت ھے۔ اس سے پہلے برائی کرنے والے کو نقصان پہنچانے کے لئے مضرت رساں ڈھنگ سے عدم تعاون ظاھر کیا جاتا رھا ھے، لیکن میں اپنے ملک والوں کو یہ بتانے کی خواھش کر رھا ھوں کہ ھنسا (تشدد) برائی کو قائم رکھتا ھے، اس لئے برائی کی جڑ کاٹنے کیلئے یہ ضروری ھے کہ تشدد سے وہ بالکل الگ رھیں، اھنسا کا مطلب یہ ھے کہ برائی سے عدم تعاون کرنے کیلئے جو کچھ بھی سزا ملے اسے منظور کرلیں. اس لئے میں یہاں اس کام کی پاداش میں جو قانون کی نگاہ مین جان بوجھ کر کیا ھوا جرم ھے، اور جو میری نگاہ میں کسی شہری کا سب سے بڑا فریضہ ھے. سب سے بڑی سزا چاھتا ھوں اور خوشی سے اسے بھگتنے کیلئے تیار ھوں آپ کے جج اور اسیروں کے سامنے صرف دو ھی راستے ھیں. اگر آپ لوگ دل سے سمجھتے ھیں کہ جس قانون پر عمل کرنے کے لئے آپ سے کہا گیا ھے وہ برا ھے

اور میں بے قصور ہوں تو آپ لوگ اپنی خدمتوں سے استعفاء دے دیں اور برائی سے اپنا تعلق توڑ دیں یا اگر آپ کا یہ یقین ہے کہ جس قانون پر عمل کر کے آپ مدد کر رہے ہیں وہ ملک حقیقت میں اس ملک کی جنتا کی بہتری اور بہبودی کے لئے ہے اور میرا یہ طریقہ لوگوں کو نقصان پہونچانے والا ہے تو مجھے زیادہ سے زیادہ سزا دیں ۔"

چمپارن میں پہونچتے ہی ان کو بآسانی کچھ کام کرنے والے بھی مل گئے ۔ جنہوں نے ممکن ہے کہ بغیر جانے بوجھے اور سوچے سمجھے ان کی پیروی اور نقل کی ہو ۔ چمپارن کا میدان بھی چھوٹا تھا ۔ اس لئے تھوڑے لوگوں کی تھوڑے ہی دنوں تک کام کرنے کی ضرورت تھی ، لیکن جب پورے ملک نے بدیشی راج سے نجات پانے اور سوراج قائم کرنے کا سب سے بڑا کام اپنے هاتھ مین لے لیا تو کیا ملک کے کروڑوں عورتوں اور مردوں نے ٹھیک اسی طرح ان کی پیروی نہیں کی جس طرح چمپارن میں چند لوگوں نے کی تھی ، کیا ملک

نے وہ سب کچھ ترک کر کے نہیں دکھلا دیا جسکی صرف تیاری ہی چمپارن کے کام کیلئے کافی ثابت ہوگئی، آخر میں چمپارن میں پوری کامیابی ہوئی کیونکہ نیل والوں کے جس ظلم کو وہ دور کرنے گئے تھے وہ ختم ہوگیا۔ ساتھ ہی گورنمنٹ اور نیل والوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی اچھے رہے۔ بہت سے تجربے مفید ثابت ہوئے۔ اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کی کارروائیوں سے ان دونوں کا بہت بڑا نقصان ہوگا اور اس وقت شاید کچھ ہوا بھی، لیکن آخر میں وہ نیل والے اپنی کوٹھیوں زمینوں اور دوسرے قسم کے مال مویشیوں کو اچھی قیمتوں پر فروخت کر کے اور دام لیکر خوشی خوشی اپنے وطن کو چلے گئے۔ ہندوستان کے حصول سوراج کا بھی ٹھیک ایسا ہی نتیجہ اب تک نکلا ہے۔ اور جو باقی ہے وہ آگے چل کر ویسا ہی شیریں ہوگا۔ انگریزی سامراج ظاہر میں تو ختم ہوگیا لیکن اس کے ختم ہونے کے باوجود انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان اچھے تعلقات بڑھ گئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ حصول سوراج کے بعد

آخر میں انگریزوں کو نقصان نہیں ہوگا بلکہ فائدہ ھی میں رھیں گے. چمپارن مین بھی ایک زبردست نیل والا تھا جو سب کچھ ھوجانے کے بعد بھی آخر تک مخالف بنا رہا لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہ تو چمپارن کے لوگوں پر پڑا اور نہ دوسرے لوگوں پر. کیا مسٹر «چرچل» کی وھی حالت نہیں ھوئی؟ جو چمپارن میں مسٹر «اروِن» کی تھی، اس لئے اس وقت بھی میں نے سوچا تھا. اور آج بھی لکھ رھا ھوں کہ گاندھی جی کی سوراج تحریک کا بیج چمپارن میں ھی بویا گیا اور اسی طرح یہ پھولا اور پھلا جس طرح چمپارن میں ھم نے اس کو چھوٹے پیمانے پر پھولتے پھلتے دیکھا تھا، مین نے چمپارن میں مہاتما گاندھی نام کی ایک کتاب سنۂ ۱۹۱۹ میں لکھی تھی. اس کا دیباچہ میں نے حسب ذیل طریقہ پر لکھا تھا. اس وقت ترک موالات تحریک شروع ھی ھوئی تھی. ھم اس وقت نہ تو یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ اس میں کتنی سخت رکاوٹیں پڑیں گی؟ کتنی مشکلوں کو ھمیں حل کرنا ھوگا؟ اور اس کا کیا نتیجہ ھوگا؟ اور نہ اس کا اندازہ تھا

کہ اسمیں کتنا وقت لگیگا؟ لیکن جیسا کہ چمپارن کے تجربے نے مجھسے بتایا تھا. مجھسے امید تھی کہ بڑا کام بھی اسی طور پر پورا ہوگا.

چمپارن میں مہاتما گاندھی کی تمہید

یہ کتاب سنہ ۱۹۱۸ اور ۱۹۱۹ کی درگاہ پوجا کی چھٹیوں میں لکھی گئی تھی لیکن آج تک ناظرین کی خدمت میں کئی وجوہ سے پیش نہ کی جاسکی اس کتاب کے پڑھنے سے پڑھنے والونکو معلوم ہوجائیگا کہ ستیا گرہ اور نان کوا پریشن کے متعلق مہاتما جی نے سنہ ۱۹۲۰ سے لیکر سنہ ۱۹۲۲ تک جو کچھ کیا اس کا اشارہ چمپارن کے جھگڑے ھی میں ہوچکا تھا. مہاتما گاندھی نے دکھنی افریقہ سے لوٹ کر سب سے بڑا جو کام کیا تھا وہ چمپارن ھی کا کام تھا، اس وقت ہندوستان میں « ہوم رول » کا بڑا شور تھا. جب ہم مہاتما جی سے کہتے کہ وہ اس تحریک میں چمپارن کو بھی شامل کردیں تو وہ اسکے جواب میں کہا کرتے تھے کہ جو کام

چمپارن میں ہورہا ہے ؤہی « ہوم رول » قائم کرسکیگا . اس وقت ملک شاید ہی اس پروگرام کی اہمیت کو سمجھتا ہو ، ہم خود ہی ایسا نہیں سمجھتے تھے لیکن آج جب ہم اس وقت کے طریق کار پر غور کرتے ہیں اور پچھلی تین چار سال کی قومی تاریخ پر دھیان دیتے ہیں اسوقت ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بڑی تحریک جو آج جاری ہے وہ چمپارن ہی کے واقعہ کی ایک بہت زیادہ پھیلی ہوئی شکل ہے . اگر چمپارن اور کھیڑا کی تاریخیں اکٹھا کرلی جائیں تو جو کچھ « نان کواپریشن » اور ستیہ گرہ کی تحریک نے کیا ہے یا باوجود خواہش کے ابھی تک نہیں ہوسکا ہے وہ سب باتیں ان میں اعلانیہ پائی جائیںگی ، جسطرح ہندوستانیوں کو ظلم و زیادتیوں میں دبا ہوا دیکھکر مہاتما جی نے « نان کواپریشن » تحریک کو شروع کیا اسی طرح چمپارن کی رعایا کو بھی ظلم و زیادتیوں کے بوجھ میں دبتا ہوا دیکھکر اور اسکی مدد کرنی اپنا فریضہ سمجھکر انہوں نے وہاں کا سفر کیا تھا جسطرح ہندوستانیوں نے جلسوں ، اخباروں اور کونسلوں کے « ریزولیوشنوں » اور سوالوں کے ذریعہ تحریک کر کے کچھ

فائدہ نہ حاصل کرنے پر ھی ستیہ گرہ اور ترک موالات کو شروع کیا اسی طرح چمپارن میں بھی یہ سب کچھ کرکے تھک جانے پر ھی وھاں کی رعایا مہاتما گاندھی کو دعوت دی تھی جسطرح اعلانیہ تحریک میں مہاتما جی نے سچائی اور عدم تشدد کو اپنا اصول قرار دیکر دیش کو اسے منظور کرنیکی تعلیم دی ھے اسیطرح اسوقت بھی چمپارن کے مفاس جاھل اور بھولے بھالے کسانوں کو تقریروں اور لیکچروں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اپنے کاموں کے ذریعہ تعلیم دی تھی۔

اور سب باتوں کے علاوہ جسطرح آج اپنے اوپر مصیبت اٹھا کر اور خود کو مشکلوں میں ڈالکر ملک کی مدد کرنے کا منصوبہ مہاتما جی نے دیس بھر کے لوگوں کے دلوں میں پیدا کردیا ھے، اسیطرح جیل کیلئے ھر قسم کی مصیبت بھگتنے کیلئے تیار ھوکر انھوں نے وھاں کی رعایا کو بھی وھی اصول سکھایا۔ وھاں سرکاری افسروں نے مہاتما جی کے مقصد اور رعایا کی تکلیفوں اور انکی ناانصافیوں کو، جو رعایا پر کی گئی تھیں، جانتے ھوئے بھی پہلے مہاتما جی کو روکنا چاھا تھا یہانتک کہ جیل بھیج دینے تک کا انتظام کرلیا تھا۔

وھی اس بڑی تحریک کیلئے بھی انہوں نے کیا. مہاتما جی کے چمپارن جانے سے پہلے بھی وہاں کی رعایا نے وقتاً فوقتاً خوفناک اور بھیانک تحریک اٹھائی تھی اور کہیں کہیں " نان کواپریشن " کا بھی ارادہ کیا تھا. لیکن اس تحریک اور نان کواپریشن کی بنیاد عدم تشدد پر نہیں تھی. دوسری طرف نیل والے اور سرکاری افسر جن کا اعتقاد آج تک تشدد پر ھی ھے اور اسکے لئے انکے پاس سامان بھی موجود ھے انکی تشددی تحریک کو برابر دباتے اور انکو اسمیں ھراتے رھے. اس تحریک میں بھی جہاں ھم اس بنیادی اصول سے ھٹ گئے ھیں وھاں اپنی ھار کا سامان خود جمع کرتے گئے ھیں اگر ھم اس اصول اور مسلک کو سامنے رکھکر اس تحریک کو بڑھاتے جائینگے تو اسمیں شک نہیں جسطرح چمپارن میں کامیابی ھوئی تھی اور جیسا کہ پنجاب کے " اکالی " ایک نمونہ ملک کے سامنے پیش کر رھے ھین جو اپنے کاموں کا پھل بھی پاتے ھوئے دکھائی دیتے ھیں اسیطرح اس عام تحریک میں بھی کامیابی ضروری ھو، چمپارن میں جسطرح سرکار نے خود ان باتونکو منظور کرلیا جنکو وھانکی رعایا ٦٠ سال سے منوانا چاھتی تھی اسیطرح اس تحریک میں بھی جو کچھ ھندوستان چاہ رھا ھے اسکو سرکار منظور کریگی.

تیسرا باب

مقدمہ کا حکم کئی دنوں کے بعد سنایا جانے والا تھا، ں درمیان میں کسانوں میں سے جو لوگ آتے تھے ان کی نیں سن کر ہم نوٹ کرلیا کرتے لیکن مجسٹریٹ کے حکم کے طابق تحقیقات کیلئے گاؤں میں نہ ہم میں سے کوئی گیا اور ـ گاندھی جی گئے، مگر پھر بھی کافی بیان سننے میں آتے ھے اور دن بدن حالت سے بہت زیادہ واقفیت ہوتی جاتی ھی، اسی درمیان میں «پادری چارلی اینڈریوز» موتی ہاری پہنچ گئے، وہ وہاں ہندوستانیوں کے بلانے پر تھوڑے ہی دنوں میں «فی جی» (جزیرہ) جانے والے تھے، دنیا بھر میں جہاں جہاں ہندوستانی جا کر رہے تھے وہاں کی اکثر جگہوں پر ان کی حالت اچھی نہیں تھی، اس کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ وہ لوگ ان دور دراز کے ٹاپوؤں

(جزیروں) اور ملکوں میں زیادہ تر "گرمٹیا قلی*" بن کر گئے تھے اور وہاں بس گئے تھے. بہتیروں کی تو ایک دو پشتیں بھی گزر گئی تھیں. ان لوگوں نے ان ملکوں کی آبادی کیلئے بہت کام کیا تھا. یہ لکھنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے بغیر شاید یہ ملک اتنی جلد آباد بھی نہ ہوتے. بہرحال وہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے نہیں گئے تھے جو انگریز یا دوسرے یورپین لوگ وہاں اپنا کاروبار بڑھانا چاہتے تھے. ان کو اس کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی. یہی کاروباری اپنے خرچ سے ان کو لے گئے تھے اور وہ لوگ ان کی شرطوں کو مان کر وہاں گئے تھے. اسی معاہدہ یا اگریمنٹ کو وہ گرمٹ کہا کرتے تھے اور اس گرمٹ سے بندھے اور پابند لوگوں کو "گرمٹیا" ان کے بعد کہیں کہیں کچھ بیوپاری بھی ہندوستان سے چلے گئے تھے اور کچھ دوسرے لوگ بھی مگر سب کی حالت

---

* انگریزی لفظ اگریمنٹ [AGREEMINT] کا بگڑا ہوا لفظ ہے، جو عام طور پر ان مزدوروں کے لئے استعمال ہوتا تھا جن کو چند شرطوں میں جکڑ کر باہر لے جایا جاتا تھا. [مترجم]

ی تھی. ان کو کسی قسم کا اختیار تو تھا ھی نہیں. ان
شمار گنواروں میں ھوتا تھا اور ویسا ھی ان کے ساتھ
تاؤ ھوتا تھا، گاندھی جی نے اسی قسم کی بدسلوکی کے خلاف
جنوبی افریقہ میں آواز اٹھائی اور ستیہ گرہ کی تھی.

چارلی اینڈریوز کا دل بہت بڑا تھا سچے عیسائی تھے
ھندوستانیوں کیساتھ ان بدسلوکیوں سے انکو تکلیف تھی، انہوں
نے اپنے ذمہ یہ کام لے لیا تھا کہ جہاں جہاں غیر ملکوں میں
ھندوستانی جا کر بسے اور مصیبتیں اٹھا رھے ھیں وہ وھاں جاتے
اور جو کچھ ھوسکتا وہ بطور مدد کے انکے لئے کرتے. زیادتی
کرنیوالوں کو روکنے کیلئے انگلستان پہونچکر وھاں کے لوگوں کو
بیدار کرتے وغیرہ وغیرہ اس سلسلہ میں گاندھی جی سے جنوبی
افریقہ میں صرف ملاقات ھی نہیں ھوئی تھی بلکہ بہت ھی گہرے
اور قریبی تعلقات بھی ھوگئے تھے. گاندھی جی پر بھی ان کا
کافی اثر تھا اور ھندوستان میں انکی رسائی وائسرائے تک تھی.
وہ اسی قسم کے کام کیلئے فی جی جارھے تھے اور وھاں جانے
سے پہلے گاندھی جی سے صلاح و مشورہ کرنے کیلئے وہ
چمپارن آئے ایسے کام میں وہ ھمیشہ گاندھی جی سے رائے

لیکر ھی قدم اٹھایا کرتے تھے.

اینڈریوز سے ہم لوگوں کی یہ پہلی ملاقات تھی. ایسا انگریز ہم نے کبھی پہلے دیکھا ھی نہیں تھا، کپڑے اگرچہ انگریزی کاٹ کے پہنے ہوئے تھے مگر بہت ڈھیلے ڈھالے تھے. دنیا میں کئی بار چکر لگا چکے تھے پھر بھی اتنے سیدھے سادے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسطرح اپنا کام اور سفر کرسکتے ھیں، انکے آنے کی خبر شاید پہلے نہیں ملی تھی، اسلئے انکو لینے کیلئے اسٹیشن کوئی نہیں گیا، وہ ریل سے اتر کر ایکا یکہ کرایہ کر کے اسٹیشن سے چل دئے. «ایکا» ویسا تھا کہ اسکے ایک طرف پیر لٹکا کر بیٹھنا پڑتا تھا. اسطرح کے یکے کی سواری کا انکو تجربہ نہیں تھا، اسی لئے پیر لٹکا کر جو بیٹھے تو اسطرح بیٹھے کہ اسکے پہئے سے انکا ایک پیر چھو جاتا تھا اور پہیہ جب گھومتا تو اس سے انکا پیر گھستا تھا مگر انکو اسکی خبر نہ ہوئی. قیام گاہ تک پہنچتے پہنچتے. چمڑے کے جوتے کا وہ حصہ جو پہئے سے لگتا تھا، گھستے گھستے کٹ گیا، شاید پیر کی کھال تک پہیہ پہنچ چکا تھا. لیکن انکو اور دوسرے لوگونکو اسوقت معلوم ہوا جب وہ اسپر سے اترے.

گاندھی جی انکو دیکھکر خوش ھوئے اور انھوں نے اپنے ہاتھ سے لیمو کاٹ کر اسکا شربت تیار کر کے انکو دیا، یہ پہلا موقع تھا کہ ھم نے گاندھی جی کو ایک پرانے دوست کی خاطر داری کرتے دیکھا. چند دنوں بعد ھی اسطرح کی محبت کا مشاھدہ ھی نہیں بلکہ اسکا تجــربہ بھی ھم لوگوں کو ھونے لگا، جبکہ وہ اپنے ھاتھوں سے ھملوگوں کو کھلانے لگے. اینڈریوز وھاں دو تین روز تک ٹھہرے، جب انکے جانیکا ذکر ھونے لگا تو ھم لوگوں نے سوچا کہ وہ کچھ دنوں تک اگر رہ جاتے تو اچھا ھوتا ان سے ھملوگوں نے پہلے سے الگ باتیں کیں اور انکے ٹھہرنے پر زور دیا، انھوں نے جواب دیا کہ انھیں « فیجی » جانا ھے جس کیلئے جہاز پر جگہ وغیرہ کا انتظام ھوچکا ھے اور وھاں کام بھی ھے. اس پر بھی ھملوگوں کے اصرار پر وہ ٹھہر سکتے ھیں اگر گاندھی جی کی اجازت ھوجائے، چنانچہ انھوں نے ھملوگوں کیطرف سے یہ بات گاندھی جی کیسامنے پیش بھی کی، ھملوگوں نے بھی اسپر زور دیا، لیکن گاندھی جی راضی نہ ھوئے، جب ان سے بہت اصرار کیا گیا تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ آپلوگ جتنا زیادہ زور دے رھے ھیں اتنا ھی ھمارا خیال مضبوط ھوتا

جارہا ہے کہ «اینڈریوز» کو «چمپارن» میں نہ رہکر «فیجی» جانا ہی چاہئے. صاف صاف انہوں نے کہا :—

«میں سمجھ گیا ہونکہ کیوں آپلوگ اتنی ضد کررہے ہیں. آپ لوگوں کے دلمیں جو بات ہے وہ بھی میں نے جان لی ہے اور جس سبب سے آپ انکو روکنا چاہتے ہیں اسی سبب سے میں ان کو جلد سے جلد روانہ کردینا چاہتا ہوں آپ سمجھتے ہین یہاں ہمارا جھگڑا انگریز نیل والوں سے ہے. یہاں کے ضلع مجسٹریٹ و نیز دوسرے بڑے افسر بھی انگریز ہیں. صوبہ کے گورنر اور دوسرے اونچے حاکم تو انگریز ہوتے ہی ہیں. اینڈریوز بھی انگریز ہیں، گورنمنٹ اور انگریزوں پر انکا اثر بھی کافی ہے. گورنمنٹ نے اگر سختی کرنی چاہی تو «اینڈریوز» جیسے انگریز کا ہملوگوں میں موجود ہونا اچھا ہوگا اور اس سے ہمکو مدد ملیگی، آپ کے دلمیں ڈر ہے اور اینڈریوز کا آپ سہارا چاہتے ہیں. میں اس ڈر کو آپ کے دل سے نکالنا چاہتا ہوں. نیل والوں سے اگر جھگڑا ہوگیا تو اسمیں کسی انگریز کی مدد سے خواہ وہ اینڈریوز ہی کیوں نہ ہوں. کہانتک ہم کامیابی حاصل کرسکیں گے؟ ہمکو تو نڈر ہوکر اور اپنی طاقت پر بھروسہ کر

کے کام کرنا ہوگا، اسیوقت کامیاب بھی ہوسکین گے، اسلئے ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ اینڈریوز کو یہاں سے جانا ہی چاہئے، کل ہی سویرے کی گاڑی سے وہ روانہ ہوجائینگے۔ «فیجی» کا کام بھی تو ضروری ہے، وہ بھی چھوڑا نہیں جا سکتا »

ہم لوگوں سے یہ سب کچھ کہکر انہوں نے اینڈریوز سے کہا کہ کل سویرے چلے جانے کیلئے تیار ہوجاؤ۔ ان کو تیار ہونا ہی کیا تھا، وہ تو تیار تھے ہی اس لئے ہملوگوں کو کچھ تھوڑی نا امیدی سی ہوئی، لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ ہمارے دل کی بات کو انہوں نے ٹھیک سمجھ لیا ہے اسکا اثر ہم پر بہت ہوا بے خوفی کا یہ سچا سبق ہمکو اپنے کام کے آغاز ہی میں مل گیا، ہم نے دیکھا کہ ہم کو اس سے فائدہ ہوا ہے۔ اس طرح روز بروز بے خوفی اور خود اعتمادی کا سبق ہم کو ملنے لگا۔ دوسرے دن روانہ ہونے سے پہلے اینڈریوز جو اتنے دنوں میں ضلع مجسٹریٹ اور دوسرے حاکموں اور کچھ نیل والوں سے بھی مل چکے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ سے رخصت ہونے گئے۔ مقدمہ کے فیصلے کی تاریخ کے ابھی ایک، دو دن باقی تھے۔ لیکن

مجسٹریٹ کے پاس گورنمنٹ کا حکم اسوقت آچکا تھا کہ مقدمہ اٹھا لیا جائے اور گاندھی جی کو جانچ کرنے دیا جائے اسلئے اینڈریوز کو یہ بتادیا اور کہدیا کہ باضابطہ حکم کچھ دیر میں پہنچیگا. اینڈریوز آئے اور روانہ ہونے سے پہلے یہ خوش خبری هملوگوں کو سنا گئے. یہ خبر مل جانے کے بعد ہم لوگوں کو ان کا جانا کچھ برا نہیں معلوم ہوا. گاندھی جی نے بھی کہا " کہ مجھسے بھی کچھ اندازہ ہوگیا تھا. کہ طوفان اوپر ھی اوپر چلا جائیگا. کچھ دیر کے بعد باضابطہ حکم بھی آ گیا. مقدمہ اٹھا لیا گیا. مہاتماجی ضلع مجسٹریٹ سے ملے. اس نے کہدیا کہ آپ جانچ جاری رکھ سکتے ھیں لیکن اسکا خیال رکھئے کہ بدامنی اور هلچل نہ ہونے پائے.

اب ہم لوگ کسانوں کے بیان باضابطہ لکھنے لگے. گاندھی جی نے بہت تاکید کر کے هملوگوں سے کہا کہ ممکن ھے کہ جو بیان آپ لوگوں کو دئے جائیں ان میں کچھ غلط بھی ہوں یا کچھ مبالغہ سے بھرے ھوں، آپ لوگ تو سب وکیل ھیں خوب جرح کر کے جہانتک آپ کو سچ معلوم ہو وھی لکھئیگا. اسی طریقہ سے ہم بیان لکھنے لگے. یہ خبر فوراً ضلع

میں پھیل گئی. کہ گاندھی جی پر سے مقدمہ اٹھا لیا گیا. اور وہ رعایا کا بیان سن رہے ھیں بہترے کسان آنیلگے سویرے سے شام تك هم لکھتے رہے تو بھی سب کا بیان هم نہیں لکھ پاتے تھے ابھی یہ کام شروع هی ہوا تھا کہ همکو دوسرا سبق ملا. هم لوگوں کو جانچ کی اجازت تو مل گئی. لیکن ساتھ هی پولیس کے افسروں کو بھی حکم تھا. کہ سب باتیں دیکھتے سنتے رھیں اور اسکی اطلاع بڑے حاکموں کو دیتے رھیں. اسلئے "سب انسپکٹر" اکثر سارا دن هملوگوں کے هی آس پاس رها کرتا تھا ایك روز بابو دھرنی دھر ایك کمرے میں ایك چوکی پر بیٹھے تھے. انکے چاروں طرف آٹھ دس کسان انکو گھیرے ہوئے کھڑے بیٹھے تھے. یہ انہیں کا بیان لکھ رہے تھے سب انسپکٹر بھی آکر پاس هی بیٹھ گئے. یہ ان کو اچھا نہ لگا. لیکن کچھ بولے نہیں اور وهاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جابیٹھے اور بیان لکھنے لگے. سب انسپکٹر وهاں بھی جا کر بیٹھ گیا وهاں سے اٹھکر وہ تیسری جگہ جابیٹھے. سب انسپکٹر وهاں بھی جاپہنچا. تب ان سے برداشت نہ هوسکا. انہوں نے اسے جھڑك کر کہا "کہ آپ کیوں اس طرح همارے سر پر سوار

رہتے ہیں. آپ کو جو کچھ دیکھنا اور سننا ہو تو کچھ دور سے دیکھئے اور سنئے » اسپر اس نے وہاں تو صرف یہی کہا « کہ اسکو تو ایسا ہی حکم ہے. اسکے بعد اس نے گاندھی جی سے شکایت کی گاندھی جی نے بابو دھرنی دھر اور ہم سب کو بلایا. اور ہم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے. بابو دھرنی دھر نے سب باتیں کہدیں گاندھی جی نے پوچھا کہ « آپ اکیلے تھے یا آپکے پاس کوئی اور بھی تھا » انہوں نے جواب دیا کہ « ہم کو بہت سے کسان گھیرے ہوئے تھے. « اسپر گاندھی جی نے پوچھا » کہ ان کا وہاں جانا آپ کو کیوں ناپسند ہوا » انہوں نے جواب دیا کہ « انکی وجہ سے ہمارے کام میں رکاوٹ پڑتی تھی » گاندھی جی نے پھر پوچھا » کہ کسانوں کے رہنے سے آپ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی. لیکن ان کے وہاں ہونے سے رکاوٹ پڑی اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہ چونکہ پولیس کے آدمی ہیں اس لئے رکاوٹ پڑی. ان میں اور دوسرں میں کیوں فرق کیا؟ ان کو بھی کسانوں جیسا کیوں نہ سمجھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کا ڈر ابھی دل میں ہے. اس کو نکالنا چاہئے. ہم کچھ چھپکر تو کوئی برا کام نہیں کررہے ہیں. پھرچاہے پولیس یا

کوئی بھی وہاں کیوں نہ رہے ڈرنے کی کون سی بات ہے. کسانوں کے دل سے بھی یہ نکال دینا چاہئے. ان کو جو کچھ کہنا ہے پولیس مجسٹریٹ اور نیل والوں کے سامنے بھی نڈر ہوکر ان کو کہنا چاہئے»

بات ان کی ٹھیک تھی. اسوقت پولیس کا ڈر سب کے دلوں میں کچھ نہ کچھ تو رہتا ہی تھا. اور یہ بھی ہمیشہ دماغ میں رہتا تھا. کہ ہماری باتیں اگر پولیس کو معلوم ہوجائینگی. تو نہ معلوم اسکا کیا نتیجہ نکلے گا. اس لئے صرف انقلابی لوگ ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی پولیس سے بچے ہی رہنا چاہتے تھے. ادھر تو ہم لوگوں کے دل سے پولیس کا ڈر نکالنا اور ادھر پولیس کا انسپکٹر ایسی باتیں سنکر شرمندہ ہوگیا. اس نے سوچا تھا کہ گاندھی جی سے نالش کرکے ان کو ڈانٹ کھلوائیگا جس سے اپنا رعب اور بھی بڑھ جائیگا. گاندھی جی نے ایک طرح ڈانٹا ضرور لیکن اس ڈانٹ نے پولیس انسپکٹر کو یہ بتلا دیا کہ ہم لوگوں کی نظر میں پولیس افسر اور کسان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور ہمارا برتاؤ پولیس کے ساتھ ویسا ہی ہونا چاہئے. جیسا کہ معمولی رعایا کے ساتھ ہم کرتے ہیں.

یہاں تو رعب بڑھنے کی بجائے ایک طرح سے بالکل غائب ہوگیا. لیکن وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد کسان کے جمگھٹ میں اس نے پھر بیٹھنا پسند نہیں کیا اور پھر وہاں جا کر نہ بیٹھا. کسانونکی بھیڑ بھی روز بروز بڑھنے لگی، اب ہملوگ کہیں ایک چٹائی پر بیٹھ جاتے اور کسان ہمیں چارونطرف سے گھیر کر بیان لکھانے کیلئے زمین پر بیٹھ جاتے.

گاندھی جی نے ہملوگوں سے کہا کہ «جو رنگ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں کچھ وقت لگیگا، اسلئے اتنا بوجھ گورکھ بابو پر ڈالنا ٹھیک نہیں ہے اسکے علاوہ انکے مکان میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے. ایک دوسرا مکان تلاش کر کے ہملوگ اپنا ڈیرہ اسمیں جمائیں. شہر میں لوگوں نے ایک مکان تھوڑی ہی دور پر ڈھونڈھ لیا جس میں ایک چھوٹا سا احاطہ بھی تھا گاندھی جی نے خیال کیا کہ مکان کی صفائی وغیرہ ہو جائے. اور ہم لوگ آج ہی وہاں چلے چلیں. مکان کی صفائی وغیرہ ہوتے ہوتے شام ہوگئی. ہملوگوں نے سوچا کہ آج رات کو نئی جگہ میں نہ جائیں، کل سویرے چلے جائینگے. یہ سوچکر ہم نے اپنے دل ہی دل میں اس رات کو مقام

بدلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا. گاندھی جی سے یہ بات نہیں کہی گئی، کیونکہ ہم سب سوچتے تھے کہ یہ چھوٹی سی بات ہے اس کے متعلق کیا پوچھا جائے. رات کے تقریباً آٹھ نو بجے گئے. اس وقت گاندھی جی نے یہ پوچھا « نئی جگہ مین جانیکی بابت کیا ہوا. اسمیں کب چلنا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ صفائی وغیرہ میں دیر ہوجانے کیوجہ سے ہملوگوں نے سوچ لیا ہے کہ کل سویرے لے جائینگے. اس پر انہوں نے کہا « ایسا نہیں ہونا چاہئے جب ایک بار ارادہ کر لیا گیا کہ اس کام کو کرنا ہے تو اس کو کر ہی ڈالنا چاہئے. اس طرح ارادہ بدلنا اچھا نہیں ہے، اور صفائی کی کیا ایسی بات ہے؟ کیا ہم لوگ اپنے رہنے کی جگہ کو بھی خود صاف نہیں کرسکتے. اگر صفائی نہیں بھی ہوئی تو ہم لوگوں کو خود ہی کر لینی چاہئے »

گاندھی جی کا سامان تو بہت مختصر تھا ہی، چھوٹے سے بستر ہی میں سب کپڑے بندھے رہتے تھے، وہ بستر صرف سونے کیوقت ہی کھلتا تھا اور سویرے اٹھ کر اسے خوب قرینے سے باندھکر وہ رکھ دیتے، اس طرح وہ ہمیشہ

بندھا تیار ھی رھتا تھا، دوسرا ایک ٹین کا ڈبہ تھا۔ وہ یہ باتیں اپنی پوری کرتے کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور بستر اور ڈبہ لے کر یہ کہتے ہوئے روانہ ہوگئے کہ میں تو جاتا ھوں وھیں سوؤنگا۔ ھملوگ بہت گھبرائے اور پیچھے پیچھے دوڑ کر انکے ھاتھ سے کسی نے بستر لیا اور کسی نے ڈبہ اور اسکے بعد ھم نے کہا کہ ھملوگ بھی چلتے ھیں۔ گاندھی جی تھوڑی دیر ٹھر گئے ھملوگونکے سامان میں سے۔ جو رات کیلئے ضروری تھا اسے الگ کر کے ھملوگ بھی چلے گئے۔ وھاں پہنچتے ھی گاندھی جی نے دیکھا کہ برآمدے میں جھاڑو پڑی ھے اسے انہوں نے فوراً اٹھا لیا اور ایکطرف سے جھاڑنا شروع کردیا یہ دیکھکر ھم سب حیران رہ گئے۔ خیر کسیطرح انکے ھاتھ سے جھاڑو لے لی گئی جہاں تہاں ھملوگوں کے بھی بستر پڑ گئے آخر میں ھملوگوں نے یہ کیفیت پیش کرنیکی کوشش کی کہ ھم نے یہ سوچا تھا کہ آج رات نہ آ کر اگر کل سویرے اس جگہ آتے تو کوئی بات نہ بگڑتی اسلئے جب شام تک ھم یہاں نہ آسکے تو ھم نے آج آنیکا ارادہ چھوڑ دیا تھا اسپر انہوں نے پھر سمجھا کر ھمارے دل پر اس بات کو خوب جما دیا کہ جب ایکبار کوئی ارادہ کرلیا جائے تو

اسے چھوڑنا نہیں چاہئے، یہ تیسرا حقیقی سبق تھا۔ اپنے ہاتھوں اپنی گٹھری اٹھانا۔ آتے ہی جھاڑو دینے لگنا۔ ہم سب کیلئے ایک بالکل نئی بات تھی کیونکہ ہماری زندگی اس دن تک دوسری طرح سے گذرتی تھی۔ ہم نے ہماری جماعت کے لوگونمیں سے کسی نے کم سے کم بہار میں اسطرح کے کام کبھی نہیں کئے تھے لیکن اس قسم کے حقیقی سبق روز بروز ملتے رہے۔

ہمارا پورے دن کا کام بہت سخت اور محنت کا رہتا مہاتما جی صبح بہت جلد اٹھ جاتے۔ ان دنوں وہ جماعتی "پرارتھنا" (دعا) نہیں کیا کرتے تھے۔ شاید اکیلے میں کرتے تھے۔ انکا کھانا شروع میں کچھ دنوں تک "چینی با ام" (مونگ پھلی) اور کھجور تھا، جب آم ملنے لگے تب آم بھی کھانے تھے لیکن ابھی کچھ دنوں تک انہوں نے اناج نہیں کھایا، اپنا سب کام اپنی ہی ہاتھ سے وہ کرلیتے، اشنان (غسل) کے بعد کپڑے بھی صاف کرلیتے، سویرے سے شام تک لکھتے پڑھتے اور کسانوں سے ملتے جلتے رہتے تھے، جب کبھی ضرورت ہوتی سرکاری ملازمین سے بھی ملتے، لیکن ابھی نیل والوں سے راہ و رسم نہیں ہوئی تھی ہملوگ بھی خوب سویرے اٹھ کر اشنان (غسل)

اور کچھ ناشتہ کر کے سورج نکلتے نکلتے الگ الگ ایک چٹائی قلم و کاغذ اور دوات لیکر بیٹھ جاتے اور بیان لکھنے لگتے اسطرح تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک لکھتے اور پھر کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنیکے بعد ۱ بجے سے پھر بیٹھ جاتے اور شام تک لکھتے رہتے. کسانوں کی اتنی بھیڑ ہونے لگتی کہ ہم جتنے تھے بیان لکھنے کا کام پورا نہیں کرسکتے تھے اسلئے چند دنوں کے اندر دوسرے اور چند دوست آ گئے اور اسیطرح کام میں لگ گئے. میرا اندازہ ھے کہ اگر ہم دس بارہ آدمی اس طرح اپنی دکان لگا لیتے اور دن بھر لکھتے لکھتے تھک جاتے تو جتنے لوگ آئے ہوئے تھے سب کا بیان پورا نہیں ہوسکتا اور ان کو دوسرے دن تک کیلئے ٹھہرنا پڑتا شام کو اٹھنے کے پہلے ہملوگ باقی کسانوں کے نام لکھ لیتے اور دوسرے دن انکے بیان لکھ لینیکے بعد ھی نئے آنیوالونکا بیان لکھتے، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ کسانوں کو ایک روز سے زیادہ انتظار کرنا پڑتا.

موتی ھاری چمپارن ضلع کے دکھنی حصہ کے بیچ میں ھے. ضلع کے آدھے یا اس سے بھی زیادہ اتری (شمالی) حصے کے بیچ

میں بڑا مقام « بتیا » ھے جہاں بتیا راج کے مہاراج کا محل ھے۔ موتی ھاری میں بیشتر دکھنی حصہ کے کسان زیادہ آئے اتری حصہ والے دوری کیوجہ سے بہت نہیں پہونچ سکے پھر بھی جتنے آئے اتنوں کے بیان سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ وہانکی حالت بھی اتنی ھی خراب ھے اور کچھ جگہونکی تو دکھنی حصہ سے بھی زیدہ خراب ھے اسلئے یہ ارادہ کیا گیا کہ کسانونکی سہولت کیلئے اور وھاں کی حالت خود دیکھنے کیلئے « بتیا » بھی جانا چاھئے تھا۔ راجکمار شکل بتیا سے بھی اور دور اتر کے حصہ کے رھنیوالے تھے جو « تہارو » لوگونکے رھنے کیوجہ سے « تہاروھٹ » کہلاتا تھا، وہ تو یہی چاھتے تھے کہ ادھر بھی گاندھی جی جائیں اسلئے ارادہ ھوا کہ دو ٹولیونمیں ھم بٹ جائیں، ایک ٹولی موتی ھاری میں بیان لکھے اور دوسری بتیا میں جاکر رھے، اور ھملوگونمیں ادل بدل بھی ھوتا رھے جس سے ھر ایک کو سارے ضلع کی واقفیت ھوجائے۔ ھملوگ کسانمیں سے ایک ایک کا بیان لکھتے اور اسے پورا کرکے گاندھی جی کو دیدیتے وہ اسکو پڑھ لیتے اور کوئی خاص اھم بیان ھوتا تو انکو خاص طور سے بتادیا جاتا تاکہ اگر کوئی ضروری کارروائی انکو کرنی ھو تو کرسکیں۔

ایکدن کا ذکر ھے کہ قریب دس بجے دن کیوقت ایک گاؤں کے کسان نے بیان دیا کہ " انکے گاؤں کے کسی آدمی کو ایک نیل والے کے ملازمین نے پکڑ کر پیٹا ھے اس کو لیجا کر مرغی خانہ میں بند کر رکھا ھے . مہاتما جی نے اسے پڑھتے ھی ھم میں سے ایک کو حکم دیا کہ سائکل پر جا کر اور تحقیقات کر کے بتاؤ کہ اسمیں کہاں تک سچائی ھے . دوپہر ھی میں وہ وھاں گئے جو پانچ سات میل دور تھا انکے وھاں پہنچتے ھی کچھ لوگ جمع ھو گئے اور کوٹھی والوں کو خبر مل گئی کہ گاندھی جی کا کوئی وکیل آیا ھے . انہوں نے فوراً اس آدمی کو مرغی خانہ سے نکالکر دوسری جگہ چھپا دیا . لیکن چھٹنے کیبعد وہ خود آیا اور اس نے سب حالت بیان کر دی یہ تو ایک واقعہ تھا اسطرح کے واقعات اکثر ھوا کرتے کبھی مجسٹریٹ کو لکھنا پڑتا یا ھملوگوں سے کسی کو کہیں جانا پڑتا اسکا اثر یہ ھوتا کہ جو ظلم فوراً ھونیوالا ھوتا وہ رک جاتا، اس سے کسانونکے دلمیں اور بھی بھروسہ اور اعتماد بڑھتا .

موتی ھاری میں جب ھملوگ دوسرے مقام پر چلے گئے اور وھاں اپنا انتظام کرنا پڑا تو یہ سوال اٹھا کہ رسوئی (کھانا) کون تیار کرے ؟ اور چوکا برتن کون کرے ؟ ھم بہاریوں کی ایسی

عادت ہے کہ جس سے ہوسکتا ہے وہ نوکر رکھتا ہے جو اسکا سب کام کرتا ہے اور اسطرح ہم میں سے کئی آدمی اپنے اپنے نوکر ساتھ لیگئے تھے۔ پھر بھی انمیں سے کوئی رسوئی (کھانا) نہیں تیار کرسکتا تھا اسلئے کہ انمیں کوئی برھمن نہیں تھا اور ہم کئی ذاتوں کے تھے اسلئے ایک برھمن ھی ایسا رسوئیا (کھانا پکانیوالا) ہوسکتا ہے جسکا پکایا ہوا کھانا ہم سب کھاسکتے تھے۔ ہم میں سے اکثر سبھی ذات پات کے ماننیوالے تھے۔ میں تو ایسے ھی کٹر لوگوں میں تھا، کچھ بچپن ھی سے گھر کے دستور کا اثر ایسا پڑا تھا میں گھر سے جب باھر «چھپرا» پٹنہ اور «کلکتہ» وغیرہ گیا تو بھی اپنی ذات کے یا برھمن رسوئیے کے ھاتھ کی «کچی رسوئی* » کھایا کرتا تھا۔ جب ہم لوگ کلکتہ گئے اور وھاں «ایڈن ھندو ہوٹل» میں رھنے لگے تو وھاں بھی اپنے لئے الگ رسوئی (کھانے) کا انتظام کرایا۔ جس میں ہماری برھمن (رسوئیا پکانیوالا) رکھا گیا وھاں ذات پات کی کچھ ایسی سختی رھی کہ ہم میں سے ایک دو بہاریوں کو چھوڑ کر

---

* کچی رسوئی معمولی روٹی یا دال چاول کی تیاری کو کہتے ہیں، اس کے مقابلہ مین پکی رسوئی تلی ہوئی چیزوں مثلاً پوریاں وغیرہ کو کہتے ہیں۔ [م]

دوسرے سبھی بہاری بنگالی برھمن کی تیار کی ہوئی کچی رسوئی کھانے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے بہاری برھمن تلاش کر کے رسوئیا (کھانا پکانیوالا) رکھا گیا. کلکتہ جانے کے بعد مجھ میں کایستھوں کے کئی اعلی ذات والوں کے فرق کو ترک کر کے ہر ایک کایستھ کے ساتھ چاھے وہ کسی شاخ کا ہو، کھانا کھا لیا کرتا تھا. لیکن کسی دوسری ذات کے آدمی کے ساتھ پندرہ برس تک تعلیم کے زمانہ میں بھی یا اس کے بعد وکالت شروع کرنے پر بھی میں نے بنگالی برھمن تک کی تیار کی ہوئی کچی رسوئی نہیں کھائی ہمارے بہت سے بنگالی دوست تھے. جن میں سے کچھ کے ساتھ بہت گہری دوستی تھی. اور جن کے گھر کے لوگ خود بھی ذات پات کے بہت ماننے والے تھے. ان کے برھمن ہونے کے باوجود بھی میں نے ان کے گھر کی « کچی رسوئی » کبھی نہیں کھائی یہ سب لوگ جانتے تھے. اور جب کبھی کھانے پینے کا موقع آتا تھا تو مجھ جیسے کے لئے وہ پوری اور مٹھائی وغیرہ کا انتظام کرتے تھے. دال بھات (دال چاول) کا نہیں. کیونکہ پوری اور ترکاری پکی

رسوئی سمجھی جاتی ھے اور دال بھات کچی، یہ محاورہ بہار
یوپی، راجپوتانہ وغیرہ ھی میں استعمال ھوتا ھے اس لئے "کچی
پکی" الفاظ کا مذاق بھی ھوا کرتا۔ "جل پان" کا لفظ تو
مہاتما جی کے لئے ایک بڑے مذاق کا لفظ ھوگیا تھا۔ اس لفظ
کا مطلب تو پانی پینا ھے لیکن بہار میں کچھ کھا کر پانی پیتے
ھیں اور جو کچھ کھایا جاتا ھے اسی کو "جلپان" کہتے ھیں
اسی لئے جلپان کا مطلب کچھ کھانے کا ھے جس کی مقدار
کھانے والے اور کھلانے والے کی خواھش پر منحصر ھوتی ھے
وہ اس لئے اکثر مذاق کیا کرتے تھے کہ پانی پینے کے نام
پر آپ لوگ اتنا کھا لیا کرتے تھے اور یہ مذاق آخر تک
چلتا رھا، جب کبھی ھمارے جیسے کسی بہاری سے کھانے
کی بات کرتے تو مہاتما جی لفظ جلپان کہکر ھنسا کرتے۔

ذات پات کیوجہ سے اب برھمن رسوئیا (کھانا پکانیوالا)
تلاش کرنے کی ضرورت پڑی، مہاتما جی نے کہا کہ اسطرح
ذات پات رکھنے سے کام میں رکاوٹ پڑیگی، اور ھم میں
سے ھر ایک کے لئے الگ الگ چولھے جلانے پڑیں گے
اور خرچ بھی بڑھے گا۔ پبلک کام اس طرح نہیں چل

سکتے، ہم کو اسے چھوڑنا پڑیگا، آخر جب ہم سب ایک هی کام میں لگے ہوئے هیں تو ہم سب کی ایک ذات کیوں نه سمجھی جائے اس طرح سمجھا کر انہوں نے موتی هاری هی میں ذات پات کو توڑوا دیا، ہم میں سے ایک آدمی نے کھانا پکایا اور ہم سب نے مل کر کھایا، اس طرح پہلے پہل کسی دوسری ذات کے آدمی کی تیار کی ہوئی کچی رسوئی میں نے کھائی.

چند دنوں کے بعد ان کو پتہ چلا کہ ہملوگوں کے ساتھ کئی نوکر هیں، پہلے تو بہت سے لوگ دن رات گھیرے رهتے تھے اور وہ سب کو کچھ نہ کچھ خدمت کرنے پر تیار رہا کرتے اس لئے اسکا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون نوکر هے؟ اور کون گاؤں کا آیا ہوا رضا کار (والنٹیر)؟ لیکن میرے پاس ایک موٹا تازہ اور دیکھنے میں عزت دار کسان جیسا آدمی نوکر تھا، وہ موتی هاری میں بھی تھا اور جب میں بتیا گیا تو وهاں بھی ساتھ تھا اس وقت مہاتما جی کو خیال ہوا کہ آخر یہ کون آدمی هے؟ جو موتی هاری میں بھی تھا اور بتیا میں بھی، اس قدر خدمت کرتا رہتا هے،

ان کا خیال تھا کہ وہ بھی کوئی رضا کار ھے لیکن جب ان
کو معلوم ہوا کہ صرف وھی نہین بلکہ اس قسم کے اور بھی
خدمت گذار ھیں جو رضا کار نہیں، اسوقت انہوں نے ھملوگون
سے کہا کہ اسطرح نوکر رکھکر اپنا کام کرانا کسی بھی قومی خادم
کیلئے ٹھیک نہیں ھے؛ قوم کی سیوا کرنیوالے کو تو ان سب
باتوں میں اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاھئے، نتیجہ یہ ھوا کہ ایک
ایک کر کے سب نوکر ھٹا دئے گئے صرف ایک آدمی رکھا گیا،
جو چوکا برتن (باورچی خانہ کا کام) کرتا تھا ھملوگون نے بھی
آھستہ آھستہ اپنے سب کام خود کرنے سیکھ لئے، اپنا کام کر
لینا کچھ اتنا کٹھن نہیں ھوتا ھے، جتنا ھم پہلے سمجھتے تھے
ھم نے اپنے لئے یہ قاعدہ بنا لیا تھا کہ سویرے اٹھتے ھی
اپنے اپنے بستر ٹھیک طرح سے لپیٹ کر ایک مقررہ جگہ پر
رکھ دیتے اس کے بعد صبح کا اشنان کر کے اپنے کپڑے
بھی دھو لیتے اور اس کے ساتھ ھی پانی بھی بھر کر رکھ
لیتے تا کہ جب ضرورت ھو اسوقت پانی ملجائے، پانی بھرنے
کا کام کم کرنا پڑتا کیونکہ کوئی نہ کوئی کسان موجود ھوتا، جو
دوڑ کر ھمارے ھاتھوں سے گھڑا لے لیتا اور پانی بھر لاتا، اس

طرح نہانے کا کام بھی جس میں زیادہ پانی لگتا ہے آسانی سے ہوجاتا. چونکہ بہار کے رواج کے مطابق ہم کنوین کے پاس ھی کہلے میدان میں نہا لیا کرتے.

اب شری «کستور با» یہاں آگئیں تو رسوئی تیار کرنیکا کام گاندھی جی نے انکو ھی سونپ دیا ہمکو یہ بھلا نہیں معلوم ھوا، لیکن گاندھی جی نے نہ مانا اور کہا «اسمیں کوئی حرج نہیں ہے ان کو اسکی عادت ہے. ہاں اگر آپلوگ چاہیں تو انکی مدد کرسکتے ھیں» کرپلانی جی خاصکر انکی مدد کرتے. زیادہ آدمیوں کیوجہ سے جب زیادہ چاول پکانے پڑتے تو برتن «با» کیلئے بھاری ھوتا اسوقت ہم میں سے کوئی جا کر اسکو چولھے پر سے اتار دیا کرتا «با» کے آجانیکے بعد گاندھی جی انج کہانے لگے اور جب ہم سب ایک ساتھ کھانے بیٹھ جاتے تو مہاتما جی خود اپنی ھاتھوں سے سب کو پروستے (دیتے) کھانیکے بعد ہم سب اپنے اپنے برتن دھو کر اپنے پاس رکھ لیا کرتے، صرف بٹلوئی (دیگچی) وغیرہ دھونے کیلئے ایک نوکر تھا، شام میں قریب ۵ بجے اور دن میں تقریباً گیارہ بجے کھانا ھوا کرتا اور سویرے ہملوگ کچھ جلپان کیا کرتے، شام کے کھانیکے بعد ہملوگ گاندھی جی کیساتھ ٹہلا کرتے اور کچھ دور تک

نکل جاتے، ٹہل کر لوٹنے کے بعد بیان نہیں لکھے جایا کرتے۔ گاندھی جی ہم سب کام کرنیوالوں کیساتھ بیٹھکر دن بھر کے کاموں پر تبادلۂ خیالات کرلیا کرتے اور آئندہ کا پروگرام بھی ٹھیک کرلیتے۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مہاتما جی ہم میں سے کچھ کو ساتھ لیکر «بتیا» گئے۔ وہاں بھی ہمارا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ بتیا میں «ہزاری ملکہ» ایک دھرمشالہ ہے۔ اسی کے دو تین کمرے ہم نے لے لئے تھے۔ اس دھرمشالے میں اس زمانہ کی پکی چھت تو تھی لیکن اوپر کوئی کمرہ نہیں تھا۔ البتہ اوپر جانے کیلئے جو سیڑھیاں تھیں ان پر چھت ہونے کی وجہ سے تھوڑی سی جگہ یعنی تین فٹ چوڑی اور چھ فٹ کے لگ بھگ لمبی مل گئی تھی دن بھر وہ وہیں بیٹھے کام کیا کرتے اور رات کو وہ اور ہم سب لوگ اوپر کھلی چھت پر سو جاتے۔ دن کو ہملوگ نیچے کے کمروں میں رہتے، کمرہ کے اندر برآمدے میں اور باہر بھی احاطہ میں جہاں کہیں جگہ مل جاتی اپنی اپنی چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور کسانوں کے بیان لکھا کرتے، بھیڑ اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ دھرمشالہ اور اسکا احاطہ کھچا کھچ بھرا رہتا کچھ دنوں کے بعد بتیا ہی ہملوگونکا صدر مقام ہوگیا۔

چوتھا باب

نیل والوں کا ایک طریقہ یہ تھا. کہ جب وہ کسی علاقہ کے کسانوں کو سر اٹھاتے دیکھتے تھے تو کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر انہیں دبا دینے کی تدبیریں کرتے، ان کے لئیے بہانہ ڈھونڈھ نکالنا یا پیدا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی ایک طریقہ یہ تھا کہ اپنی کوٹھی کے کسی چھوٹے موٹے مکان میں خود آگ لگوا دیتے اور یہ کہکر کہ کسانوں نے آگ لگا دی ھے خوب لوٹ مار کرتے، پولس سے ظلم کراتے اور جہاں بہت زیادہ سخت مقابلہ ہوتا وہاں تعزیری پولس بٹھوا دیتے. اس طرح کے بیانات ہم لوگوں کے سامنے بہت سے کسانوں نے دئے تھے، لیکن اس کا کوئی ثبوت ملنا مشکل تھا «بتیا» میں ہم لوگوں نے اخباروں میں پڑھا کہ کوٹھی میں آگ لگ گئی ھے،

اور گاندھی جی کے چمپارن آنے سے جو ھل چل مچی ھے
اسکی وجہ سے ھی ایسا ھوا. خبر پڑھتے ھی ھم لوگوں نے
واقعہ کی جانچ کرنی چاھی لیکن یہ واقعہ کچھ دن پہلے کا
تھا اس لئے پورے یقین اور بھروسے کیساتھ کسی ٹھیک نتیجہ
پر نہیں پہنچ سکتے تھے حالانکہ کسان بھی زور دے کر
کہہ رھے تھے کہ کوٹھی والوں نے یہ خود کرایا ھے.
خیر اخباروں میں یہ خبر چھپی. ممکن ھے کہ شاید مقامی
افسروں نے اس کی رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی ھو. مگر ھم
لوگوں کو اس کی خبر نہیں ملی، بیان کافی لکھے جایا
کرتے تھے. شاید دس ہزار تک بیان ھم لکھ چکے تھے اور
اس کے علاوہ بہت سے کاغذ کسانوں نے تلاش کر کے لا
کر دئے تھے سارے ضلع کی کوٹھیوں کی تقریباً سبھی
باتیں ھم لوگوں کو معلوم ھوچکی تھیں گاندھی جی سب ھی
جان گئے تھے اتنے میں ایک روز گورنمنٹ کی طرف سے
ایک خط آ گیا جس میں لکھا تھا کہ گاندھی جی نے بہت
سے کسانوں کے بیان سن لئے، گورنمنٹ سمجھتی ھے کہ انکی
جانچ پوری ھوگئی ھوگی، اس لئے "ریونیو بورڈ" کے ممبر

کو جو بڑے حاکم تھے اور ایک « سینیر سویلین » انگریز افسر تھے، گورنمنٹ رانچی سے پٹنہ بھیج رهی هے، گاندهی جی ان سے مل کر باتیں کریں اور اپنی جانچ کا ان کو نتیجہ بتائیں۔ خط پاتے هی هم لوگ سمجھ گئے که مقامی افسروں کے لکھنے پر هی شاید گورنمنٹ نے اب جانچ بند کرنی چاهی هے اور اسی لئے یه بلاوا هے گاندهی جی نے هم لوگوں سے کہا که آپ لوگوں کو تو سبھی باتیں معلوم هوگئیں، اب ایک رپورٹ تیار کیجئے جس میں رعایا کی بھی شکایتیں لکھئے، جن کو ثابت کرنے کے لئے همارے پاس کافی ثبوت موجود هے، اس کے بعد هم لوگ گورنمنٹ سے ان شکایتوں کو دور کرنے کے لئے کہیں۔ هم لوگ مل کر رپورٹ کی تیاری میں لگ گئے یوں تو هم لوگوں نے جتنے بیان لکھے تھے ان کو الگ الگ کوٹھی وار چھانٹ رکھا تھا اس طرح یه معلوم هوگیا تھا که کس کوٹھی کے خلاف شکایت هے؟ کیونکه کوٹھیوں کا اپنا اپنا طریقه الگ الگ تھا، ان کے خلاف جو شکایتیں آئیں ان سے ظلم کے الگ الگ طریقے معلوم هوگئے هیں، اسکے

علاوہ یہ بھی پتہ لگ گیا کہ ظلم کے سوا کن کن طریق سے کسانوں کو تکلیف تھی۔

گاندھی جی بابو برجکشور پرشاد کے ساتھ پٹنہ گئے، وھاں «ریونیو ممبر» سے ان کی ملاقات ہوئی، ملاقات میں ریونیو ممبر نے اس بات پر زور دیا کہ بیانات کافی لکھے جا چکے ھیں اب گاندھی جی کو تمام شکایتوں کا علم ہوگیا ھے اس لئے وہ جانچ کا کام ختم کریں اور گورنمنٹ کو اپنی جانچ کی رپورٹ دیں تاکہ گورنمنٹ اس پر غور کر سکے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس جانچ کیوجہ سے بہت ھل چل ھے اور نیل والے گھبرا رھے ھیں۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی ھے، خاص کر انہوں نے یہ کہا کہ گاندھی جی پر گورنمنٹ کو اعتماد ھے اور وہ اگر اکیلے رھیں تو گورنمنٹ کو کوئی خاص اعتراض نہیں ھے۔ لیکن ان کے ساتھ جو وکیل لوگ کام کر رھے ھیں۔ وہ پرائے خرافاتی ھنگامے مچانیوالے ھیں جو اپنے فائدے اور اپنی وکالت چلانے کے لئے گاندھی جی کیساتھ ھو گئے ھیں، انکی کوئی ضرورت نہیں ھے، گاندھی جی ان کو ھٹا دیں۔

گاندھی جی نے جواب دیا کہ "رپورٹ تو "بتیا" واپس ہو کر فوراً گورنمنٹ کو بھیج دیں گے اور جانچ کے متعلق بھی اب پہلی جیسی پوری تفصیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مختصر طور پر ایسا خلاصہ لکھ دیا جائے گا جس سے وقت بچے، جہاں تک مددگاروں کے ھٹا دینے کا سوال تھا، انھوں نے صاف جواب دے دیا کہ "وہ ایسا نہیں کرسکتے"۔ بات چیت کے بعد "ریونیو ممبر" رانچی چلے گئے اور گاندھی جی بتیا واپس آ گئے اور ایک دو روز کے اندر ھی ہم لوگوں نے جو رپورٹ کیلئے مواد تیار کیا تھا اسے دیکھ کر انھوں نے خود ایک چھوٹی سی رپورٹ تیار کرلی جس میں وہ سب شکایتیں آ گئیں جو رعایا کی طرف سے کی گئی تھیں۔ ہم لوگوں نے جو رپورٹ لکھی تھی وہ لمبی تھی کیونکہ ہم نے صرف شکایتیں ھی نہیں لکھی تھیں بلکہ ان کی تائید میں جو ثبوت ہم کو ملے تھے ان کا بھی خلاصہ میں ذکر کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے اسی حصے کو نکال دیا اس میں صرف شکایتوں ھی کو رکھا اور یہ کہا کہ "ان شکایتوں کے ثبوت میں ہمارے پاس کافی مواد موجود

ہے، مددگاروں کے ہٹانے جانے کی تجویز کی انہوں نے زور دار لفظوں میں مخالفت کی، اور لکھا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم اتنے دنوں سے دن رات کام کرتے رہے ہیں ان کو ہم اچھی طرح پہچان گئے ہیں، گورنمنٹ کے کسی افسر کو ان کے جاننے پہچاننے کا اتنا لمبا اور اچھا موقع نہیں ملا ہوگا، اگر گورنمنٹ کا ہم (گاندھی جی) پر بھروسہ ہے تو اس کو یہ بھی بھروسہ کرنا چاہئے کہ ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے اور جب ہم نے ان کو اپنے ساتھ رکھنا ٹھیک سمجھا ہے تو ہمارا یہ فیصلہ بھی ٹھیک ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ "یہ سب لوگ سچے اور ایماندار ہیں اپنا سب کاروبار چھوڑ کر اس کام میں لگے ہین جہاں تک ہم نے دیکھا ہے ان کے دل میں گورنمنٹ یا نیل والوں کی طرف سے کسی قسم کی نفرت کا جذبہ نہین ہے، البتہ یہ کسانوں کی تکلیف سے متاثر ہو کر ان کی مدد کرنی چاہتے ہیں، آخر میں انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اس پر راضی نہیں ہیں کہ ہم مددگاروں کو

وہاں سے ہٹا دیں۔

اس وقت گاندھی جی کی کچھ نیل والوں سے کافی واقفیت ہوچکی تھی، وہ ان سے کبھی کبھی ملا بھی کرتے تھے، بعض تو ان کو اپنے گھر بھی بلاتے تھے۔ کچھ ان میں سے یہ کہکر بلاتے تھے کہ ان کے خلاف جو شکایتیں کی گئیں ہیں۔ وہ غلط ہیں اس لئے گاندھی جی اگر ان کے گھر آجائیں تو وہ ثابت کردیں گے کہ وہ سب غلط ہیں، کسانوں سے بھی وہ اس بات کا ثبوت دلوا دینگے جب کبھی وہ نیل والوں کے گھر جاتے تو وہ ان کو اپنی سب باتیں سناتے۔ بتاتے اور دکھاتے کہ انہوں نے کس طرح کھیتی کو ترقی دی ہے۔ ادھر کچھ اور لوگ بھی تھے جو نیل والوں کے اپنے آدمی اور ان کے یہاں نوکر تھے ہم لوگوں کو آکر بہت سی باتیں بتا جایا کرتے۔ کبھی کبھی کچھ کاغذ بھی دے جاتے۔ ایک بار ایک سرکاری ملازم نے ایک رپورٹ کی نقل ہم لوگونکو لا کر دی، گاندھی جی کو ہم لوگوں نے وہ نقل لیجا کر دی، پڑھنے سے پہلے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری ملازم نے یہ چھپا کر

ہم کو لا کر دی ہے. اور اس کی باضابطہ نقل ہم کو نہیں مل سکتی تو انہوں نے اس کاغذ کو پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کو واپس کر دو، ہم کسی ایسی چیز کو نہیں دیکھنا چاہتے جو ہمارے پاس سیدھی اور سچائی سے نہیں پہنچ سکتی بلکہ چھپا کر لائی گئی ہے. ان کے سچے طریقے کا ہم لوگوں کیلئے ایک تجربہ تھا جس کا اثر ہم لوگوں پر بہت ہوا.

بہت دنوں بعد جب میرے جیل جانے کی نوبت آئی تو میں نے دیکھا کہ بہت سے بھائیوں کے پاس چٹھیاں خفیہ طریقے سے آ جایا کرتی تھیں. اخباروں کے متعلق بھی بڑی سختی تھی جیل میں سوائے "ہفتہ وار اسٹیٹسمین" کے جو باہر کے ملکوں کیلئے چھپتا تھا. دوسرا کوئی اخبار سنہ ۱۹۳۰ و ۱۹۳٤ کے ستیا گرہ کے موقع پر ہم لوگوں کو نہیں ملا کرتا تھا، لیکن ہم دیکھتے تھے کہ کچھ بھائیوں کے پاس اخبار بھی آ جایا کرتے تھے میرے اوپر اسی واقعہ کا اتنا اثر تھا کہ میں نے کبھی نہ تو بے ضابطہ کوئی خط لیا اور نہ بے ضابطہ کوئی اخبار یا کتاب یا

کوئی اور چیز بھی۔ گورنمنٹ کا حکم تھا کہ چٹھی، اخبار، کتابیں یا اور کوئی چیز مجسٹریٹ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے معائنہ کرنے والے افسر کے «پاس» کئے بغیر کسی قیدی کو نہ دی جائیں، جیل کے افسر اس حکم کی اس طرح سے تعمیل کرتے کہ «سنسر» کے پاس کئے بغیر کوئی خط نہ دیتے اور «سنسر» کے یہاں سے پاس ہو کر آنے میں بہت دیر لگتی۔ ان سے جب ہم نے دیر کی شکایت کی تو یہ راستہ نکالا گیا کہ «سنسر» کے پاس بھیجنے کے پہلے خود ہم لوگوں کے پاس لے آتے اور پڑھوا کر واپس لے جاتے۔ ہم کو دیتے نہیں، اور پھر «سنسر» کے پاس بھیج دیتے جب وہ خط «پاس» ہو کر آتا اس وقت ہم لوگوں کو دے دیا جاتا، اس طرح ہم کو خطوط کی سب باتیں معلوم بھی ہو جاتیں اور سرکاری قانون کی تعمیل بھی ہو جاتی۔ میں نے اسطرح سے بھی کوئی چٹھی غیرہ نہیں لی

ایک مرتبہ ایک ایسا واقعہ ہوا جس کو یہاں لکھ دینا اچھا ہوگا۔ کہ جیل کے افسر ہم لوگوں کو خوش رکھنے اور آرام پہونچانے کیلئے بیقرار رہتے ان میں سے ایک نے

مجھ سے کہا کہ آپ لوگ ملک کیلئے اپنا سب کچھ
چھوڑ کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور تکلیف اٹھا رہے
ہیں، ہم بھی تو آدمی ہیں. ہمارے دل پر بھی تو اثر ہوتا
ہے. ملک کی محبت زیادہ نہیں تو تھوڑی تو ہے. پیٹ کی
وجہ سے نوکری کرنی پڑتی ہے. اسی پیٹ کی وجہ سے
نوکری میں ہم کو ہزاروں بار جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے.
فریب کرنا پڑتا ہے. چوری کرنی پڑتی ہے. ہم روز ہی یہ
سب کچھ کیا کرتے ہیں تو اگر ہزاروں جھوٹ میں دو چار
بھی آپ لوگوں کو آرام پہونچانے کیلئے ہم کام میں لائیں
تو اس کو ہم اپنے حق میں اچھا سمجھتے ہیں اس لئے
آپ ان باتوں کی فکر نہ کریں میں نے اپنے متعلق ان کو
جو کچھ سمجھایا اس کو وہ سمجھ گئے اور میرے پاس اس
طرح بے ضابطہ چٹھی وغیرہ لیجانیکی کوشش نہیں کی
لیکن جو لوگ چاہتے ان کو وہ اوپر لکھے ہوئے طریقہ
سے دکھلا دیا کرتے تھے.

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کتابوں کے متعلق بھی ایسا
ہی سخت قاعدہ ہے، ہر وہ کتاب جسکا سیاسیات سے

تعلق ہو، دینے کی ممانعت تھی صرف مذہبی کتابیں، ناول قصے کہانی اور اسی طرح کی ہلکی چیزیں ہی دی جاسکتی تھیں، مگر یہ بھی «سنسر» کے «پاس» کرنے پر. میں نے مہاتما جی کے «نان کوآپریشن» سے متعلق تحریکوں کو مضمون واری الگ الگ جمع کر کے ان پر اپنا ایک مقدمہ جس میں ایک ایک مضمون کی سبھی تحریروں کا خلاصہ ہوتا. لکھنے کا ارادہ کیا میں نے «جیلر» سے کہا کہ «ضروری کتابیں خصوصاً مہاتما جی کی تحریروں کے مجموعے جو اس وقت تک کئی جلدوں میں چھپ چکے تھے منگوا لئے جائیں. ان کے علاوہ کچھ دوسری کتابیں «سیاسی معاشیات» کی بھی منگوائیں، جیلر نے کئی کتابیں لا کر میرے پاس رکھدیں، میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کتابیں بغیر پاس کئے ہی آئی ہیں اور نہ یہ جانتا تھا کہ قاعدہ کے مطابق ایک کتاب ہی ایک بار دی جاسکتی تھی. میں اپنے کام میں لگ گیا، اکثر سبھی مضمونوں پر جو مہاتما جی کے اس وقت کے تھے اور جن کو میں مضمون واری تقسیم کر سکتا تھا. میں نے مقدمے لکھ

ڈالے، کچھ نوجوان دوستوں نے، جو جیل میں تھے، میرے بتانے کام کے مطابق۔ ان مضمونوں کی نقل کر ڈالی کام بہت حد تک پورا ہو چکا تھا لیکن وہ یکبارگی پورا نہیں ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کتابیں قاعدہ کی رو سے آئی ہیں اس لئے میں نے جیل کے کسی افسر سے چھپانے کی نہ کبھی کوشش کی اور نہ اسکو سوچا۔ سپرنٹنڈنٹ تو ہفتہ میں ایک بار آتا ہی تھا اور وہ بات چیت کر کے چلا جاتا تھا۔ کتابیں اسکی نظر میں ضرور آجایا کرتی تھیں کیونکہ کبھی کبھی جب وہ پہنچتا تو میں ان کتابوں سے کام لیتا ہوتا لیکن اس نے بھی کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ اس لئے مجھے بھی کبھی شک نہیں ہوا کہ یہ کتابیں بے قاعدہ طریقہ سے آئی ہیں۔ ایک دن خبر آئی کہ محکمہ جیل کا سب سے بڑا افسر (انسپکٹر جنرل) آئیگا۔ جیلر نے آکر کہا کہ "ان کتابوں کو میں اپنے پاس لیجا کر رکھوں گا۔" اس وقت میرے دل میں شک پیدا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ کتابیں قاعدہ کی رو سے نہیں آئی ہیں؟ اس کے بعد میرے اس کہنے پر کہ آپ نے بے قاعدہ طریقے سے یہ کتابیں

کیوں دیں اس نے اپنا وہ فلسفہ بتایا جو اوپر لکھا گیا. جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگوں کی مدد کیلئے کچھ بے قاعدہ کام کرنا یہاں تک کہ جھوٹ بولنا بھی وہ ایک طرح سے ثواب کا کام سمجھتا تھا، اور اس کو اپنی دوسری غلطیوں کا وہ کفارہ سمجھتا تھا، میں نے کتابیں واپس کردیں اور ان کو دوبارہ دینے کی ممانعت بھی کر دی کیونکہ مجھے مہاتما جی کی وہ بات برابر یاد رہی کہ جو کام ہم قاعدہ کی رو سے کھلم کھلا نہیں کر سکتے اس کو چوری چھپے کرنا جھوٹ اور چوری ہے. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو تھوڑا کام باقی رہ گیا تھا وہ پورا نہ ہوا باھر نکلنے پر پھر پورا کرنے کا وقت ھی نہ ملا اور جو کچھ لکھ کر لایا تھا وہ بھی دوسری ستیہ گرہ کے وقت « صداقت آشرم » کے ضبط ہوجانے پر ضائع ہوگیا اور کتاب نہ چھپ سکی.

یہ معاملہ تو ختم ہوگیا، لیکن اس کے ساتھ ھی پڑھنے والوں کی تفریح طبع کیلئے ایک لطیفہ لکھ دینا برا نہ ہوگا. گورنمنٹ کا حکم تھا کہ کوئی سیاست (پولیٹکس) کی کتاب « پاس » نہ کی جائے صرف دل بہلانے والی یا

مذھبی کتابیں دی جائیں ۔ « سنسر » کچھ بہت سمجھدار نہیں تھے اور اگر ہوں بھی تو اتنی کتابوں کے پڑھنے کا ان کے پاس وقت کہاں تھا کیونکہ ہم سیکڑوں کی تعداد میں تھے ۔ اگر کتابیں فی آدمی ایک ایک کر کے بھی دی جاتیں تو « سنسر » کو ھی پڑھکر پاس کرنی پڑتیں اس لئے انہوں نے ایک قاعدہ سا بنا لیا تھا کہ جس کتاب کے نام میں پالیٹکس یا پولیٹکل کا لفظ آجائے تو وہ ھرگز پاس نہ کی جائے ۔ اس طرح پولیٹکل اکانمی (معاشی سیاسیات) کی بھی چھوٹی موٹی کتابیں ، جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ھیں ، پاس نہیں ھوتیں لیکن کمیونزم کے متعلق کتابیں جن کے نام میں « پالیٹکس » لفظ نہیں ھوتا تھا ، پاس ھو کر چلی آتیں ۔ « اے ۔ بی ۔ سی آف کمیونزم » اور « تھیوری آف لیژر کلاس » جیسی کتابیں پاس ھوگئی تھیں ۔ شاید « سنسر » نے سمجھا کہ پہلی کتاب کوئی پرائمر (بچوں کا قاعدہ) جیسی کتاب ھے اور دوسری میں یہ بتایا گیا ھوگا کہ وقت کس طرح کاٹنا چاھئے یعنی کھیلنے وغیرہ سے اس کا تعلق ھوگا ۔ اخبار باضابطہ تو نہیں ملتے تھے لیکن جو چاھتا اس

کو باضابطہ مل جایا کرے۔ خبریں تو سبھی کو مل جایا کرتی تھیں، ان کا راستہ جیل کے افسروں سے مل کر نکالا گیا تھا، جیلر کے دفتر میں ایک صاحب جن کے حافظہ کی قوت بہت تیز تھی روز چلے جاتے، وہاں جیلر وغیرہ جو اپنے لئے اخبار منگاتے وہ ان کو پڑھ کر چلے آتے اور شام کو کھانے کے بعد، کمروں میں بند ہونے کے پہلے ایک جگہ کھڑے ہو جاتے سب لوگ ان کے چاروں طرف آجاتے، وہ سب باتیں زبانی سنا دیتے۔ ہم لوگ کئی «وارڈوں» میں تھے، وہ سبھی وارڈوں میں جا کر اسی طرح خبریں سنا دیتے۔ سرکاری حکم کی تعمیل تو ہوتی کہ اخبار جیل کے اندر نہ جانے پائے لیکن قیدیوں کو اخبار کی سبھی بڑی باتوں کی خبر مل جاتی۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ آدمی اور سرکاری ملازمین بھی ہماری مدد کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے، کچھ تو ایسی مدد تھی جسے ہم لے بھی سکتے تھے۔ کیونکہ مہاتما جی کے اصول سے اس میں جھوٹ اور فریب کی بات نہیں تھی۔ اس طرح کا ہر ایک کام سرکاری ملازموں

نے بہت محنت سے کیا. ان دنوں مہاتما جی هندی
تھوڑی بہت جانتے تو تھے، لیکن اتنی نہیں جانتے تھے
کہ هندی ہی کے ذریعہ سے سب کام کرسکتے یا کراتے،
انہوں نے شروع ہی میں ہم لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ
هندی میں بات چیت کرنی پسند کرتے ہیں لیکن اس
وقت جبکہ اتنا بڑا کام هاتھہ میں لے لیا ہے تو اس میں
هندی اور انگریزی کے جھگڑے میں پڑ کر. وہ کام میں
رکاوٹ ڈالنی نہیں چاہتے اسلئے زیدہ تر وہ باتیں بھی انگریزی
ہی میں کرتے. سارے بیان اسی لئے انگریزی میں لکھے
جاتے، جس میں ان کو پڑھ لینے میں آسانی ہو. ہم لوگوں
کو خیال ہوا کہ ان بیانوں کی نقل بھی ہو جانے تو اچھا
ہوگا، اتفاق سے «بتیا» نے جنس «دھرم شالے» میں ہم
لوگ ٹھہرے تھے اسی میں گورنمنٹ کے «سروے سٹلمنٹ
ڈپارٹمنٹ» کے ٹائپ کرنیوالے اهل کار بھی رہا کرتے تھے
گاندھی جی اور ہم لوگوں کے ساتھہ ایک ہی مکان میں
انہوں نے ٹھرنا اپنی خوش قسمتی سمجھا، ہم لوگوں سے
انہوں نے کہا بھی کہ دفتر جانے سے پہلے صبح اور

دفتر سے لوٹنے کے بعد ان کو رات بھر فرصت رھتی ھے اگر ھم لوگوں کو ٹائپ کرانا ھو تو وہ خوشی سے کر دیا کریں گے، یہ بات ھم کو بہت پسند آئی. خطوط وغیرہ کے علاوہ سب بیانوں کی نقل تیار کر دینے کو ان سے کہا بڑی محنت سے. انہوں نے یہ سب کام خوشی خوشی کر دیا وہ تین چار آدمی تھے. جن میں دو تو بہت ھی ھوشیار اور تیز ٹائپ کرنیوالے تھے. ان کی محنت کا اندازہ اسی سے ھو سکتا ھے کہ جب ھم نے بیان لکھنے بند کئے اس وقت تک تقریباً چوبیس پچیس ہزار کسانوں کے بیانات ھم لوگوں نے لکھ لئے تھے. ان میں سے تقریباً دس ہزار کے پورے پورے بیانات اور باقی کے خلاصے تھے. اس کے علاوہ جب کمیشن مقرر ھوا تو اس کے سامنے پیش ھونیوالے کاغذوں. خطوں وغیرہ کو بھی انہوں نے ھی ٹائپ کیا، ھم لوگ جتنے دن تک چمپارن اس کام میں لگے رھے انہوں نے برابر یہ کام کیا اور یہ اہوں نے شام کے بعد رات کو بہت دیر جاگ کر اور اول وقت بہت سویرے اٹھکر دفتر جانے سے پہلے تک یہ سب کام کیا.

ایک دوسری مثال نیـل والوں کے ملازموں کے متعلق دینی اچھی ھوگی، یہ بات مشہور تھی کہ ایک نیـل والا بہت بد مزاج اور بد معاش تھا، جو جاتا اس کو گالیاں دیتا اور مار پیٹ بھی کرتا تھا. اس لئے اس کے غصہ کا شکار صرف اس کے کسان ھی نہیں ہوتے بلکہ اس کے بڑے بڑے ماتحت ملازم بھی اس کا شکار ہو جاتے. مہاتما جی کو اسکی کوٹھی پر جانا تھا، اس کے ملازموں کے دل میں یہ ڈر پیدا ھوا کہ یہ بد مزاج آدمی ھے، ایسا نہ ھو کہ مہاتما جی کیساتھ بد سلوکی کر بیٹھے اس لئے جب مہاتما جی اس کے کمرے میں ملنے کیلئے گئے تو اس کے اپنے ملازم ادھر ادھر کوئی برآمدہ اور کوئی کونے میں ڈنڈے وغیرہ لیکر چھپے ہوئے انتظار کرتے رھے کہ اگر اس نے کوئی برا برتاؤ کیا تو اپنی نوکری کی پروا نہ کر کے وھیں اس کو خوب ٹھونکیں گے، لیکن اس کی نوبت کبھی آنیوالی تھی ھی نہیں کیونکہ برا برتاؤ کرنا تو اس نیل والے کے خیال میں کبھی نہیں آیا تھا، اس نے مہاتما جی کی بڑی ھی خاطر داری کی، ہم کو یہ سب باتیں ان ملازمون نے

بعـد میں بتائیں۔

ایک دوسرے نیـل والے کا بھی قصہ ہے، اس نے مہاتما جی کو یہ کہکر بلایا کہ ہم آپ کو سب کاغـذات دکھا کر ثابت کر دینگے کہ ہمارے خلاف جو شکایتیں کی گئیں ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔ مہاتما جی بہت خوش ہوئے اور اسکے یہاں بیٹھکر کاغذات دیکھنے لگے۔ وہ جب کسی اہل کار سے کوئی کاغذ مہاتما جی کو دکھانے کیلئے کہتا تو اس کے سامنے ہی اس کے خلاف جانیوالے کاغذوں کو بھی پیش کر دیتے۔ مہاتما جی اس کے سامنے ہی اس کے کاغذوں کو پڑھتے پڑھتے اسکے مخالف کاغذوں کو بھی جنھیں اسکے اپنی ہی کارندوں نے پیش کردیا تھا، پڑھتے اور ان کے متعلق اس سے پوچھنے لگتے کہ یہ سب باتیں تو آپ کے کاغذوں ہی میں نکل رہی ہیں، اس پر وہ بہت «چڑا» لیکن اس میں مہاتما جی کا تو کوئی قصور تھا ہی نہیں، یہ کچھ بول تو سکتا ہی نہ تھا لیکن بعد میں نہ معلوم اس نے اپنے اہل کار کیساتھ کیا کیا؟ ہم نے سنا ہے کہ اہل کاروں نے یہ کہا کہ «صاحب» نے ان کو پہلے

سے کاغذوں کو چھانٹ کر الگ الگ رکھنے کا حکم تو
دیا نہیں تھا اسلئے انہوں نے سب کاغذ ملے جلے ھی پیش کر
دئے لیکن شاید انہوں نے الگ رکھے ہوئے کاغذوں کو
بھی جان بوجھ کر اکٹھا کر دیا تھا تاکہ پورا بھانڈا پھوٹ
جائے اور اسکی سبھی باتیں جھوٹی ثابت ہو جائیں۔

"ریونیو ممبر" نے رپورٹ پا کر گورنمنٹ کے حکم سے
اسکی نقلیں نیل والوں. سرکاری ملازموں. اور کچھ دوسرے
لوگوں کے پاس بھی بھیج دی تھیں۔ اسکے ساتھ ہی یہ پوچھا
بھی تھا کہ گاندھی جی کی شکایتوں کے متعلق آپ کو کیا
کہنا ھے؟ ادھر ان کے جواب کا انتظار ہو رہا تھا ادھر
گاندھی جی نیل والوں کے یہاں جانے انکی باتیں سنتے اور
مخصوص واقعات کی تحقیقات کرنے یا ہم لوگوں کو تحقیقات
کے لئے بھیجتے، ہم لوگ بیان بھی لکھتے جاتے. کیونکہ
ابھی تک بیان لکھوانے والوں کا تار ٹوٹا نہیں تھا، شاید
کسانوں کے دل میں ایسا خیال بیٹھ گیا تھا کہ جس کا
بیان نہیں لکھا جائیگا اس کی تکلیف دور نہیں ہوگی. ہم
لوگوں کو اب بیانوں کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی ان کو

راضی رکھنے کیلئے اس کے بیاں کا خلاصہ لکھ لیا کرتے.
اس طرح ہمارے پاس کام کافی رهتا.

رپورٹ کے جواب میں سرکاری ملازموں اور نیل والون نے اپنے بیانات گورنمنٹ کو بھیجے. انمیں سے کچھ کی نقلیں ان کے دفتروں کے آدمیوں هی نے لا کر هم کو دیدیں یه دلی خواهش ضرور تهی. که هم ان کے جواب جان لیتے لیکن گاندھی جی کا قاعده جس کا ذکر اوپر آچکا هے سخت تها اس لئے هم نے ناجائز طریقوں سے آئے هوئے کاغذوں سے کوئی فائده نہیں اٹھایا. گاندهی جی کو یه بات سنا دی گئی لیکن اهون نے کہا » که یه گناه بے لذت هے. کیونکه یه کاغذ همارے پاس گورنمنٹ هی بهیج دیگی اور چند دنون کے بعد هم کو دیکھنے کیلئے ضرور ملیں گے لیکن اگر ایسا نه بهی هوا تو بهی اس کو دیکھنا نہیں چاهئے.

پانچواں باب

کسانوں کی بڑی شکایتیں یہ تھیں کہ ان سے زبردستی نیل کی کھیتی کرائی جاتی ھے۔ جس سے ان کا بہت سا نقصان ہوتا ھے۔ اگر کوئی کسان انکار کرتا ھے۔ یا نیل والے کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ کرتا ھے۔ تو اس کے ساتھ بہت سختی اور زیادتی کی جاتی ھے۔ نیل سے بہت سی قسم کے رنگ بن سکتے ھیں۔ اس لئے یہ بہت منافع کی چیز ھے وہ ایک پودے سے بنتا ھے۔ پانی میں کچھ عرصہ تک پودے کی پتی اور ڈنٹھل کو رکھ کر انہیں خوب مسل دینے سے سارا رس پانی میں آجاتا ھے۔ اسوقت پانی کڑھائی میں گرم کرکے سکھا دینے سے رنگ جم جاتا ھے اسکے پودے کھیتوں میں پیدا کرنے کھیتوں سے کاٹ کر پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے حوضوں میں پہنچانے، پیٹنے، چولھے پر چڑھا کر سکھانے وغیرہ کیلئے کافی

مزدور لگتے ہیں. اس کے علاوہ زمین کی ضرورت ہوتی ھے
جسکے لیے انہوں نے یہ بندوبست کیا تھا. کہ پہلے تو وہاں
کے کچھ زمینداروں سے کسانوں کی طرح زمین لے لیتے. پھر
کھیتوں کے بجائے زمیندار سے سارے گاؤں کا ٹھیکہ لے لیا
کرتے. شرط یہ ہوتی کہ زمیندار کو جو منافع لگان کی
شکل میں کسانوں سے ملتا ھے. اسکو وہ خود ھی دیدیا کریں
گے. اور گاؤں کا انتظام بھی خود کیا کریں گے. اسطرح
جو گاؤں میں غیر آباد زمین ہوتی اسپر تو انکا اختیار ہو ھی
جاتا لیکن اس کے ساتھ ھی کسانوں پر بھی ہر طرح کا
اختیار جو کسی زمیندار کا ہوسکتا ھے ان کو مل جاتا زمیندار
ادھر لگان کی تحصیل وصول کے جھگڑوں سے بچ جاتا
اور ادھر مقررہ وقت پر یکمشت رقم بھی مل جاتی. پھر بھی
زمیندار معمولی طور سے گاؤں کا ٹھیکہ نہیں دیتا. کیونکہ
غیر آباد زمین کے آباد کرنے کرانے کے علاوہ اسکو اور بھی
کئی طرح کا منافع گاؤں سے ہوتا. اس لئے گاؤں کا ٹھیکہ
حاصل کرنے کے لئے وہ پولیس اور مجسٹریٹ کی مدد سے
چھوٹے موٹے زمینداروں پر دباؤ ڈلواتے. اگر کسی گاؤں

کے ایک سے زیادہ زمیندار ہوتے اور ان میں سے ایک بھی
کسی وجہ سے اپنے حصہ کا ٹھیکہ دے دیتا. تو دوسرے
حصے داروں پر طرح طرح دباؤ ڈلوا کر مثلاً کچہریونمیں مقدمہ
چلا کر یہانتک کہ بلوہ فساد کرا کر انہیں اتنا تنگ کیا جاتا کہ
وہ بھی اپنے حصے کا ٹھیکہ دیدیتے. یہ سلسلہ سو برس یا
اس سے بھی زیادہ عرصہ سے جاری تھا. اسطرح چاھے
زمیندار کوئی بھی ہو تقریباً سارا ضلع نیل والوں کے قبضہ
میں آچکا تھا. انہوں نے آپسمیں مشورہ کرکے سارے ضلع
کو بانٹ لیا تھا. تقریباً ستر (۷۰) کوٹھیاں کھول کر ایک ایک
کوٹھی کے لئے الگ الگ علاقے قائم کرلئے تھے. بہار
میں سرکاری کام کے لئے ضلع کئی حصہ نمیں بانٹ دیا جاتا
ھے. یہ دستور بہت پرانا ھے جو مغلوں یا یوں کہا جائے
کہ ہندو راجاؤں کے زمانہ سے ھی چلا آرہا ھے. برطانیہ
نے کچھ «ھیر پھیر» کے ساتھ مغلوں کے پرگنوں اور ضلعوں
میں صوبہ کو تقسیم کرکے کام چلایا بعد میں بنگال اور بہار
وغیرہ میں پولس تھانے اور «سب ڈویژن» بھی قائم ہوئے
اس طرح اگر سرکاری دفتر میں دیکھا جائے کہ کس نام

کا گاؤں کہاں ھے تو معلوم ہوگا. کہ یہ پرگنہ (پ) تھانہ (تھ) سب ڈویژن (س) اور ضلع (ض) میں ھے.

چمپارن میں ان چیزوں کے علاوہ یہ بھی مشہور ہوگیا تھا کہ وہ نیل کوٹھی (ن) کے علاقہ میں ھے. زمینداروں سے گاؤں کا ٹھیکہ ملنے میں نیل والوں کو یہ ایک سہولت تھی کہ ایک ضلع میں ایک بڑا بتیا « راج جسکی زمینداری میں ضلع کے تقریباً دوتہائی یا اس سے بھی زیادہ گاؤں ہیں دوسرا « رام نگر » راج ھے جسکی زمینداری میں بھی کافی گاؤں ھیں اور ایک چوتھائی یا اس سے بھی بہت کم گاؤں ایسے ھیں جو دوسرے زمینداروں کے ھیں. اسلئے بتیا راج اور رام نگر راج کو اپنے ھاتھوں میں لینے کے بعد نیل والوں کو تقریباً سارا ھی ضلع مل گیا. پھر دوسرے زمینداروں نے بھی کچھ ڈر کر اور کچھ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے زمینداری کے انتظام کے جھگڑے سے بچنے کیلئے نیل والوں کو اپنے اپنے گاؤں کا ٹھیکہ دیدیا.

جو زمین نیل والوں نے اپنے قبضہ میں کی اس میں وہ خود نیل کی کھیتی کرتے. اپنے ھل اور بیل رکھتے اور

مزدوروں سے کام لیتے اپنی کھیتی کیلئے کچھ تو انھوں نے غیر آباد زمین کو آباد کرکے حاصل کیا. اور کچھ کسانوں کی زمینوں پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کرکے زمین لینے میں چاپلوسی، رقم. دھمکی. تفرقہ اندازی غرضکہ ہر قسم کے طریقہ سے کام لیا. کھیت آباد کرانے کیلئے کسانوں کو پکڑ کر ان سے زبردستی کام لیا جاتا، مزدوری بھی برائے نام دی جاتی، اس زمانہ میں زمین کے مقابلہ میں چمپارن کی آبادی بہت کم تھی. اسلئے وہاں کوئی بیکار نہیں رہتا. سبھی لوگ کھیتوں میں اپنا اپنا کام کیا کرتے. انکا کام چھوڑا کر چاھے اس سے کسی کی کھیتی خراب کیوں نہ ہو؟ نیل کے کھیتونمیں کام کرایا جاتا مزدوروں کو اپنے گھر سے کھا کر کام کرنا پڑتا. صرف اتنا ھی نیل والوں کیلئے کافی نہیں تھا بلکہ انھوں نے ہر کسان کو مجبور کیا کہ اسکے پاس جتنی زمین ہو اسکے ایك چوتھائی یا کم سے کم $\frac{۳}{۲۰}$ حصہ میں اسکو نیل کی کھیتی کرنی ھی پڑیگی. نیل والے کے حکم کے مطابق اسکے کھیتوں میں سے جو کھیت نیل کے لئے منتخب کرلئے جاتے انھیں میں اسکو اپنی محنت ھل بیل اور خرچ سے نیل

کی فصل تیار کرنی پڑتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ فصل تیار ہونے پر اسے کاٹ کر کوٹھی تک لیجانا بھی ضروری تھا۔ ان سب کاموں کے لئیے وہ فی ایکڑ یا فی بیگہ اسکو کچھ دیا کرتے تھے لیکن وہ اتنا کم ہوا کرتا تھا کہ کسان کو جتنا خرچ کرنا پڑتا اتنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح نیل والوں نے ایک قانونی حق حاصل کرلیا تھا۔ کہ وہ کسانوں کو مجبور کر کے ان سے نیل کی کھیتی کرا سکتے ھیں۔ یہ چیز قانون میں لکھ بھی دی گئی تھی۔ کہ جہاں اس طرح مجبور کرکے اپنی مرضی کے مطابق رعایا سے نیل یا دوسری فصل کے پیدا کرنے کا حق انہیں حاصل ھے۔ وھاں وہ چاھیں تو رعایا کو اس پابندی سے آزاد بھی کرسکتے ھیں اور اس کے بدلے میں من مانا معاوضہ لیسکتے ھیں چاھے وہ یکمشت نقد روپیوں کی شکل میں ہو۔ یا اضافہ لگان کی شکل میں جو ان کو سالانہ ملا کرے ان سب باتوں سے کسانوں کو بڑی تکلیف تھی۔ جب کبھی وہ عاجز آکر بلوہ فساد کرتے اسوقت ان کو کچھ دے دیا جاتا، نیل والے جس زمین میں زبردستی نیل کی کھیتی کراتے، اس زمین کا لگان بھی، اسی

کسان کو دینا پڑتا. اس طرح تھوڑا بہت جو کچھ ان کو نیل بونے کے بدلے میں ملتا اسکا بڑا حصہ لگان کے بدلے میں وضع ہوجاتا. ایك بار ان کے بلوہ فساد کا نتیجه یه ہوا. که گورنمنٹ نے نیل کے کھیت کے لگان کو کسانوں سے وصول کرنا بند کردیا. کسی دوسرے بلوہ کا نتیجه یه ہوا که نیل کی کھیتی کے بدلے میں جو کچھ ملتا تھا. اسمیں کچھ آنے بڑھا دیئے گئے لیکن اتنے اضافه سے کسانوں کو اطمینان نہیں ہوا. اس طرح ان کے شور و غل کرنے پر چھوٹی موٹی رعائتیں جو شمار کے قابل نہیں ہیں گورنمنٹ انکو دے دیا کرتی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاتا تھا.

اتفاق ایسا ہوا که جرمن کسی دوسری چیز سے رنگ بنانے لگے اسلئے نیل کی قیمت جس سے سب قسم کے رنگ بنا کرتے تھے اتنی گرگئی که اتنے ظلم سے پیدا کئے نیل میں بھی اب منافع نہیں رہ گیا. اب نیل والوں کو مجبور ہوکر نیل کی ساری کھیتی چھوڑنی پڑتی ان کا سارا سلسله ہی ختم ہو جاتا اور کسانوں کی ساری مصیبتیں خود بخود دور ہو جاتیں. لیکن نیل والے اسکو آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے. انہوں

نے اس قانون کا سہارا لیا جو انکو یہ حق دیتا تھا۔ اگر وہ کسانوں کو نیل کے کھیت میں مزدوری کرنے سے نجات دیدیتے تو اس معافی کے بدلے میں وہ کسانوں سے نقد روپیہ یا لگان میں من مانا اضافہ کر کے معاوضہ لے سکتے تھے۔ جرمن رنگ کی وجہ سے ان کا جو نقصان ہوتا اسے انہوں نے غریب کسانوں کے سر پر ڈال دیا اور ان سے زبردستی بیس پچیس لاکھ روپیہ نقد وصول کرلئے۔ کئی لاکھ روپیوں کا اضافہ لگان میں بھی کردیا۔ اس کے بدلے میں نیل کی کھیتی کے متعلق معافی نامہ لکھکر دیدیا۔ کوئی کسان نقد رقم دیکر یا لگان میں اضافہ کراکر معافی نامہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نیل کے کام میں اب منافع نہ رہنے کی وجہ سے نیل والے خود اس کام کو چھوڑنے والے ہیں۔ لیکن یہ نقد رقم اور اضافہ کی دستاویزیں ان سے زبردستی لی گئیں۔ گورنمنٹ نے نیل والوں کی مدد کے خیال سے ہر ایک کوٹھی میں دستاویزیں رجسٹری کرنے کیلئے خاص رجسٹرار مقرر کردئے۔ جو نقد یا «شرح بیشی» دینے سے انکار کرتا وہ پیٹا جاتا اس کے گھر اور کھیت لوٹ لئے جاتے اس پر جھوٹے مقدمے

چلائے جاتے. اسکو کنوؤں سے پانی لینے کی ممانعت کردی جاتی اس کے دروازہ پر اچھوتوں کا اس طرح پہرہ بٹھا دیا جاتا کہ کوئی اندر سے باہر نہ نکل سکے. اس کے کھیتوں میں چرنے کے لئے بڑی تعداد میں مویشی ھانک دئے جاتے اس کے گھر کے چاروں طرف جو تھوڑی بہت زمیں ھوتی اسکو زبردستی جوت کر اسمیں کچھ نہ کچھ بو دیا جاتا تاکہ اس سے معلوم ھو کہ خود کسان یا اسکے مویشیوں کی وجہ سے فصل کو نقصان پہنچا ھے. اسکے مویشی پکڑا کر مویشی خانہ میں بند کردئے جاتے. جہاں سے کافی پیسے دیکر وہ انکو چھڑا سکتا. اسپر جرمانہ کیا جاتا. اور بھی کئی قسم کی اس پر اتنی سختی کی جاتی کہ مجبور ھوکر اسکو «شرح بیشی» مان لینی پڑتی یا نقد «تاوان» دینا پڑتا اسطرح زبردستی کسانوں کو بیس پچیس لاکھ روپیہ نقد دیکر اور لگان میں کئی لاکھ کا اضافہ قبول کر کے نیل کی کھیتی سے معافی لینی پڑتی. لیکن جوں ھی یہ کام پورا ھوا کہ ادھر جرمنی کے ساتھ ۱۹۱۴-۱۸ والی لڑائی شروع ھوگئی. لہذا جرمن رنگ بند ھوجانے کی وجہ سے نل کی مانگ پھر بڑھ گئی نیل کی

کھیتی میں پھر منافع نظر آنے لگا نیل والوں نے معافی ناموں کے باوجود پھر زبردستی نیل کی کھیتی کرانی شروع کردی. جہاں نیل کی کھیتی نہیں ہوسکتی تھی ان گاؤں کے کسانوں سے بھی انہوں نے روپیہ وصول کرنے کا دوسرا طریقہ نکالا. کیونکہ وہاں نیل کی کھیتی میں معافی دینے کا کچھ معاملہ ھی نہیں تھا پھر بھی وہاں کے کسان نہیں بچے اور ان سے بھی کافی روپیہ وصول کئے گئے.

ایک اسی ھی نیل والے نے جس کی نیل کی کھیتی بہت کم تھی اور جس نے دوسرے طریقوں سے رقم وصول کی تھی. گاندھی جی سے کہا کہ اس کے کسانوں کو کسی قسم کی شکایت اور تکلیف نہیں ھے. اگر گاندھی جی اسکے علاقہ میں چلیں تو کسان خود آکر سب باتیں کہدیں. گاندھی جی نے دعوت قبول کرلی اور اسکے لئے ایک تاریخ مقرر کردی اسکے خلاف بھی سیکڑوں کسانونکے بیان ہم لوگونکے پاس تھے. اور ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ کسانوں کو کیا شکائتیں تھیں گاندھی جی نے وہاں جانے سے پہلے سب باتیں معلوم کرلیں جہاں جانا تھا وہ جگہ «بتیا» سے چھ یا سات میل دور تھی

گاندھی جی ایسی جگہوں پر اکثر پیدل ہی چلے جایا کرتے تھے
سویرے بہت جلد اٹھکر وھاں کے لئے روانہ ہوگئے. میں بھی
ان کے ساتھ تھا راستہ میں کچھ کسانوں آئے اور کہنے
لگے کہ آج وہ لوگ بڑی مشکل میں پڑ گئے. اور ان کے اوپر
بڑا ظلم ہورہا ھے دریافت کرنے پر انہوں نے یہ کہا کہ
« صاحب » نے کچھ کسانوں کو سکھا پڑھا کر تیار کیا ھے.
وہ لوگ گاندھی جی سے کہیں گے کہ ہم لوگ بہت آرام سے
ھیں اور ہمارے « صاحب » بہت اچھے آدمی ھیں وغیرہ وغیرہ
گاندھی جی نے کہا « کیا ایسا نہیں ھے کیا یہ سب جھوٹ ھے »
لوگوں نے بہت زور دیکر کہا یہ بالکل جھوٹ ھے. اسوقت
گاندھی جی نے کہا « جو کچھ تم لوگوں کو کہنا ہو وہ « صاحب »
کے سامنے ھی کہنا اور سب سچی باتیں بتادینا » اسپر وہ بہت
خوش ہوئے. جب ہم لوگ وھاں پہنچے تو کسانوں کی
ایک چھوٹی موٹی جماعت وھاں جمع ہوگئی. کچھ دیر کے بعد
« صاحب » بھی آگیا. بتیا کے مجسٹریٹ بھی آگئے. اسوقت
تک وھاں تقریباً تین چار سو کسان جمع ہوگئے تھے. آھستہ
آھستہ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی ھی گئی.

« صاحب » نے کہا کہ ہمارے کسانوں کو کوئی تکلیف نہیں هے ۔ یہاں یہ لوگ آئے ہوئے ہیں آپ خود انسے سن لیجئے یہ کہکر اس نے ایک آدمی کا نام لیکر اسکو پکارا اور کہا کہ تم کو جو کچھ کہنا ہو گاندھی جی سے کہو پھر گاندھی جی سے بھی کہا کہ اس علاقہ میں یہ بہت عزت دار آدمی هے جسکی سب هی لوگ عزت کرتے هیں ۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا اس نے جوں هی یہ کہنا شروع کیا کہ « صاحب » کی وجہ سے هم لوگوں کو هر طرح کا سکھ هے کہ دوسرے سب لوگ بول اٹھے کہ یہ جھوٹ بول رها هے سب کے سب اس سے کہنے لگے ۔ کہ بوڑھے ہوئے ہو مرنے کا وقت نزدیک هے کیوں یہ پاپ اپنے سر لے رهے هو وغیرہ وغیرہ « صاحب » یہ حال دیکھکر کچھ گھبرایا کیونکہ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ اس مجمع میں اس کی تعریف کرنے والے آئیں گے کسی شکایت کرنے والے کی آنے اور اسکے سامنے هی شکایت کرنے کی همت نہیں پڑیگی ۔ گاندھی جی نے لوگوں کو منع کرتے ہوئے کہا کہ سب کی بات سنیں گے ۔ بوڑھے کو کہنے دینا چاهئے ۔ جب شکایت کرنے والوں کی باری آئیگی اسوقت

وہ بھی اپنی کہیں گے. اسپر لوگوں نے بوڑھے کو کہنے دیا اس نے اور اسکے بعد دوچار اور کسانوں نے اسی طرح سے بیان کیا جب انکا کہنا ختم ہوگیا اسوقت دوسروں کو کہنے کا موقع ملا انہوں نے بھی اپنا بیان شروع کیا ان کی شکایت یہ تھی کہ «صاحب» نے غیر قانونی طریقہ سے لگان میں زبردستی اضافہ کرلیا ھے اس کے لئے انہوں نے ہم لوگوں کے سر زبردستی اتنی زمین تھوپ دی ھے اسپر جتنا وہ اضافہ کرنا چاھتے تھے من مانا لگان لگا دیا ھے. کہیں کہیں تو زمین بھی نہیں ھے پھر بھی ایک فرضی زمین کے نام پر لگان قائم کردیا ھے. اس پر «صاحب» بول اٹھا کہ یہ تو بالکل غلط باتیں کہہ رھے ھیں. میرے پاس کلکتہ کے بڑے بڑے وکیلوں کی رائے موجود ھے اور ان کی رائے لیکر ھی ہم نے یہ سب کچھ کیا ھے. اس نے یہ بھی کہا کہ جو زمین ہم خود آباد کرتے تھے اور کافی رقم پیدا کرتے تھے ان لوگوں کے بہت زیادہ کہنے پر ہم نے اسی زمین کو اپنی مہربانی سے انہیں دیدیا. اسپر کسان چیخ اٹھے اور انہوں کہا کہ ہمیں وہ زمین نہیں چاھئے. آپ اضافہ چھوڑ دیجئے

اور اپنی زمین لے لیجئے . اسوقت گاندھی جی نے اس سے کہا
کہ ، آپ کو اسمیں کیا عذر ہوسکتا ہے . اس نے کہا کہ
ہم ایسا نہیں کرسکتے . آخر ہمکو بھی تو کسی طرح گزر کرنا
ہی ہے گاندھی جی نے کہا کہ ، آپ جب خود کہتے ہیں
کہ جتنا آپ کو ان سے ملتا ہے . اس سے زیادہ آپ خود
پیدا کرسکتے ہیں تو اچھا ہے آپ دونوں خوش رہیں گے
آپ زیادہ پیدا کرلیں گے اور انکی شکایت دور ہوجائیگی
لیکن وہ اسپر راضی نہ ہوا ادھر کسان شور کرتے رہے
کہ ہم لوگ زمین نہیں رکھیں گے ہمارا اضافہ چھڑا دیا جائے .

یہ شاید پہلا ہی موقع ہوگا . جبکہ چمپارن کے کسان کسی
صاحب کے سامنے دو بدو اسکی شکایت اور اسکی بات ماننے
سے انکار کریں ان میں سے ایک بوڑھا اس مجمع سے باہر
نکل کر مجسٹریٹ کی شکایت کرنے لگا اور اس نے کہا کہ
یہاں ہم غریبوں کی کوئی نہیں سنتا یہ مجسٹریٹ بیٹھے ہیں
یہ بھی انصاف نہیں کرتے . ٹوپی ٹوپی سب ایک ہے . ابھی
تھوڑے دن گزرے ہیں کہ صاحب نے ہمارا گھر لٹوا لیا
تھا ہمارے چھپر پر جو کدو کی بیل لگی تھی وہ اجاڑ دی گئی .

کھیت چروا دئے گئے اور کیلے کے گچھے گروا دئے گئے. یہ سب کچھ ابھی آپ چل کر دیکھ سکتے ھیں. جب ھم مجسٹریٹ کے پاس نالش کرنے گئے تو یہی مجسٹریٹ صاحب بید لیکر ھمکو ھی مارنے پر اتر آئے. مجسٹریٹ کا چہرہ لال ھوگیا اسنے کہا یہ سب جھوٹ کہتا ھے اس بوڑھے برھمن نے الٹا جواب دیا کہ ھم جھوٹ نہیں کہتے آپ جھوٹ کہہ رھے ھیں. مجسٹریٹ اور تو کچھ نہیں کہہ سکا غصہ سے دانت پیستا ھوا فوراً موٹر پر سوار ھوکر چلا گیا. ادھر مہاتما جی نے ھم لوگوں سے کہا کہ ان کسانوں میں سے جو لوگ زمین نہیں رکھنا چاھتے ان کے نام لکھ لو جلسہ تو گویا ختم ھوچکا تھا. صاحب چلا گیا ھم لوگوں نے سوچا کہ کسانوں سے باضابطہ زمین کا استعفاء لکھوا کر دستخط کرائے جائیں. وہ سب اس کیلئے تیار آئے تھے. ھم لوگ شام تک اسطرح دستخط کراتے رھے. اس کا قانونی نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ صاحب کی جو آمدنی اضافہ سے ھوتی تھی. وہ یکبارگی رک جاتی. ھم لوگوں نے ان سب دستخطی استعفوں کو دوسرے ھی روز دبتیاء پہنچکر صاحب کے پاس بھیجدیا. جو کسان وھاں نہیں آئے تھے

وہ «بتیا» آکر استعفاء لکھکر دے گئے جب یہ سب استعفے پہنچ گئے. تو اس کے بعد اسکی کئی ہزار روپیے سالانہ کی آمدنی بند ہوگئی. مجسٹریٹ نے ایک لمبی رپوٹ گورنمنٹ کو لکھکر بھیجدی. جسکا خلاصہ یہ تھا کہ کسانوں میں اتنی بے لگامی پیدا ہوگئی ھے کہ وہ اب صرف «نیل والوں» کو ھی نہیں بلکہ سرکاری افسروں کو بھی کچھ نہیں سمجھتے ھیں. انہوں نے سمجھ لیا ھے کہ انگریزی راج اٹھ گیا ھے. گاندھی جی کے پاس گورنمنٹ کے خلاف بھی نالش کی جاسکتی ھے اور مجسٹریٹ کو بھی ھدایات کرسکتے ھیں اسطرح کی سبھی باتیں دوسرے واقعات خصوصاً اس دن کے واقعہ کی بنیاد پر لکھیں اور گورنمنٹ سے کاروائی کرنیکی سفارش کی. اسکا یہ طریقہ تھا کہ گورنمنٹ کو جب وہ کچھ لکھتا تھا. جسمیں گاندھی جی کے متعلق کوئی بات ہوتی تھی تو اسکو گاندھی جی کے پاس بھی بھیجدیا کرتا تھا تاکہ اس کے جواب میں اگر انکو کچھ کہنا ہو تو وہ لکھ بھیجیں. اور وہ اس جواب کو بھی اپنی رپوٹ کیساتھ گورنمنٹ کے پاس بھیجدے اس مرتبہ بھی اس نے ایسا ھی کیا. لیکن جو تحریر اس نے بھیجی اسمیں

کچھ ایسی باتیں تھیں جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ سمجھتا تھا
کہ اس قسم کی رپوٹیں صرف گاندھی جی ھی پڑھتے ھیں ھم
لوگوں میں سے ان کو کوئی نہیں دیکھتا ھے. کیونکہ «راز»
لکھا ہوا ھوتا تھا لیکن جو کچھ بھی چمپارن کے متعلق گاندھی
جی کے پاس گورنمنٹ یا اور کہیں سے آتا تھا اسکو وہ ھم
لوگوں کو بھی دکھادیا کرتے ایسا ھی انہوں نے اس موقعہ پر
بھی کیا اس تحریر کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اسکا یہ
غلط خیال ھے کہ جو کچھ ان کے پاس راز میں بھیجتا ھے اسکو
صرف وھی دیکھتے ھیں اور اس کو ان کے ساتھی نہیں دیکھتے
ھیں انہوں نے صاف کہا کہ پبلک کاموںمیں انہوں نے راز کا
یہ کبھی مطلب نہیں لیا ھے. کہ جن لوگوں کے ساتھ مل کر وہ
کام کر رھے ھیں ان سے بھی وہ چیز راز میں رکھی جائے
اسلئے اسطرح کے جتنے کاغذ ابتک آئے ھیں انہوں نے برابر انکو
دکھائے ھیں. اور آئندہ بھی ایسا کریں گے اگر وہ چاھتا ھے
کہ میں ھی کسی چیز کو دیکھوں اور اپنے ساتھیوں کو اسے
نہ دکھاؤں تو ایسی چیز نہ بھیجا کرے.

ھم لوگوں کو یہ بات کچھ کھٹکی. ھم سمجھتے تھے کہ

اسطرح ھی سرکاری باتیں ھمیں معلوم ھوجایا کرتی تھیں لیکن ابتو معلوم نہیں ھوا کرینگی کیونکہ اب وہ کوئی کاغذ نہیں بھیجا کریگا اگر صرف گاندھی جی کو ھی سب باتیں معلوم رھا کرتیں تو اس سے کوئی ھرج نہیں تھا ھملوگوں کو بغیر بتائے ھوئے بھی جو مناسب سمجھیں گے کاروائی کرسکیں گے لیکن انہوں نے اپنا خط بھیجنا ضروری بتایا اور کہا کہ پہلے تو جو اسکے دلمیں غلط فہمی ھے اسکو دور کردینا ضروری ھے اس کے علاوہ بغیر ھملوگوں کی رائے کے وہ کوئی کام کرھی کیسے سکتے ھیں؟ اگر ھملوگ سب باتیں نہ جانیں گے تو پھر رائے کیسے دے سکیں گے ھم نے سمجھ لیا کہ وہ کتنی گہرائی اور باریکی سے سب باتوں کو دیکھتے ھیں. اسکو یہ نہیں معلوم تھا کہ ھملوگ سارے کاغذات دیکھتے ھیں اور اسی بھروسہ پر وہ سب طرح کے کاغذات بھیجا کرتا تھا گاندھی جی نے سمجھا کہ اگر وہ اس غلط فہمی کو دور نہیں کرینگے تو ایک قسم کا اسکو دھوکا دینا ھوگا اور اپنا جھوٹا عمل ھوگا. دوسرے اگر اسکی بات بھی مان لیں اور وہ آئندہ کاغذ ھمکو نہ دکھائیں تو بھی کسی نہ کسی طرح

بات چیت میں یا ان کی کسی کاروائی سے ہی ہملوگوں کو وہ راز کی بات معلوم ہوئے بغیر نہیں رہیگی۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ بھی غلط کردار ہوگا۔ اسلئے انہوں نے اسطرح کی باتوں کو خود بھی نہ جاننا مناسب سمجھا۔ اسکا نتیجہ کچھ برا نہیں ہوا کیونکہ اسکے بعد بھی پہلے کی طرح راز کے کاغذ آتے رہے اسکا مطلب صرف اتنا ہی سمجھا گیا۔ کہ گاندھی جی سب لوگوں کو وہ کاغذات نہیں دکھائیں گے۔ اور اخباروں کو بھی وہ نہیں جانے پائیں گے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کیلئے مل جاتا تھا۔

ادھر تو مجسٹریٹ نے گورنمنٹ کے پاس رپوٹ بھیجی ادھر ایک نیل والے نے ایک جال پھیلایا۔ اسکی دو کوٹھیاں تھیں جنکے درمیان چار پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ ایک میں وہ خود رہتا اور دوسری جگہ جو کچھ چھوٹی تھی۔ وہاں جاکر وہ کچھری کیا کرتا تھا۔ اور اسکے آس پاس کے گاؤں کا کچھ کام بھی۔ مندرجہ ذیل واقعہ اسی شاخ کے علاقہ میں ہوا تھا۔ اس نے رات کو اسمیں آگ لگوا دینے کا ارادہ کیا۔ پرانے طریقے کے مطابق پولیس اور مجسٹریٹ کی مدد سے لوٹ گھسوٹ مچا کر

وهاں کے کسانوں کو جیل بھجوانے کا بھی ارادہ کیا. اسلئے اس نے وهاں کے اپنے ایك اهلکار کے ذمه آگ لگانے کا کام سونپا. ایك نوکر کو هدایت بھی دی. که آگ لگتے هی اس کے پاس آکر رات کو هی خبر دے. خود اپنی کوٹھی میں جو چار پانچ میل کے فاصله پر تھی رات کو انتظار کرتا رها. که آگ لگنے کی خبر ملتے هی وه مجسٹریٹ کے پاس پہنچیگا وهاں سے پولیس کی مدد لیکر گاؤں میں لوٹ مچادیگا. ان کو هی کسانوں نے دیکھا که اس کچہری میں کچھ عجیب کارروائی هورهی هے. اسکے کمرے کی سب چیزیں نکال کر کسی دوسری جگه هٹائی جارهی هیں. کاغذات بھی هٹائے جارهے هیں یہانتك که شیشے کے دروازے بھی نکالے جارهے هیں. وه لوگ آگ لگانے کے طریقه کو جانتے تھے. اسلئے ان کے دل میں یه شك هوا که آج کچھ نه کچھ رات کو هونے والا هے چنانچه رات کو ایسا هی هوا کچہری کا کچھ حصه جل گیا آگ بجھا دی گئی کچھ پرانے ردی کاغذ بھی وهاں جلادئے گئے یه هوتے هی راتوں رات وهاں کے کچھ کسان «بتیا» پہنچگئے کچھ رات باقی تھی که انہوں نے آکر سب باتیں بتادیں اسی وقت گاندھی جی

نے ہم میں سے ایک آدمی کو وہاں جا کر سب چیزوں کا اچھی طرح معائنہ کرنے اور جو کچھ وہاں ہوا اسکا پتہ لگانے کیلئے ادھر بھیجدیا «صاحب» نے جس آدمی کو اپنے پاس خبر دینے کیلئے تعنیات کیا تھا. وہ رات کو «صاحب» کے پاس گیا ھی نہیں. کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ خبر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گاؤں رات ھی رات لوٹ لیا جائیگا اور بہت سے بے قصور لوگ گرفتار ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ مارے جائیں گے سویرا ہوجانے پر وہ «صاحب» کے پاس ایک پرزہ لیکر جو آگ لگانے والوں نے دیا تھا پہنچا اور اپنے صاحب کو دیا اسپر «صاحب» بہت ناراض ہوا. اور پوچھنے لگا کہ «رات کو کیوں نہیں لایا» اس نے یہ بہانہ پیش کردیا کہ وہ تو ٹھیک وقت پر آ گیا تھا لیکن صاحب کے کتوں نے اسے اندر نہیں گھسنے دیا اسلئے وہ ڈر کے مارے باہر ھی بیٹھا رہا.

اس طرح اسکی چال تو ایک طریقہ سے ناکام ہوئی. لیکن پھر بھی وہ پولیس اور مجسٹریٹ کے پاس گیا. جب وہ پولیس وغیرہ لیکر وہاں پر پہونچے. اس وقت تک ہمارے آدمی نے وہاں پہنچکر سب چیزیں دیکھ لیں. اور گاندھی جی

کو رپورٹ کردی سب سے زیادہ مذاق کی بات یہ تھی۔ کہ اس نے یہ سوچکر کہ اس آگ لگنے سے کم سے کم نقصان ہو نہ صرف مکان میں رکھے ہوئے سامان کو ھی ہٹوا دیا تھا بلکہ شیشے کے دروازے بھی نکال لئے تھے۔ کیونکہ لڑائی کی وجہ سے ان دنوں شیشہ بہت مہنگا بکتا تھا۔ ہمارے آدمی کو کواڑوں کے قبضے کھول کر نکال لے جانیکے دو ناقابل تردید ثبوت مل گئے۔ غلطی سے کچھ پیچ وہاں پڑے رہ گئے تھے ان کو وہ اٹھا لائے چوکھٹ میں جہاں جہاں قبضے لگے ہوتے تھے وہاں کے قبضے ہٹا دینے سے سادی لکڑی دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ جس رنگ سے چوکھٹ اور کواڑ رنگے گئے تھے وہ قبضوں کے نیچے نہیں پہونچا تھا۔ رپورٹ پاکر گاندھی جی نے فوراً ایک خط مجسٹریٹ کو لکھ بھیجا اور رپورٹ کی نقل بھی بھیج دی انہوں نے صاف لکھ دیا کہ کسان اکثر کہا کرتے تھے کہ کوٹھی والے انکو پھسانے اور ان پر ظلم کرنے کیلئے خود اپنی کوٹھیوں میں آگ لگوا دیا کرتے تھے۔ مگر اسپر وہ یقین نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ اس واقعہ سے اب ان کے دل میں کوئی شک نہیں رہ گیا۔ اب

نیل والوں کو پرانا طریقه چھوڑنا پڑیگا اس خط کے بعد پولیس یا مجسٹریٹ کچھ بھی نه کر سکے اور کسانوں کا بھی کچھ نه بگڑا.

ظاہر میں تو وہ کچھ نه بول سکے. لیکن اندرونی طور پر گورنمنٹ سے انکی مراسلت جاری تھی. اس کے چند دنوں کے بعد رانچی سے ایك خط آیا اسمیں لکھا تھا که گاندھی جی کے چمپارن میں آنے سے کسانوں میں بہت هلچل هے. اسلئے انکا یہاں رهنا گورنمنٹ کے نزدیك مناسب نہیں هے. اور یه ضروری بھی نہیں هے. کیونکه انہوں نے اپنی جانچ پوری کرلی هے. اور اپنی رپورٹ بھی گورنمنٹ کے پاس بھجدی هے. گورنمنٹ بھی اسپر غور کررهی هے گاندھی جی کو چمپارن سے هٹانے کے متعلق کوئی کارروائی کرنے سے پہلے «لفٹنٹ گورنر» چاهتے هیں که گاندھی جی ان سے مل لیں. اسطرح گاندھی جی رانچی بلا لئیے گئے. مراسله وصول هوتے هی هملوگ سمجھ گئے که گاندھی جی اب یہاں نہیں ره سکیں گے. ممکن هے که وه رانچی هی میں روك لئے جائیں. یا اگر لوٹیں بھی تو چمپارن میں نه رهنے دیا جائے. اسلئے آج پھر وهی حالت پیدا هوگئی.

جو چمپارن میں پہنچتے وقت تھی. اتنے دنوں تك ان کے ساتھ رہ کر ان کے کام کا طریقہ دیکھ کر اور ان سے دکھنی افریقہ کی باتیں سنکر ان کے کام کا طریقہ سمجھ لیا تھا. اب ہملوگ بھی تیار ہوگئے تھے کہ جو چاھے وہ ہو لیکن اس کام کو اب چھوڑنا نہیں ھے. گاندھی جی نے کہا کہ ھمارے ھاتھ میں اب اتنے ثبوت آگئے ھیں. کہ گورنمنٹ کو مجبور ہوکر کسانوں کی تکلیفوں کو دور کرنا ھی ھوگا. اسلئے اگر ھم سب کے سب جیل چلے جائیں تو بھی گورنمنٹ کو ھملوگوں سے ھی باتیں کرنی ھونگی.

میں اوپر کہہ چکا ھوں کہ ھملوگوں نے جتنے بیان لئے تھے ان سب کی ٹائپ کی ھوئی کئی نقلیں تیار تھیں. ان میں سے کچھ تو موتی ھاری اور « بیتیا » میں رکھ لی گئیں اور کچھ ھم نے دوسری جگہ محفوظ کردیں. تاکہ اگر ھمارے پاس کی نقلیں برباد بھی ھوجائیں. تو بھی ھمکو وہ مل جائیں. گاندھی جی نے کہا کہ اسوقت اتنی فکر کی ضرورت نہیں ھے. اب ھملوگوں کی دو ٹولیاں بنادی گئیں. ایك موتی ھاری میں رھنے لگی اور دوسری « بیتیا » میں میں بیتیا میں رھا بابو برجکشور. گاندھی جی

کے ساتھ گئے۔ ان سے یہ طے ہوا تھا۔ کہ گاندھی جی کی لفٹنٹ گورنر سے ملاقات ہوتے ہی ہملوگوں کو وہ فوراً ضروری تار کے ذریعہ سے اطلاع دے دیں۔ ملاقات کا وقت دس یا گیارہ بجے دن کا تھا اسلئے ہملوگ سمجھتے تھے کہ لفٹنٹ گورنر سے باتیں شاید ایک گھنٹہ تک ہوں۔ اسلئے اگر ایک بجے بھی وہاں سے تار دیدیا جائیگا تو یہاں تین چار بجے تک ہملوگوں کو مل جائیگا۔

ہملوگ اپنی مقررہ جگہوں پر ٹھہرے رہے مقامی سرکاری ملازمین کا بھی رخ کچھ بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا ان کو شاید کچھ پتہ چل گیا تھا کہ گاندھی جی اور ان کے ساتھی وہاں سے ہٹا دئے جائیں گے۔ گاندھی جی اکیلے ہی لفٹنٹ گورنر سے ملنے گئے جہاں یہ دونوں آدمی ٹھہرے تھے۔ وہاں بابو برجکشور انکی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ باتیں کچھ اتنی لمبی چلیں کہ گاندھی جی چار بجے تک بھی واپس نہ ہوئے۔ تو بابو برجکشور کے دلمیں شک ہونے لگا کہ کہیں گاندھی جی بالا ہی بالا کسی دوسری جگہ پہنچا تو نہیں دئے گئے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے سڑک کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے

تھے کہ گاندھی جی آئیں یا کوئی خبر دینے والا آئے۔ بہر حال گاندھی جی پانچ بجے لوٹے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ابھی باتیں پوری نہیں ہوئی ہیں۔ اسلئے کل پھر ہونگیں۔ اسی مطلب کا ایک تار فوراً وہاں سے انہوں نے بھیجدیا۔ لیکن وہ تار اسی دن ہملوگوں کو نہیں ملا بلکہ دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب ملا۔ ہملوگ اپنی اپنی جگہ پر تار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے بہر حال کوئی خبر دوسرے دن نو بجے کے پہلے نہیں ملی۔ اسوقت ہم لوگوں نے سوچا کہ "[۱] دیر آید درست آید" کہاوت کے مطابق کچھ اچھا ہی نتیجہ نکلے گا اسطرح گاندھی جی وہاں ایک دن کے بدلے میں چار دن تک ٹھہرے۔ اور صرف "لفٹنٹ گورنر" ہی سے نہیں بلکہ دوسرے افسروں سے بھی ملتے رہے۔ جب لفٹنٹ گورنر کے دل پر کافی اثر جم گیا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس وقت اس نے گاندھی جی سے کہا کہ ہماری اگزیکٹو کونسل کے دوسرے ممبروں سے بھی مل کر انکو بھی سب باتیں سمجھادیں۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ

---

۱ یہ اس ہندی کہاوت کا، दुत त्रिलमबी कारजसिद्ध : جو اس کتاب میں ہے صحیح اور با محاورہ ترجمہ ہے

گورنمنٹ ایک کمیشن مقرر کریگی. اس کمیشن کو کسانوں کی شکایتوں کے متعلق جانچ کرکے رپورٹ کرنی ہوگی کہ جو جائز شکایت ھو وہ کس طرح دور کی جائے.

"سر ایدورڈ گیٹ" کی خواہش تھی. کہ گاندھی جی بھی اس کمیشن کے ممبر ھوں. اور سرکاری افسروں کے علاوہ نیل والوں اور زمینداروں کے نمائندے بھی ھوں. سرکاری افسروں نے سول سروس کے ایسے آدمیوں کو چن کر دیا. جنکا اس میں رهنا انکی مخصوص واقفیت اور ان کی قانون دانی کیوجہ سے ضروری سمجھا گیا تھا. کسانوں کا نمائندہ گاندھی جی کے سوا کوئی نہ تھا. گاندھی جی نے کہا میں تو کمیشن کے سامنے کسانوں کی طرف سے ثبوت وغیرہ پیش کرنا چاھتا ھوں. اسلئے ممبر ھوکر میں ایسا نہیں کرسکونگا. اسپر اس نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ کے علم میں آگیا ھے اور جو ثبوت آپ کے پاس ھوں، وہ سب آپ کمیشن کے سامنے ضرور رکھ سکیں گے. ساتھ ھی اس نے یہ بھی کہا کہ بہت برسوں سے جو شکایتیں چلی آرھی ھیں ان کے متعلق سرکاری ملازموں نے وقتاً فوقتاً کیا کیا ھے. اور کیا رپورٹ بھیجی ھے. وہ سب چیزیں

گورنمنٹ کے پاس موجود ہیں۔ لیکن وہ سب «راز» میں ہیں۔ وہ سب چیزیں کمیشن کے سامنے تو رکھی جائیں گی۔ لیکن کسی دوسرے کو دیکھنے کیلئے نہیں مل سکتی ہیں۔ اگر آپ ممبر ہو جائیں۔ تو آپ بھی وہ سب دیکھ اور سمجھ سکیں گے کہ جو شکایت آپ کر رہے ہیں انکی توثیق کسی حد تک سرکاری کاغذوں سے ہو جاتی ہے۔ آخر میں طے ہوا کہ گاندھی جی بھی اسکے ممبر ہونگے۔ وہاں سے گاندھی جی کے روانہ ہونے سے پہلے یہ بات بھی طے ہو گئی کہ جو کچھ بھی وہاں طے پا گیا ہے وہ ابھی «راز» میں رکھا جائیگا۔ اور اسکی اشاعت سب سے پہلے سرکاری اعلامیہ کے ذریعہ ہوگی۔ اسلئے گاندھی جی نے اس چیز کو کسی اخبار والے یا باہر کے آدمی کو جاننے نہیں دیا۔

دوسرے دن جب گاندھی جی پٹنہ پہونچے۔ تو اخباروں کو دیکھکر انہیں تعجب ہوا۔ کہ کمیشن کے تقرر کے متعلق کچھ ادھوری سی خبریں ان میں چھپ گئی ہیں۔ گاندھی جی نے ان کو دیکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گورنمنٹ کو اسکی اطلاع دیدی۔ کہ ان کو اخباروں میں یہ پڑھکر بہت تعجب

ہوا کیونکہ انکی طرف سے یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کی گئی سرکاری اعلامیہ نکلنے میں دو تین دن کی دیر اسوجہ سے ہوئی کہ کمیشن کے ممبروں کی باضابطہ رضامندی مل جانے پر سرکار اعلان کر سکتی تھی. گورنمنٹ کی طرف سے گاندھی جی پر کوئی شک نہیں ہوا. کیونکہ سرکاری دفتر سے راز کی باتیں نکل جایا کرتی تھیں. یا جان بوجھکر پبلک کا اندازہ لینے کے لئے نکلوادی جاتی تھی. ہم کو نہیں معلوم کہ یہ چیز کس ذریعہ سے اخبار والوں کو ملی تھی.

گاندھی جی «بتیا» پہنچ گئے. جس وقت وہ پہنچے. اسی وقت وہ اخبار بھی آئے جن میں یہ خبر چھپی تھی. گاندھی جی نے پہنچتے ہی ہملوگوں کو جتا دیا کہ خبر بے قاعدہ چھپی ھے. اور جب تک یہ سرکاری اعلامیہ میں نہ نکلے. اس وقت تک ہملوگوں کی طرف سے اس طرح کی باتیں کسی سے نہ کہی جائیں. جب وہ مجسٹریٹ سے ملے تو اسکو بہت تعجب ہوا. کیونکہ وہ سمجھے ہوئے تھا. کہ اب گاندھی جی ضلع میں رہنے نہیں پائیں گے. لیکن ایسا نہیں ہوا. وہ صرف لوٹے ھی نہیں بلکہ اپنے ساتھ ایک کمیشن بھی لیتے آئے اور اس کمیشن

کے وہ خود ممبر ہوکر آئے. دو تین دن کے بعد جب سرکاری اعلامیہ چھپا. تو کسانوں کو بڑی خوشی ہوئی مخالف لوگ کچھ گھبرائے کمیشن اپنا کام تقریباً ایک یا ڈیڑھ مہینہ کے بعد شروع کرنیوالا تھا اس عرصہ میں ہملوگوں کو کچھ ثبوت جمع کرنا یا اظہار لینا نہیں تھا. جو کچھ ہمارے پاس آ گیا تھا اسی کو اسطریقہ سے سلسلہ وار تیار کرنا تھا. کہ وہ کمیشن کے سامنے پیش کیا جاسکے گاندھی جی نے ہملوگوں کو ہدایت کی. کہ اپنی وکالتی عقل کو الگ کر کے کاغذوں کے ڈھیر میں سے سب سے زبردست ثبوتوں کو چنکر نکال لو اور کسانوں کے جو بیان لکھے گئے ہیں ان میں سے بھی کچھ کو چن کر کچھ ہوشیار کسانوں کو اظہار دینے کیلئے ٹھیک کرلو. چند دنوں کے اندر وہ سب راز کے کاغذات چھپے چھپائے گورنمنٹ کی طرف سے آ گئے. گاندھی جی اور ہملوگوں نے بھی وہ پورے غور سے پڑھ لئے. ان کو پڑھ لینے کے بعد گاندھی جی نے کہدیا کہ اب ہملوگوں کو کوئی خاص ثبوت دینے کی ضرورت نہیں پڑیگی. کیونکہ گورنمنٹ کے افسروں نے بھی وقتاً فوقتاً سبھی باتیں مان لی ہیں. اس لئے ان افسروں کی رپوٹوں پر ہی کمیشن اپنی رپورٹ تیار کرسکتا ہے.

اس درمیانی وقت میں ہم لوگ اسی کام میں لگ گئے۔ ہر ایک مسئلہ پر اپنے نوٹ بھی تیار کرتے رہے۔ جو ضرورت پڑنے پر کمیشن کے سامنے پیش کئے جاسکیں :—

چھٹا باب

گاندھی جی کے رانچی سے "بتیا" آنے پر شری کستوربا گاندھی، دیو داس گاندھی اور پربھو داس گاندھی آ گئے. اور یہ سب انکے ساتھ ھی رھنے لگے. انھوں نے ان لوگون کے آنے کے بعد جیسا کہ میں نے اوپر کہا ھے. رسوئی (کھانا) تیار کرنے والے کو ھٹا دیا. اور کہا کہ "کستوربا" ھی رسوئی تیار کیا کرینگی. ہم لوگ اسکو پسند نہیں کرتے تھے. لیکن ھماری کچھ نہ چلی. وھی ھملوگوں کیلئے کھانا بھی پکاتی تھیں. سب سے زیادہ تکلیف اسوقت ھوتی جب چولھے میں لکڑی نہ جلنے کیوجہ سے دھوین سے انکی آنکھیں لال ھو جاتیں اور آنسو نکلنے لگتے. ھملوگوں کی باتوں کو گاندھی جی یہ کہکر ٹال دیتے. کہ ان کو اسکی عادت ھے. اور ایسے پبلک کام میں کم سے کم خرچ کرنا چاھئے. نوکر اور باورچی (رسوئیا) کا خرچ جہانتک بچ جائے بچانا چاھئے.

ہملوگ سمجھ گئے۔ کہ گاندھی جی پبلک فنڈ کو کتنی کفایت سے خرچ کرتے ہیں۔ اور کس طرح ایک ایک پیسہ بچانے کی تدبیر میں لگے رہتے ہیں اس طرح سے ہم نے دیکھا جہاں پوسٹ کارڈ سے کام چل سکتا تھا۔ وہاں کبھی وہ زیادہ پیسے خرچ کرکے لفافہ نہیں بھیجتے تھے۔ کاغذ کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کو بھی برباد نہیں ہونے دیتے۔ شاید یہ بہت سے لوگوں کو معلوم نہوگا کہ ان کی بہت سی اہم تحریریں اور اسکے علاوہ کانگریس اور دوسری انجمنوں کی بہت سی اہم تجویزیں ایسے ہی کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھی گئی ہیں۔ جن کو معمولی طور سے لوگ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا کرتے ہیں۔ لفافوں کے اندر اور تاروں کی پشت کے سادے حصہ اور دوسرے ایک ہی طرف لکھے ہوے کاغذوں کا خالی حصہ وہ اسی زمانہ سے آخر عمر تک برابر لکھنے کے کام میں لاتے رہے۔ وہاں ہمیں بھی سیکھنے کو ملا کہ پبلک کاموں میں پیسے کے خرچ کے متعلق کتنی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ چمپارن میں جو کچھ خرچ ہوا وہ گاندھی جی نے ہی اپنے دوستوں سے لیکر دیا۔ ان دوستوںمیں رنگون کے، ڈاکٹر پی۔ جے۔ مہتا، بڑے آدمیوں میں سے تھے۔

ہملوگوں کو چندہ جمع کرنے کی نہ ضرورت پڑی اور نہ انہوں نے اسکی اجازت دی۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ہملوگوں کے ساتھ جو نوکر تھے وہ ایک ایک کر کے ہٹادئے گئے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مجھے کسی کام سے ایک دن کے لئے پٹنہ جانا پڑا۔ میرے پاس ایک چھوٹا ڈبہ تھا۔ جس میں سفر میں کچھ کھانے کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ وہ چمپارن ساتھ آ گیا تھا۔ لیکن کبھی ضرورت نہ پڑنے کی وجہ سے یونہیں پڑے پڑے بہت میلا ہوگیا تھا۔ پٹنہ جانے کے لئے کنویں پر بیٹھ کر میں اسے صاف کر رہا تھا۔ گاندھی جی ادھر آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی ہنس پڑے اور بولے کہ «بڑی خوشی ہوئی کہ پٹنہ ہائی کورٹ کے وکیل سے ہم نے برتن منجوایا»۔ جو لوگ وہاں تھے وہ سب کھکھلا کر ہنس پڑے گاندھی جی نے دکھنی افریقہ میں خود پاخانہ صاف کیا تھا۔ ہملوگوں کے لئے چمپارن میں وہ نوبت نہیں آئی وہ جانتے تھے کہ آہستہ آہستہ سے ہی کچی لکڑی مڑ سکتی ہے۔ زیادہ زور لگانے سے ٹوٹ جانیکا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے چمپارن میں انہوں نے اپنا سارا پروگرام ہملوگوں کے سامنے نہیں رکھا۔ صرف

چمپارن ھی کا معاملہ رکھا۔ اور اس کیلئے جو کچھ ضروری
تھا۔ وھی ھم سے کرایا اس سے زیادہ نہیں۔
چمپارن میں ھملوگ ابھی کھادی نہیں پہنتے تھے یہانتک کہ
اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ اگرچہ ھم میں سے کچھ لوگ
ایسے بھی تھے۔ جو سودیشی کا استعمال پہلے ھی سے کیا کرتے
تھے۔ میں تو سنہ ۱۸۹۸ء سے ھی سودیشی کا استعمال کرتا تھا۔
کیونکہ میرے بڑے بھائی مہندر پرشاد جب پریاگ (الہ آباد) پڑھنے
گئے۔ تو وھاں انہوں نے سودیشی کپڑوں کا استعمال شروع کیا۔
اور انکی ھی دیکھا دیکھی ھم نے بھی سودیشی کپڑوں تک ھی
یہ طریقہ نہیں رھا۔ بلکہ دوسری چیزیں بھی اگر سودیشی مل
جاتی تھیں تو ھم انہیں کو لیتے۔ لیکن اگر کوئی ایسی چیز ھوتی
جو سودیشی نہ ھوتی پھر اسکا استعمال ھی جہانتک ھوسکتا چھوڑ
دیتا۔ ھاں ایسی چیزیں جن کے بغیر کام ھی نہیں چل سکتا تھا
تو پھر بدیشی بھی لے لیتے جیسے گھڑی یا دوا وغیرہ۔ میری یہ
بچپن کی عادت ایک طرح سے آجتک چلی آرھی ھے۔ یہ ماننا پڑیگا
کہ ان دنوں کے مقابلہ میں اب بدیشی چیزیں بہت زیادہ استعمال
کرتا ھوں۔ میں جب تک پڑھتا رھا کسی امتحان میں۔ میں نے

بدیسی قلم یا بدیسی نب کا استعمال نہیں کیا. سبھی امتحانوں کو
دیسی ہی نب کے ذریعہ چاھے وہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو
پاس کیا. اب تو فاؤنٹنپن اور اسکی روشنائی بھی بدیسی استعمال
کرتا ہوں. کپڑا میں نے اس وقت سے آج تک ایک موقع کے
علاوہ کبھی نہ تو بدیسی استعمال کیا اور نہ خریدا. وہ موقع اس
وقت کا تھا جب دل میں ولایت کا سودا سمایا ہوا تھا. میں
نے وھاں کے لئے جو کپڑے بنائے ان میں دیسی اور بدیسی کا
لحاظ نہیں رکھا. یہ سنۂ ۱۹۰٦ کی باتیں ہیں جب سے گاندھی جی
نے کھادی چلائی. اسوقت سے کھادی کے سوا اور دوسرا دیسی
کپڑا نہیں لیا. اس میں ہمارے بھائی صاحب بڑے پکے تھے
انہیں سے مجھے یہ سبق ملا تھا. گاندھی جی سے اکثر ہملوگوں
کی باتیں ہوا کرتیں. جنکا اثر برابر پڑتا گیا. اس زمانہ میں
شریمتی مسز بیسنٹ کے «ہوم رول» کی تحریک خوب زوروں
سے چل رہی تھی. ہملوگوں کے سبھی ساتھی جو پبلک کاموں
میں دلچسپی رکھتے تھے. اور چمپارن نہیں آئے تھے اسی
تحریک میں لگ گئے. گاندھی جی نے ہملوگوں کو منع کردیا تھا
کہ جب تک تم لوگ اس کام میں ہو. کسی اور کام میں ہاتھ

مت ڈالنا۔ اسلئے هملوگ جتنے دنوں تک وہاں رہے اور وہ آٹھ دس مہینے کا عرصه تھا۔ ہم میں سے کسی نے کہیں بھی کوئی تقریر نہیں کی۔ خود گاندھی جی بھی دو موقعوں کے علاوہ (جو مجھے یاد ھیں) کسی سبھا میں شریک نه ہوئے۔ ایک جلسه تو «آنجہانی دادا بھائی نوروجی» کی وفات پر اظہار غم کے لئے کیا گیا تھا۔ اور دوسرے «گئو رکھشا سبھا» کے سالانه جلسه کے وقت صرف اتنا ھی نہیں کیا که هملوگ اور گاندھی جی کسی سیاسی مسئله پر تقریر نہیں کرتے تھے۔ بلکه چمپارن کے متعلق بھی کسی نے کہیں کوئی تقریر نہیں کی۔ اور نه اس طرح کا کوئی مضمون کبھی اخباروں کو بھیجا۔ هملوگوں کو کبھی کبھی یہ بات ذرا تکلیف دیتی تھی۔ جب ہم نے «هوم رول لیگ» میں شریک ہونیکے لئے ان سے کہا۔ تو انہوں نے یہی جواب دیا که تملوگ هوم رول کا سب سے بڑا کام یہیں کر رہے هو۔ اسلئے اگر کسی دوسری سبھا میں شریک نہیں هوسکتے هو۔ تو اسکی پرواہ مت کرو کیونکه آگے چلکر دیکھوگے۔ که یه کام کسی اور کام سے کم اہم نہیں هوگا۔ ہم نے ان کی بات مان لی۔ اگرچه کبھی کبھی یه بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ که جو کام ہم کر رہے هیں

اس سے "ہوم رول" کا کیا تعلق ھے۔ یہ میں ابتدا کی بات لکھ رہا ہوں۔ تھوڑے ھی دنوں میں ہم نے تجربہ سے سمجھ لیا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح ھے۔

ایکبار میں گاندھی جی کے ساتھ کسی گاؤں سے آرہا تھا۔ راستہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سارے ملک میں گھوم آئے ہیں۔ آپ نے کس صوبہ کے لوگوں کو پبلک کام کے لئے سب سے اچھا پایا انہوں نے کہا کہ "دکھن کے لوگ جذباتی ہیں اور ہوشیار ہیں۔ بنگال کے لوگ بہت جذباتی ہیں۔ اور ان میں ایثار و قربانی کی بہت قوت ھے۔ اور انہوں نے اسکو کیا بھی بہت ھے۔ لیکن جنتا کی خدمت کرنے والے کے لئے "پونا" ھی متبرک مقام (تیرتھ استھان) ھے وہاں جتنی پبلک انجمنیں کام کرنے والوں کے ایثار اور قربانی پر پورے اطمینان سے چل رہی ہیں۔ اتنی شاید کسی دوسرے مقام پر نہیں ہیں۔ وہاں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو ملک کی خدمت کیلئے وقف کردیا ھے اور وہ اپنے عہد کو بہت ھی مضبوطی سے نباہ رہے ہیں اسلئے میں اسکو تیرتھ استھان مانتا ہوں۔

مجھے بھی اسکا کچھ حال معلوم تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں شری

گوکھلے سے میری ملاقات ہوئی. اسوقت انہوں نے مجھے
« انجمن خادم ہند » (سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی) میں شریک ہونے
کو کہا. لیکن گاندھی جی کے کہنے پر اب یہ میری خواہش
ہے کہ ایکبار وہاں جا کر ان انجمنوں کو دیکھوں.

ہم لوگ آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ ہمارا صوبہ اور
صوبوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے. اس وقت شاید ہی
ایسے لوگ بہار میں ہوں کہ جو اپنا سارا وقت دیکر کسی پبلک
انجمن یا ملک کا کام کر رہے ہوں. ہملوگوں کو خیال ہوا کہ
کوئی ایسی سوسائٹی بہار میں قائم کی جائے جسکا مقصد صرف
خدمت ملک ہو. بابو برجکشور پرشاد جی ہملوگوں کے « نیتا »
اور ہادی تھے ہملوگوں نے سنا تھا کہ « پونا » میں فرگوسن کالج
کے تمام اساتذہ ۷۵ روپیہ ماہوار پر کام کرتے ہیں شری گوکھلے
نے بیس برس کا عہد کرکے ۷۵ روپیہ پر ہی کام کیا تھا. اسی
طرح ان دنوں ڈاکٹر پرانجپے. جو انگلستان کے بڑے بڑے
امتحانوں کو پاس کرکے آئے تھے. ۷۵ روپیہ ماہوار پر ہی
وہاں کام کر رہے تھے. ہملوگونکا خیال ہوا کہ ایسا ہی ایک
کالج بہار میں کھولا جائے. اس سے یہ فائدہ ہوگا. کہ اس کالج

کے پروفیسر اپنی زندگی نوجوانوں کے سامنے ایثار اور قربانی کی مثال میں پیش کرسکیں گے۔ جس سے سارے صوبہ میں بیداری پیدا ہوگی۔ بابو برجکشور پرشاد بھی گاندھی جی کی طرح جو کام اٹھاتے تھے اس کو جلد سے جلد پورا کرنا چاہتے تھے۔ جب یہ بات چلی تو انہوں نے خود ایسی سوسائٹی میں اپنی وکالت چھوڑ کر شریک ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہملوگوں نے پوچھ پوچھ کر جو لوگ راضی ہوئے ان کے نام لکھ لئے۔ کچھ لوگوں سے گفتگو کرکے رقم کے بھی وعدے لئے۔ جہانتک اب مجھسے یاد ہے۔ سات آٹھ ہزار روپیہ ہمکو نقد مل گئے۔ اسوقت تک ہملوگوں کا خیال قومی تعلیم کی طرف نہیں گیا تھا۔ اگرچہ ہم نے خود تقسیم بنگال کی تحریک کے وقت جب کلکتہ میں میں نے قومی تعلیمی ادارے دیکھے تھے۔ "گرو کل" بھی کئی برس سے چل رہے تھے۔ پھر بھی ہم نے گورنمنٹ سے تعلق رکھنے والے کالج کھولنے کا ارادہ کیا تھا۔ مہاتماجی سے جب یہ بات کہی گئی۔ تو انہوں نے سوسائٹی بنانے کا خیال تو پسند کیا۔ لیکن کالج کھولنے کا پسند نہیں کیا۔ اس لئے وہ تجویز وہاں کی وہیں رہ گئی۔

کمیشن کا کام بتیا میں شروع ہوا. کچھ سرکاری اور کچھ نیل والوں نے اپنے اپنے تحریری بیانات دئے. اور انکے زبانی بیان بھی لئے گئے. کمیشن نے موتی ہاری میں بھی کئی روز تک بیٹھک کی. اسکے ممبروں نے کئی نیل والوں کے پاس جا کر انکے اظہار لئے. اور انکے کاغذات بھی دیکھے. تقریباً ایک طرف سے انہوں نے سارے ضلع کا دورہ کرلیا. کسانوں کی طرف سے بھی بیانات اور اظہار ہوئے. ہم لوگوں کے پاس جو کاغذات تھے انمیں سے جو ٹھیک معلوم ہوئے. وہی منتخب کرکے پیش کئے گئے، لیکن جیسا کہ گاندھی جی کا خیال تھا، کسانوں کی طرف سے ثبوت پیش کرنیکی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوئی، کیونکہ سرکاری افسروں کی وہ راز کی رپورٹیں جو وقتاً فوقتاً پیش ہوئی تھیں وہی کافی سمجھی جاتی تھیں اظہار کا کام ختم ہو جانے پر رپورٹ لکھنیکا وقت آیا " سرایڈورڈ گیٹ " نے مہاتماجی سے کہدیا کہ اگر کمیشن اتفاق رائے سے رپورٹ دیگا. تو گورنمنٹ اس رپورٹ پر آسانی سے کام کرسکیگی. لیکن اگر ممبروں نے اختلاف رائے ظاہر کیا تو گورنمنٹ کوبھی اس رپورٹ کی بنیاد پر کام کرنے میں دشواری ہوگی. اسلئے

گاندھی جی کی یہ تجویز تھی۔ کہ جہانتک ممکن ہو متفقہ رپورٹ تیار کی جائے۔ اسمیں دقتیں بہت تھیں۔ کیا نیل والونکے نمایندے اور گاندھی جی ایک رائے ہو سکتے تھے؟ کیا ان کی شکایتوں کو جو نیل والوں کے خلاف کی گئی تھیں۔ انکا نمایندہ مان لیگا؟ اگر ایسا ہوگا تو کیا گاندھی جی ان شکایتوں کو جن کو وہ صحیح جانتے تھے۔ غلط کہکر نیل والوں کے نمایندے کے ہم خیال ہوجائیں گے؟ جن برائیوں کو دور کرنا تھا۔ ان میں سب سے بڑھکر یہ تھیں "تین کٹھیا" کا رواج، اضافہ لگان اور تاوان کے نام سے کسانوں سے زبردستی روپے وصول کرنا۔ اب جبکہ جرمن لڑائی کی وجہ سے نیل کی کھیتی سے پھر منافع ہونے لگا تھا۔ تو کیا نیل والے اسکو اب چھوڑ دینگے۔ انہوں نے لگان میں اضافہ کرنے جو لاکھوں روپے کی آمدنی بڑھائی تھی کیا وہ اسے چھوڑ دینے پر راضی ہونگے؟ کیا وہ تاوان کے روپے واپس کر دینگے؟ یہ سب کچھ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کمیشن کا قائم ہونا ہی بیکار تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ سرکاری افسروں کا رخ کیا ہوگا؟ البتہ زمینداروں کے نمایندے گاندھی جی کے ہم خیال ہوسکتے تھے۔

گاندھی جی نے شروع ھی میں ایک بہت بڑے جھگڑے کے سبب کو دور کردیا تھا. اور کہدیا تھا کہ ھملوگ اپنی سفارشوں کے متعلق اگر ایک رائے ھو جائیں گے تو میں اس بات پر زور نہیں دونگا کہ نیل والوں کی ظلم و زیادتی کی جو شکایتیں کی گئیں ان پر بھی کمیشن اپنی رائے دے. اگر ان کے کرتوتوں کے کارنامے کی رپورٹ لکھی جاتی. تو اسمیں کوئی شک نہیں تھا کہ نیل والوں کے خلاف سبھی باتوں کو ماننا پڑتا. اگر کمیشن کے سب ممبر ایک رائے نہیں ھوسکتے. اور گاندھی جی کو اپنی رائے الگ لکھ کر دینی پڑتی تو اتنا زبردست اور ناقابل تردید فیصلہ وہ لکھ دیتے کہ کسی کو چون چرا کرنیکی ھمت نہیں ھوسکتی تھی. اگر کمیشن کے دوسرے ممبر اور کچھ لکھنا چاہتے. تو ان کی ساری باتیں سرکاری افسروں کی غیر جانبدارنہ رپوٹوں سے ھی کاٹی جاسکتی تھیں. ان کے اس مشورہ کو دوسرے ممبروں اور نیل والوں کے نمایندے نے بھی خوشی سے مان لیا. کیونکہ اس سے وہ ایک سخت مصیبت سے بچ جاتے تھے. گاندھی جی نے یہ مشورہ اسلئے دیا تھا کہ وہ اس بات کو جانتے تھے: کہ جو زیادتی اور اور ظلم ابتک ھوچکے ھیں. وہ تو اب واپس

نہیں ہوسکتے تھے۔ اور اگر اب آئندہ کیلئے انکا ہونا بند ہو جائیگا، تو ان کے لکھنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ھے، گاندھی جی ھملوگوں سے، سرکاری افسروں و نیز نیل والوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ نیل والوں کے دشمن نہیں ھیں، ان کیلئے وہ کوئی برائی نہیں چاھتے، مگر ساتھ ھی جو ظلم وہ کسانوں پر کیا کرتے ھیں۔ وہ سب بند ھوجانے چاھئیں۔ ظلم کے بند ھو جانے سے اگر انکا نقصان ھوتا ھے تو اسے برداشت کرنا چاھئے چونکہ وہ انکی برائی نہیں چاھتے تھے۔ اسلئے اگر رپورٹ کے ذریعہ کسانوں کی بھلائی ھوجائے تو نیل والوں کے خلاف جو شکایتیں تھیں۔ انکا لکھنا فضول تھا۔ اس تجویز کے پیش کرنے میں انہوں نے اپنی « اھنسا » کی روشنی سے کام لیا تھا۔ جس کا تجربہ انہوں نے بہت سے دوسرے موقعوں پر کیا۔ اسکا اثر سرکاری افسروں اور نیل والوں پر بہت ھوا۔ اب دوسری باتونمیں ھم خیال ھونیکا راستہ کھل گیا۔ سر فرینکس سلائی کمیشن کے صدر تھے۔ وہ کچھ دنوں کے بعد « مدھیہ پردیش » (صوبہ متوسط) کے گورنر ھوگئے۔ لیکن اس وقت وہ کسی بڑے عہدے پر تھے۔ وہ بہت ھی تجربہ کار اور ھوشیار آدمی تھے۔ وہ

بھی چاھتے تھے۔ کہ ایک ایسی رپورٹ پیش کی جائے جس کے مطابق گورنمنٹ کارروائی کرسکے۔ اسلئے وہ بھی بہت خواھش مند تھے۔ کہ کسی نہ کسی طرح ایک ایسی رپورٹ تیار ھو جو بالکل متفقہ ھو اسطرح گاندھی جی کی بات سے نہ صرف وہ سب متأثر ھوئے۔ بلکہ ایک طرح سے ان کے مداح بن گئے۔ بات یہ تھی کہ رپورٹ کے اس حصہ کے متعلق سرکاری افسروں کو ھی خاص کر «سر فرینکس سلائی» کو بہت دشواری ھوتی۔ نیل والوں کا نمایندہ تو تمام باتوں کو آسانی سے غلط کہکر ان کی طرفداری کرسکتا تھا۔ گاندھی جی اور زمینداروں نے نمایندے کے سامنے جو ثبوت تھے۔ ان کی خاصکر سرکاری افسرونکی وقتاً فوقتاً پیش کردہ رپورٹوں کی بنیاد پر نیل والوں کے خلاف فیصــلہ لکھنا آسان تھا۔ لیکن سرکاری افسر اس مشکل میں پڑجاتے کہ انکو یا تو نیل والوں کے خلاف رپورٹ لکھنی پڑتی اور یا گورنمنٹ کی شکایت کرنی۔ کیونکہ سب باتوں کو جانتے ھوئے بھی سرکار نے اتنے دنوں تک خاموشی اختیار کی اور اس کے افسروں نے بھی اکثر نیل والوں کی مدد کی اور اگر وہ ایسا نہ کرتے اور نیل والوں کو بری کرنا چاھتے تو سرکاری افسروں

کی رپورٹوں کو بھی غلط ماننا پڑتا اسلئے دبدھا سے بچنے کا جو راستہ گاندھی جی نے بتایا. اسکو انہوں نے خوشی اطمینان کے ساتھ مان لیا.

کیونکہ سہ گانہ رواج کی وجہ سے ھی ساری زیادتیاں ہوتی تھیں اسلئے گاندھی جی نے زور دیا کہ اس کو قانون کے ذریعہ سے بند کردینا چاھئے. اسمیں سرکاری افسر ہم خیال ہوگئے. نیل والوں نے دیکھا کہ اسمیں رکاوٹ ڈالنی فضول ھے کیونکہ اب اسکو جاری رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا. وجہ اسکی یہ تھی که نیل کی جو کھیتی ایک بار بند ہوچکی تھی. اور اب جرمن جنگ کی وجہ سے پھر منافع دے رھی ھے. کبھی وہ پھر جرمن لڑائی بند ہوتے ھی بیکار ثابت ہوگی. اسلئے اسکو چھوڑنا ھی پڑیگا. اب اچھا یہی ھے کہ بات مان لی جائے اب لگان میں اضافه چھوڑنے کا سوال آیا. کاشتکاری قانون کے مطابق چند حالتوں میں زمیندار کو لگان بڑھانے کا اختیار ھے. لیکن عدالتی حکم کے بغیر فی روپیہ دو آنہ سے زیادہ نہیں بڑھایا جاسکتا. یہاں نیل والوں نے اس سے کہیں زیادہ اضافه کردیا تھا. انکی طرف سے یہ کہا گیا. کہ جتنی دستاویزیں لکھی گئی ہیں، اور ان کی

رجسٹری ہوچکی ھے، اور انکی پابندی کسانوں پر لازم ھے، اس لئے اگر ناجائز ٹھراکر «شرح بیشی» اٹھا دینی ھے تو کسانوں کو عدالت جاکر کارروائی کرنی چاہئے، کمیشن ان کی جائز دستاویزونکو رد نہیں کرسکتا، یہ بات قانونی طور سے ٹھیک تھی لیکن اگر اضافہ نہ چھوٹتا تو کسانوں پر لدا ہوا بوجھ ہمیشہ کیلئے قائم رہ جائیگا، مہاتماجی کا خیال تھا کہ اگر عدالت ھی میں جانا تھا، تو پھر کمیشن کی کوئی ضرورت ھی نہیں تھی، کیونکہ کسانوں کے لئے لاکھوں مقدمے عدالت میں دائر کرنے اور ان کی پیروی کرنی غیر ممکن ھے. اسکا ایک تجربہ بھی ہوچکا تھا. گاندھی جی کے وھاں جانے سے پہلے ھی گیارہ مقدمے کسانوں کی طرف سے دائر ہوگئے تھے. نیل والوں نے ان مقدموں کو ایک طریقہ سے اپنے خلاف مورچہ مان کر پیروی کی. سب سے بڑے بیرسٹر کو پٹنہ سے لیگئے. آخر میں پہلی عدالت میں پانچ یا چھ مقدموں میں کسانوں کی جیت ہوئی اور باقی میں نیل والوں کی، ضلع کی «عدالت اپیل» نے کچھ فیصلے قائم رکھے اور کچھ کو رد کردیا. لیکن نتیجہ یہی ہوا. کہ وھاں بھی آدھے میں کسان جیتے اور آدھے میں نیل والے عدالت ضلع کے فیصلے

کے خلاف نیل والوں اور کسانوں نے ہائی کورٹ میں جو مقدمے دائر کئے تھے۔ ان کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جب چند مقدموں کی یہ حالت تھی۔ تو لاکھوں مقدموں کا کیا حال ہوگا؟ اور یہ جھگڑا کتنے دنوں تک رہیگا۔ اسلئے دشمنی دور کرنے اور انصاف کے خیال سے بھی کمیشن ہی کو اس کے متعلق فیصلہ کرنا چاہئے۔ اور گورنمنٹ کو "شرح بیشی" منسوخ کردینی چاہئے۔ اس بات پر ایک رائے ہونا مشکل ہوگیا۔ لیکن گاندھی جی اسکو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اسلئے انہوں نے صلاح کا دوسرا راستہ نکالنا چاہا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ کہ قانون لگان کے مطابق تقریباً سبھی زمینداروں نے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا تھا۔ اگر نیل والوں نے بھی اتنا ہی اضافہ کیا تھا۔ تو ان کے خلاف کوئی شکایت نہوتی۔ لیکن انہوں نے بہت زیادہ اضافہ کیا تھا اس لئے ہملوگوں نے سوچا کہ سارا اضافہ موقوف نہ کیا جائے بلکہ جو قانوناً جائز ہے۔ اسکو رہنے دیا جائے۔ اور زبردستی زیادہ بڑھایا ہوا اضافہ منسوخ کردیا جائے اس صورت میں کسانوں کو شکایت نہ ہونی چاہئے۔ مصالحت کا یہ راستہ ہوسکتا تھا۔ گاندھی جی

نے یہ تجویز پیش کی لیکن نیل والے اسپر بھی راضی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح جہاں ہم پورا تاوان واپس کرنا چاہتے تھے وہاں وہ ایک پیسہ بھی واپس کرنا نہیں چاہتے تھے۔ صلح کے خیال سے آخر میں گاندھی جی کو مجبوراً اس پر راضی ہونا پڑا کہ اضافہ کا تقریباً تین چوتھائی سے زیادہ رہنے دیا جائے۔ اور ایک چوتھائی سے کم منسوخ کردیا جائے۔ اور تاوان کا صرف ایک چوتھائی حصہ واپس کیا جائے اور تین چوتھائی چھوڑ دیا جائے بہت بحث کے بعد کسی نہ کسی طرح اس پر سب راضی ہو گئے۔ اور دوسری باتوں کے متعلق بھی کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوا۔ رپورٹ باتفاق رائے تیار کرکے گورنمنٹ کے پاس بھیجدی گئی۔ گورنمنٹ نے رپورٹ کی بنیاد پر ایک قانون بنایا۔ جسکے اعتبار سے « سہ گانہ رواج » کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اور اضافہ بھی مندرجہ بالا مقدار میں کم کردیا گیا، تاوان کے متعلق گورنمنٹ نے حکم دیا کہ جتنا روپیہ واپس ہوسکتا ہے، اتنا « بتیا راج » کے کسانوں کو واپس کرے اور اسکے بتیا راج ھی نیل والوں سے وصول کرتا رہے۔ جلدی روپیہ واپس دلانے کے خیال سے یہ کیا گیا، ساتھ ھی یہ بھی خیال تھا، کہ کسانوں کو

کوٹھی والے بہت سی مشکلیں نہیں ڈالیں گے، اسلئے کہ جو رقم وہ برابر لیا کرتے تھے وہ کبھی دیا نہیں کرتے تھے۔ اور اب تو وہ کسی حالت میں بھی واپس نہیں کریں گے۔ چونکہ «بتیا راج» «کورٹ آف وارڈس» میں تھا۔ اس سے گورنمنٹ بھی باسانی کورٹ کی معرفت وہ رقمیں واپس کرا سکتی تھی۔ اسکے علاوہ دوسرے مسئلوں کے متعلق بھی گورنمنٹ نے مناسب احکام جاری کرنے۔ اس طرح کمیشن کی رپورٹ پوری پوری مان لی گئی۔ تھوڑے دنوں میں اسپر عمل ہونے لگا۔

اس طرح نیل کا جھگڑا ختم تو ہوا۔ لیکن جن شرطوں کو گاندھی جی نے مانا۔ ان پر کچھ لوگوں نے نکتہ چینی بھی کی ان کا کہنا تھا۔ کہ اضافہ اگر غلط تھا۔ تو وہ سارے کا سارا منسوخ ہو جانا چاہئے تھا۔ اسی طرح اگر تاوان ناجائز تھا۔ تو وہ بھی پورا واپس ہو جانا چاہئے تھا۔ ہملوگوں نے بہت سوچ بچار کر صلح کے شرائط کو مانا تھا ہمارے ماننے کا خاص سبب یہ بھی تھا۔ کہ ہم جانتے تھے۔ کہ اسطرح قانون کے ذریعہ یا گورنمنٹ کی مدد سے اگر کچھ نہ کیا گیا۔ تو عدالتوں میں جا کر کسان کچھ نہیں پاسکیں گے۔ گاندھی جی نے ہملوگوں سے صاف

صاف کہدیا کہ صلح چاہے کسی شرط پر ہونی. «سہ گانہ رواج» اٹھ جانے کے بعد نیل والے اب یہاں نہیں ٹہر سکتے کیونکہ ان کا کاروبار زور و ظلم اور زبردستی سے ہی چلتا تھا. اگر یہ زیادتی اور زبردستی بند ہو جائے. تو وہ لوگ یہاں نہیں ٹہرسکتے اسکا سبب یہ ہے کہ سہ گانہ رواج اٹھا دینے کا اور کسانوں کے دلوں میں جو بے خوفی اور جرأت پیدا ہوگئی ہے اسکا یہ اثر ہوگا کہ ان کی زیادتیاں اب کوئی کسان برداشت نہیں کریگا. اس لئے اسمیں اب کسی طرح کی فکر کی ضرورت نہیں ہے. چنانچہ ایسا ہی ہوا.

مہاتما گاندھی کے چمپارن آنے اور اس جانچ کے بعد رپورٹ پیش ہونے اور قانون بننے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد نیل والے اپنی زمینیں، کوٹھیاں اور مویشی وغیرہ بیچ کر چلے گئے، گاندھی جی کے وہاں پہنچتے ہی ان کا رعب اٹھ گیا تھا، اب صرف معمولی زمیندار کی حیثیت سے وہ وہاں رہ سکتے تھے، لیکن اسطرح انکا کام نہیں چل سکتا تھا؛ انہوں نے انہیں کسانوں اور «بتیا راج» کے ہاتھ اپنا سب کچھ بیچ دیا تھا، ان کو دام بھی اچھے مل گئے کیونکہ پہلی جرمن لڑائی کے بعد ابھی سبھی

چیزوں کے دام بڑھے ہوئے تھے، دام اچھے ملجانے سے نیل والونکو بھی کوئی رنج نہیں ہوا اور کسان تو بہرحال خوش ہوئے.

نیل والوں کے ساتھ گاندھی جی کے تعلقات بہت اچھے رہے یہ کام ختم ہوجانے کے بعد. اب انہوں نے تعلیم اور صفائی وغیرہ کا کام وہاں کے گاؤں میں کرنا چاھا. تو اس سے وہ خوش ہوئے. اگرچہ ان میں سے دو ایک نے کچھ رکاوٹیں بھی ڈالیں مگر دوسروں نے تھوڑی بہت مدد بھی کی. مہاتما جی کا خیال تھا. کہ جتنا کیا گیا اتنا کافی نہیں ھے. اسکو مستقل بنانے کے لئے ان میں سچی بیداری آنی چاھئے. نہیں تو نیل والوں کے چلے جانیکے بعد بھی وہ کسی نہ کسی ظلم کے شکار بنے رہینگے اسلئے انہوں نے تین چار پاٹھ شالاؤں (اسکولوں) کو جاری کیا. جنکو چلانے کیلئے اچھے اور پڑھے لکھے ایثار مجسم کام کرنے والے رکھے گئے مجھکو یہ افسوس رہا کو میں وہاں کے کسی " پاٹھ شالے " میں خود نہ رہ سکا، اور پٹنہ جا کر پھر اپنے کام میں لگ گیا، کام کرنیوالے زیادہ تر مہاراشٹر گجرات ھی کے رھے، انمیں عورت مرد دونوں تھے. بہاریوں میں صرف بابو دھرنی دھر ایک اسکول چلاتے رھے، باھر کے لوگونمیں

شری مہادیو بھائی ڈیسائی اور انکی بیوی شریمتی درگا بائی سابرمتی آشرم کے شری نرہری پارکھ اوو انکی بیوی «منی» بہن، خود «کستوربا» بمبئی کے شری وامن گھوکھلے اور انکی بیوی «اونتیکا بائی» انجمن خادم ہند (سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی) کے ڈاکٹر شری کرشن دیو وغیرہ ان اسکولونکو چلاتے رہے۔ وہ لوگ بچونکو حرف پہچنواتے، اور گاؤنکی صفائی کرتے، عورتوں کو صفائی وغیرہ سکھاتے، گاؤں اور خاصکر کنوؤں کے آس پاس کی زمین کو صاف رکھنے کا سبق دیا کرتے، اسکے بعد گاؤں کے متعلق جو پروگرام گاندھی جی نے سارے ملک کیلئے جاری کیا، اسکا آغاز وھیں پر ہوا، یہ قومی کارکن کچھ دنوں کے بعد چلے گئے۔ انکی جگہ پر دوسرے لوگ آکر کام کرنے لگے، انمیں کانگریس کے موجودہ جنرل سکریٹری شنکرراؤ دیو اور بیل گاؤنکے مشہور کانگریسی کارکن شری پنڈرک تھے، ان سب کے ساتھ جو پہنچان چمپارن میں ہوئی، وہ آخر تک رھی تقریباً سب نے اپنی زندگی ملک کے کاموں ھی میں صرف کردی:—

گاندھی جی وھاں ھملوگوں سے کہا کرتے تھے، کہ تملوگ سوراج کا بہت بڑا کام کر رہے ہو، وہ یہ بھی کہا کرتے تھے:

کہ یہاں بھی اگر سچائی کیساتھ کام ہوا، تو تم لوگ اپنے لئے ایک بڑی پونجی حاصل کرلوگے. جو آگے چلکر پبلک خدمات کیلئے بہت قیمتی ثابت ہوگی، ہم نے ان باتونکو حرف بہ حرف تعمیل کی، اس میں شك نہیں کہ سوراج کا وہ بہت بڑا کام تھا. بہار کیلئے تو وہ ایك طرحسے پبلك کاموں کا آغاز تھا، اس سے پہلے صرف صوبائی کانفرنس کرکے قرار داد منظور کرلینی. کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریك ہوجانا، کچھ روپیہ کسی کے پاس ہو تو کانگریس کو دیدینا. اخباروں میں کچھ لکھدینا کونسل کے ممبر ہوں تو سوال کردینے، اور تقریر کردینی. پبلك کامونکا یہی آغاز اور یہی انجام تھا. عوام کے ساتھ کسی قسم کا ربط و تعلق نہیں تھا. پبلك جلسے بھی « ہوم رول » تحریك سے پہلے بہت کم ہوا کرتے. اور جو ہوتے بھی تو وہ صرف شہروں ھی میں ہوا کرتے تھے. ان میں تقریریں زیادہ تر انگریزی میں ہوتی تھیں، ان جلسونمیں شریك ہونیوالے بھی وھی ہوتے جو انگریزی جانتے تھے. اور وہ سرکاری ملازم نہیں ہوتے تھے. گاندھی جی کے چمپارن جانے نے نئی زندگی پیدا کردی ضلع چمپارن کے لوگوں میں بہت زیادہ بیداری ہوگئی تھی. وہاں

کے کونے کونے کے لوگ گاندھی جی کے نام اور کام سے واقف ہو گئے۔ یہ اثر چمپارن تک ھی محدود نہیں رہا۔ اگرچہ گاندھی جی نے کوئی جلسہ وغیرہ کر کے پرچار کا کام نہیں کیا تھا، لیکن پھر بھی صوبہ بھر میں ایک نئی لہر سی دوڑ گئی۔ ہوم رول کا جو کام ہوا تھا اسکی وجہ سے اسمیں بہت زیادہ زور پہونچگیا گاندھی جی نے جو نیا راستہ دکھلایا اسکو بہار کے لوگوں نے اسیوقت مان لیا جب بعد میں گاندھی جی نے ملکی تحریک شروع کی تو بہار بغیر چوں چرا کے انکے ساتھ ہو گیا، جہانتک جنتا کا تعلق ھے پورے بہار میں ابتک وھی بات ھے۔ سوراج تحریک میں بہار کا حصہ ملک کے کسی دوسرے علاقہ کے حصے سے کم نہیں ھے گاندھی جی کو بھی بہار پر بھروسہ تھا کچھ دوسرے صوبوں کے لوگ بہار کو گاندھی کا بے مثل خادم کہا کرتے تھے یہ بات ٹھیک ضرور ھے کیونکہ بہار کے لوگوں کا بھروسہ تجربہ کا نتیجہ تھا۔ ان لوگوں نے انکے پروگرام سے فائدہ اٹھایا تھا۔ جو بات «ان ھونی» سمجھی جاتی تھی۔ اسکو ان لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا مجھے یقین ھے کہ اگر سارا ملک ویسا ھی آنکھ بند کر کے مقلد ھو جاتا تو آج ملک بہت اونچا ہو گیا ھوتا۔

ساتواں باب

چمپارن آنے سے پہلے ہی گاندھی جی نے سابر متی آشرم میں ستیا گرہ آشرم کو قائم کر لیا تھا. وہ چمپارن یہ سوچ کر آئے تھے کہ پانچ سات روز کے اندر وہاں کا کام کر کے آشرم واپس چلے جائینگے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں پانچ سات روز کے بجائے مہینوں رہنا پڑیگا، تو انہوں نے آشرم کے رہنے والوں کو اطلاع کر دی کہ وہاں کا کام وہیں کے لوگ چلائیں، کیونکہ کچھ عرصہ تک ان (گاندھی جی) کے واپس آنے کا امکان نہیں ھے. اس طرح آشرم کا کام وہاں چلنے لگا. چمپارن سے وہ جو کچھ ھدایتیں دے سکتے تھے، دیتے رھے.

چمپارن میں رہتے ہوئے انہوں نے جنوبی ھند میں " ھندی پرچار " کا کام شروع کیا. اس کی صورت یہ ہوئی

که ایک بار ان سے ملنے کے لئے سوامی ست دیو جی آئے
سوامی جی کی شہرت بہت تھی. بہار اور خاصکر چمپارن
میں وہ کبھی کبھی آیا کرتے اور اپنی تقریروں سے لوگونکو
بیدار کرتے تھے. ان کی ہندی کتابیں بھی رائج تھیں.
ان کے غیر ملکی یا بدیشی تجربوں سے لوگ واقف اور متاثر
تھے، وہ گاندھی جی سے ملنے بتیا آئے. گاندھی جی نے
ان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے سابر متی آشرم
میں جاکر رہیں، انہوں نے ویسا ھی کیا، پھر کچھ دنوں کے
بعد گاندھی جی نے ان کو مشورہ یہ دیا کہ جنوبی ہند مین
جاکر ہندی کا پرچار کریں، سوامی جی مدراس گئے. اور
وہان کچھ عرصہ تک کام کرتے رھے. گاندھی جی نے ان
کے ساتھ اپنے بیٹے شری دیو داس گاندھی کو بھی ہندی
پرچار کے لئے بھیجا، « ہندی ساھتیا سمیلن » (انجمن ادبیات
ہندی) سے میرا تعلق پہلے ھی اجلاس سے ھوگیا تھا،
جو بنارس میں « پنڈت مدن موھن مالویہ » کی صدارت میں
سنۂ ١٩١٠ میں ھوا تھا، کیونکہ میں اس پہلے جاسے میں
شریک ھوا تھا. جہاں تک مجھے یاد ھے، میں نے پہلے

پہل « شری پرشوتم داس ٹنڈن » کو وہیں دیکھا تھا ، شاید ان سے واقفیت بھی ہوگئی تھی ؛ لیکن پوری اور مخصوص واقفیت تو اس وقت ہوئی جبکہ اس کا دوسرا جلسہ کلکتہ میں ہوا ، اس کی مجلس استقبالیہ کا میں صدر تھا ، انجمن اس وقت تک اپنی ابتدائی حالت پر تھی مجھے یہ یاد نہیں کہ اس نے ہندی پرچار کا کام کہاں شروع کیا ؟ لیکن جنوبی ہند میں گاندھی جی کے ہندی پرچار کے کام نے ہندی پرچار کے لئے میری آنکھیں کھول دیں اور ایک بہت بڑا میدان پیدا کردیا ، اور میں یہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ ایک دن سارے ملک کی سرکاری زبان ہوجائیگی . اگرچہ اس تبلیغی کام کے ساتھ میرا کسی قسم سے براہ راست تعلق نہیں تھا لیکن پھر بھی میں اس میں دلچسپی لینے لگا کچھ بہار کے پرچار کرنے والے بھی وہاں گئے ، انمیں سے کچھ تو آج تک وہاں کام کر رہے ہیں ، شروع میں جو پرچار کرنے والے جاتے تھے وہ مجھ سے پوچھکر جاتے ، اسطرح وہاں جو کام ہوتا اس کی معلومات مجھے رہتیں . گاندھی جی سے اسکا تعلق ہونے سے یہ کام اور بھی مضبوط ہوتا گیا .

مہاتما جی کے ہندی پرچار کے کام سے متاثر ہوکر "انجمن ادبیات ہندی" ان کو اندور کے اجلاس کا جو سنہ ۱۹۱۸ء میں تھا، صدر منتخب کر لیا، مہاتما جی وہاں چمپارن ہی سے گئے، ہم میں سے کئی آدمی ان کے ساتھ ہی گئے، وہاں کا جلسہ بہت شاندار ہوا، جنوبی ہند میں ہندی تبلیغ کے لئے وہاں پر چندہ کیا گیا، انجمن نے ان کی اس ترغیب و خواہش پر اس کام کو اپنا اہم کام سمجھکر اس کو ساتھ میں لے لیا.

اندور کے متعلق ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر باعث لطف ہوگا، اگرچہ جس میں ایک لطیف حقیقت بھی ہے، مہاتما جی اور ان کے ساتھ کے ہملوگ ریاست کے مہمان تھے، اس لئے وہاں خاطر و مدارات کا بڑا انتظام تھا، جتنے برتن ہمارے کام کے لئے وہاں رکھے گئے تھے. یہاں تک کہ نہانے کے لئے پانی رکھنے کا برتن بھی سب چاندی کے تھے، راج کے کارندے دن رات خاطر داری میں لگے رہتے تھے، مہاتما جی تو اپنا سادہ مونگ پھلی وغیرہ کھانا الگ کھا لیا کرتے تھے. لیکن ہملوگوں کے لئے

بہت سے پکوان وغیرہ چاندی کے بڑے تھالوں میں اور چاندی کی کٹوریوں میں چنے گئے، ہملوگوں نے نہایت اچھی طرح سے کھانا کھایا، مہاتما جی سے کھانے کے بعد جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگوں نے کیا کھایا؟ جو کچھ ہم نے کھایا تھا وہ مہادیو بھائی نے سب بیان کردیا، تھوڑی دیر کے بعد جب ریاست کے کارندے آئے تو مہاتما جی نے ان سے کہا کہ آپ ان لوگوں کو جیسا کھانا دے رہے ہیں ویسے کھانے کی ان کو عادت نہیں ہے اسلئے یہ لوگ یہاں بیمار پڑجائینگے. آپ ان کے لئے معمولی سادہ پھلکا اور سبزی کا انتظام کردیجئے، تھوڑا دودھ بھی دے دیا کیجئے، ان کے لئے یہی صحت بخش اور اچھا کھانا ہوگا، بس اس کے بعد سے چاندی کے برتنوں میں ہملوگوں کو وہی سادہ کھانا ملنے لگا، جو ہمکو چمپارن میں گاندھی جی کے ساتھ ملا کرتا تھا،

گاندھی جی مانتے تھے کہ «حس ذائقہ» پر فتح پانا بہت مشکل ہے. ہملوگ جو کھانا کھاتے ہیں وہ جسم کی حفاظت اور اس کو مضبوط بنانے کے لئے نہیں بلکہ صرف مزے

کے لئے ہوتا ھے، کھانے کا اثر تندرستی پر بھی پڑتا ھے، اسلئے ھم میں سے جن کے پاس دولت ھوتی ھے۔ وہ زیادہ اور غیر صحت بخش لیکن مزیدار کھانا کھا کر بیمار پڑتے ھیں لیکن جن کے پاس دولت نہیں ھوتی وہ صحت بخش اور کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بیمار اور کمزور ھو جاتے ھیں اسلئے انہوں نے خود چمپارن ھی میں سادہ کھانے اور ذائقہ پر فتح پانے کی مثال ھمارے سامنے رکھ دی تھی، وہ کچھ دنوں کے بعد رسوئی کھانے لگے لیکن اسمیں ان کا ایک دستور تھا یعنی چاھے پھل ھوں یا کھانا کسی میں پانچ چیزوں سے زیادہ نہیں ھوتی تھیں، ان پانچ چیز میں نمک مرچ جیسی چیزیں ایک ایک علاحدہ سمجھی جاتی تھیں اسطرح اگر ھملوگوں کے لئے کوئی چیز «مسالہ دار» تیار ھوتی تھی تو ان کے نزدیک وہ غذا نہیں ھوتی تھی، کیونکہ مسالے میں ھی پانچ چھ چیزیں ھوجاتی تھیں۔ لیکن اس اصول کے علاوہ بھی وہ «مسالے دار» چیزوں کا استعمال برا سمجھتے تھے، اسکا کارن یا سبب یہ تھا کہ ایک تو یہ چیزیں زیادہ تر گرم اور خواھشوں کو ابھارنے والی ھوتی ھیں، دوسرے یہ مزے کو

بھی بدل دیتی ھیں جس کی وجہ سے آدمی زیادہ کھا لیتا ھے اور پھر ایسی چیزیں کھا لیتا ھے جو نقصان دیتی ھیں۔ چمپارن میں جب انہوں نے اناج کھانا شروع کیا اس وقت بھی نہ تو وہ نمک کھاتے تھے اور نہ دودھ یا دال صرف چاول اور ابلی ھوئی سبزی ھی کھایا کرتے تھے۔ ابلی ھوئی چیزوں میں بھی خاص کر کریلا کھایا کرتے تھے جو بہت زیادہ ابال دیا جاتا تھا۔ وہ اسی کے پانی کے ساتھ "بھات" (چاول) ملا کر بہت مزے لے لے کر کھا لیا کرتے تھے کریلا بہت کڑوا ھوتا ھے۔ اسکا ابالا ھوا پانی تو اور بھی کڑوا ھوتا ھے لیکن ھم دیکھتے تھے کہ اسی کو وہ خوش ھو ھو کر اور مزے لے لیکر کھاتے تھے۔ اندور میں جو انہوں نے ھملوگوں کے لئے پکوان کی ممانعت کردی تھی وہ بھی اسی تجربہ کا ایک جز تھا، ھم نے یہ بھی دیکھ اور سمجھ لیا کہ سادہ کھانا صحت بخش ھونے کے علاوہ کم خرچ بھی ھے۔ بعد میں جب بہت سے مقامات پر آشرم کے نام سے سوسائٹیاں قائم ھوئیں تو ان میں سادہ کھانا اچھی طرح رائج ھوگیا۔ اگرچہ یہ کہنا مبالغہ ھوگا کہ مسالے کا خرچ

ایکبارگی بند ہوگیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ کم ضرور
ہوگیا، وہ جہاں جاتے اور جو کام ہاتھ میں لیتے اسمیں سے
صرف ایک ہی معاملے کو اہم قرار دے کر اس کو کرتے
لیکن ساتھ ہی جہاں تک ممکن ہوتا اپنے دوسرے خیالات
بھی پھیلاتے رہتے تھے: یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے
سبھی قسم کے مسئلوں پر صرف روشنی نہیں ڈال گئے، بلکہ
عملی شکل سے ان کے حل کرنیکی تدبیر بھی بتا گئے۔

گاندھی جی کے صدر ہوتے ہی تبلیغی کام کو سمیلان (انجمن)
میں جگہ ملتے ہی ہندی کا کام نہایت زور سے دکھن میں چلنے
لگا، دکھن کو انہوں نے اسلئے ہاتھ میں لیا کہ وہاں کی زبان
بالکل الگ ہے، اگر وہاں ہندی پرچار ہو جائے تو
دوسرے حصوں میں اسکا پرچار مشکل نہ ہوگا، وہ تقریباً
کٹھن کام ہی ہاتھ میں لیا کرتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے
اگر مشکل کام میں کامیابی ہوگئی تو پھر آسان کام میں
کامیابی ہو ہی جائیگی، چمپارن کا کام بھی بہت مشکل تھا،
بہار میں اس زمانہ میں جو لوگ پبلک کام میں حصہ لیا
کرتے تھے ان سب لوگوں نے ان کو منع کیا تھا لیکن

انہوں نے کسی کی نہ سنی، آخر انہوں نے کامیاب ہو کر ایک نیا راستہ کھول ہی دیا۔

گاندھی جی ابھی چمپارن ہی میں تھے کہ ضلع کھیڑا (گجرات) کے کسانوں نے فصل کم یا ضائع ہونیکی وجہ سے گورنمنٹ کی مالگذاری کم کرنے کے لئے تحریک شروع کی تھی گاندھی جی وہاں کی حالت جانتے تھے، وہاں کے کسانوں نے ستیا گرہ کا ارادہ کیا۔ سردار ولبھ (پٹیل) نے گاندھی جی کے ساتھ ملکر ان لوگوں کی رہنمائی کی، اندور سے میں مہاتما جی کے ساتھ سابر متی گیا۔ وہاں ابھی مکانات تیار نہیں ہوئے تھے، شاید ایک مکان کا تھوڑا سا حصہ بنا تھا، سب لوگ بانس کی چٹائیوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ہی رہتے تھے، آشرم کی زندگی شروع ہو چکی تھی، صبح و شام پرارتھنا (دعا)، کھانا، اور جہانتک مجھے یاد ہے کچھ چرخے کے کام کی ابتدا ہوچکی تھی، مہاتما جی وہاں ایک ہی روز ٹھہر کر کھیڑا کے دورے پر چلدئے؛ میں بھی ان کے ساتھ گیا، یہ شاید اپریل کا آخری ہفتہ تھا؛ وہاں دھوپ بہت سخت تھی، آشرم سے ریل پر سوار ہو کر ہملوگ کچھ دور

گئے۔ وہاں سے کئی گانوؤں میں گئے اور کچھ لوگوں سے ملے
مہاتما جی ان لوگوں سے گجراتی میں باتیں کیا کرتے تھے،
اسلئے میں کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اتنا اندازہ ضرور
کر لیتا تھا کہ لوگوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ اگر مالگذاری ادا
نہ کرنیکی وجہ سے مویشی وغیرہ ضبط کئے جائیں تو اس کو
بھی برداشت کرنا چاہئے لیکن مالگذاری ہرگز ادا نہ کرنی
چاہئے۔

ایک دن دوپہر کی سخت دھوپ میں گاندھی جی کے ساتھ
میں جا رہا تھا، زمین ریتیلی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت
تپ رہی تھی، میں تو جوتا پہنے ہوئے تھا لیکن مہا تما
جی اس زمانہ میں چپل بھی نہیں پہنتے تھے، بالو پر چلنے
لگے، ابھی کچھ دور اور چلنا تھا، جب کہیں کسی درخت کا
سایہ مل سکتا تھا لیکن وہاں تک پہونچنے کے لئے راستہ
میں سوائے گرم بالو کے اور کچھ نہ تھا، مجھے کوئی خاص
تکلیف نہیں تھی لیکن مین نے یہ دیکھا کہ ان کو بہت تکلیف
تھی، میرے کندھے پر ایک چادر تھی میں نے اس کو ان
کے پیروں کے سامنے ڈال دیا تا کہ اس پر ان کے پیروں کو

تھوڑا سا آرام مل جائے، لیکن انہوں نے اس پر پیر نہیں رکھا اور مجھ سے کہنے لگے کہ اسکی کیا ضرورت ھے؟ اس دیس میں کروڑوں آدمی اسی دوپہر میں اس سے بھی زیادہ گرم بالو میں بغیر جوتے کے چلتے ھیں اور کام بھی کرتے ھیں» میں نے مجبور ھوکر اپنی چادر اٹھالی اور ان کے پیچھے چپ چاپ چلتا رھا. اسی وقت مجھے چمپارن کا بھی ایك واقعہ یاد آ گیا.

مہاتما جی وقت کی بہت پابندی کرتے تھے، وہ اپنا ایك منٹ بھی برباد نہیں ھونے دیتے اور نہ وہ دوسرے کا کرتے ان کو جو وقت کسی کی ملاقات کے لئے دیا جاتا. ٹھیک اسی وقت اگر ان کو جانا ھوتا وہ پہنچ جاتے، اگر دوسرے کو ان سے ملنے آنا ھوتا تو اس کو بھی عین وقت پر ان کے پاس پہنچ جانا پڑتا، ھمکو اکثر تجربہ ھوا ھے کہ جب کبھی مقررہ وقت سے ایك دو منٹ بعد بھی اگر کوئی پہونچا تو وہ اسکو کسی نہ کسی طرح یاد دلا دیتے کہ «دیر کر کے آئے ھو» اسی طرح اگر کسی نے وقت مانگا اور کہہ دیا کہ صرف پانچ ھی منٹ چاھئیں اور انہوں نے بھی اس پانچ منٹ کے

وقت کو منظور کرلیا تو ان پانچ منٹوں میں کام پورا نہ ہونے پر وہ کام کو ادھورا ہی چھوڑ دیتے تھے، اور کہہ دیتے تھے کہ آپ کا وقت پورا ہوگیا، اگر آپ کو اور وقت چاہئے تو پھر لیجئے۔

چمپارن میں ہملوگ ان باتوں کو اچھی طرح جانتے نہیں تھے۔ اس لئے کبھی کبھی کچھ غفلت ہوجاتی تھی۔ ایک دن مجسٹریٹ سے ان کو دو بجے ملنا تھا مجسٹریٹ کا گھر کچھ دور تھا، اس لئے کرایہ کا گھوڑا گاڑی منگا دینے کا انتظام کیا گیا، انہوں نے پوچھا تھا کہ پیدل جانے میں کتنا وقت لگیگا؟ ان سے کہا گیا کہ آدھ گھنٹہ، اس پر انہوں نے کہا کہ ڈیڑھ بجے۔ پانچ منٹ پہلے ہی یہاں گاڑی تیار رہنی چاہئے۔ ہملوگوں نے سوچا تھا کہ جب پیدل جانے میں آدھ گھنٹہ لگیگا تو گھوڑا گاڑی کے لئے آٹھ دس منٹ کافی ہونے چاہئیں اس لئے اگرچہ گاڑی والے کو ڈیڑھ بجے سے پہلے آنے کو کہا گیا لیکن پھر بھی ایسا کوئی انتظام نہ ہوسکا کہ کوئی جاکر اسکو ٹھیک وقت پر لے آتا گاندھی جی یہ معلوم کرکے کہ گاڑی ابھی نہیں آئی، وہاں سے

چلدئے. هملوگوں نے بہت کہا کہ گاڑی ابھی آتی ھے، جو دو بجے سے یہاں سے وہاں پہنچ جائیگی. اگر تھوڑی دیر کے بعد بھی آپ جائینگے تو وقت پر پہنچ جائینگے. لیکن انہوں نے نہ مانا. اس سخت دھوپ میں وہ چلدئے. دریافت کرنے پر بعد میں هملوگوں کو معلوم ھوا کہ انہوں نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ ٹھیک وقت پر پیدل ھی پہنچ جائیں. کیونکہ کسی وجہ سے اگر گاڑی نہ آتی تو وہ دیر سے چلتے اور وہاں ٹھیک وقت پر نہ پہنچ سکتے. هملوگوں کو اسی سے معلوم ھوا کہ وقت کی وہ کس قدر پابندی کیا کرتے تھے، یہ صرف پبلک کام ھی کے لئے نہیں بلکہ روزانہ کی عبادت کے لئے بھی ایسے ھی پابند تھے. کھیڑا کی اسی جاترا میں میری پہلی ملاقات سردار ولبھ بھائی پٹیل، شری شنکر لال هلکر اور شریمتی انسوما بائی وغیرہ سے ھوئی. وہ دن مجھے یاد ھے جس روز «کرم سر» گاؤں میں هملوگ گئے تھے. وھیں سردار ولبھ بھائی پٹیل کا گھر دیکھا اور وھیں کھانا کھایا تھا. جو ملاقات اس وقت ھوئی وہ بعد میں ایک گہرے تعلق کی شکل مین قائم ھوگئی.

گجرات کے گانوؤں کا دو تین دن تک دورہ کر کے میں پٹنہ واپس آ گیا. میں نے وہاں پوچھا تھا کہ اگر میری ضرورت ہو تو میں ٹھر جاؤں، لیکن اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور مجھے چھٹی مل گئی.

کھیڑا کی ستیہ گرہ تھوڑے ہی دنوں میں پوری کامیابی سے ختم ہوئی، اس کے بعد گاندھی جی اس ضلع میں دورہ کر کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرانے کی کوشش میں لگ گئے اسوقت جرمن لڑائی بہت زور سے چل رہی تھی، لارڈ چمسفورڈ کو مہاتما جی نے زبان دی تھی کہ وہ مدد کرینگے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے اس گرمی کے موسم میں گانوؤں کا دورہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے بعد سخت بیمار پڑ گئے.

جب گاندھی جی نے فوج میں بھرتی کا کام شروع کیا تو اسکا اثر بہار پر یہ ہوا کہ صوبہ کی گورنمنٹ بھی بھرتی کے کام میں ہم سے مدد لینے لگی، گاندھی جی کے ساتھ چمپارن میں رہنے کیوجہ سے لوگوں سے کافی واقفیت ہو گئی تھی، شاید سرکاری ملازموں کے دل میں بھی یہ بات

بیٹھ گئی تھی کہ ہمارے ایسے آدمی اس کام میں مدد پہنچا سکتے ہیں۔ اسلئے جب پٹنہ میں ایک صوبائی کمیٹی بنائی گئی تو اسکا ممبر بننے کے لئے مجھ سے بھی کہا گیا۔ چونکہ گاندھی جی اس کام کو کر رہے تھے اسلئے میں نے بھی اسکو منظور کرلیا، مجھ سے خاص طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ نوجوان طبقہ میں سے کچھ لوگوں کو میں لڑائی میں جانے کے لئے تیار کر سکونگا کیونکہ «بہار انجمن طلباء» (بہار اسٹوڈینس یونین) کی وجہ سے طبقۂ طلباء کے ساتھ میرا بہت زیادہ ربط تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی «بل» کے خلاف جو تحریک اٹھی تھی اس سے میری ساکھ قائم ہوگئی، میں نے کچھ کوشش تو کی لیکن ناکام رہا. کیونکہ طلبا کا طبقہ لڑائی میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا، گاندھی جی کو بھی کامیابی نہیں ہوئی لیکن جہاں تک ان کے بس میں تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ اٹھا نہیں رکھا اتنی زیادہ محنت کی کہ ان کی جان بھی جوکھوں میں پڑگئی. تھی میں اپنے بارے میں ایسا نہیں کرسکتا کچھ تھوڑی بہت کوشش ضرور کی لیکن اور کاموں کیساتھ اسکو بھی ایک کام سمجھا صرف اسی میں

ساری قوت صرف نہیں کی. اگر صرف بھی کرتا تو شاید بہت زیادہ نتیجہ نہ نکلتا، ہم نے اس سے یہ بھی سمجھ لیا کہ گاندھی جی جو کام ہاتھ میں لے لیتے ہیں، اس کو پورا کرنے کے لئے اپنی ساری قوت لگا دیتے ہیں، ہم نے اپنے میں یہ کمی پائی. صرف اسی وقت نہیں بلکہ بعد میں بھی، ایسی پوری توجہ سے اور نتیجہ کی کوئی پروا کئے بغیر ہم نے اپنے میں کبھی کام کرنے کا میلان نہ پایا.

اسی زمانہ میں «مونٹیگ چمسفورڈ رپورٹ» شائع ہوئی، انہوں نے ہندوستان کے آئین میں اصلاح کرنے کیلئے یہ رپورٹ تیار کی تھی دیس کی بیداری اور «ہوم رول» تحریک کی وجہ سے ہی حکومت برطانیہ نے آئین میں اصلاح کرنے کا اعلان کیا تھا. مانٹیگو وزیر ہند تھے اور چمسفورڈ وائسرائے، دونوں کے ہندوستان میں پھرنے اور لیڈروں سے ملنے کے بعد یہ رپورٹ لکھی تھی. رپورٹ کی سفارشوں کے متعلق ملک میں کافی اختلاف ہوگیا تھا، کچھ لوگ اسکو ناکافی سمجھتے تھے، اور کچھ لوگ ناکافی سمجھتے ہوئے بھی شکر گذار تھے. اسوقت

کانگریس کے ایک مخصوص اجلاس کا ارادہ کیا گیا، وہ اجلاس بمبئی میں ہونے والا تھا، اجلاس کے لئے صدر کے انتخاب کا مسئلہ آیا، اسی کے متعلق مسز «اینی بیسینٹ» پٹنہ آئیں، مجھ سے بھی اسکے متعلق ان سے باتیں ہوئیں، یوں تو میں نے ان کی تقریروں کو پہلے سے بھی سنا تھا. لیکن ان سے جان پہچان نہیں ہوئی تھی، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ «تم کس کا صدر ہونا پسند کرو گے؟» میں نے گاندھی جی کا نام لیا، انہوں نے کہا کہ «وہ دوسرا کام تو خوب کر لیتے ھیں لیکن وہ سیاست دان (پولیٹشن) نہیں ھیں» انہوں نے میری تجویز، جو محض خانگی طور سے بات چیت میں ھی کی گئی تھی. نامنظور کردی. شاید وہ پہلے ھی سے یہ ارادہ کر کے آئی تھیں کہ شری سید حسن امام صدر بنائے جائیں، حسن امام صاحب اسوقت ھائی کورٹ کے جج نہیں ھوئے تھے، اور کانگریس کے جلسوں میں شریک ھوا کرتے تھے اور اسمیں دلچسپی لیتے ہوئے چندہ بھی دیا کرتے تھے. کلکتہ ھائی کورٹ کی ججی کے زمانہ میں فوجداری مقدمات کے سلسلے میں انہوں نے اچھی شہرت

حاصل کی تھی، سنہ ۱۹۱٦ میں جب پٹنہ میں ھائی کورٹ قائم ھوا تو وہ استعفاء دے کر پٹنہ چلے آئے اور یہاں بیرسٹری کرنے لگے۔ انہی ساری باتوں سے ان کی شہرت بڑھی اور وہ ایک مشہور آدمی ھوگئے تھے۔ شریمتی مسز اینی بیسینٹ نے لوگوں سے رائے لیکر انہیں کو صدر بنایا، جس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ گاندھی جی «سیاست دان» نہیں ھیں۔ میں نے اسی وقت دبی زبان سے اسکی مخالفت بھی کی تھی اور چمپارن میں جو بڑا کام گاندھی جی نے کر کے دکھایا تھا، اسکا میں نے حوالہ بھی دیا لیکن میری ایک نہ چلی، جب انہوں نے اپنی طرف سے حسن امام صاحب کا نام پیش کیا تو اسکی مخالفت میں میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، میرا قیاس ھے کہ شریمتی مسز اینی بیسنٹ کا بھی خیال گاندھی جی کے متعلق قائم رھا کیونکہ گاندھی جی نے جب کل ھند ستیا گرہ شروع کی تو شریمتی اینی بیسنٹ نے اسکی سختی سے مخالفت کی یہاں تک کہ گاندھی جی کو ایک طرح سے شیطان سے تشبیہ دیتے ھوئے انہوں نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ «وہ تاریک اور اندھی طاقتوں کی نمائندگی کرتے ھیں.

گاندھی جی اتنے بیمار تھے کہ وہ بمبئی نہ جاسکے۔ میں گیا اور وہاں شریک ہوا، کانگریس ختم ہونے پر میں گاندھی جی سے ملنے کے لئے احمدآباد چلا گیا۔ اس زمانہ میں وہ وہیں مرزا پور میں سیٹھ انبا لال کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے، میں بھی وہیں جا کر ٹھہرا، ان کو پیٹ کی بیماری تھی اور بخار ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کچھ دوا نہیں پیتے تھے۔ اسوقت دودھ یا دودھ سے تیار کی ہوئی کوئی چیز بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ لوگ پریشان تھے کہ وہ کیونکر صحت یاب ہونگے۔ میں نے دو چار روز ان کے پاس ٹھہرنے کے لئے سوچ لیا تھا اور ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرتا۔ باقی وقت ادھر ادھر پھرنے میں صرف کر دیتا تھا، ایک روز شہر میں کچھ پرانی تاریخی چیزوں کو دیکھنے چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ آشرم چلے گئے۔ میں بھی آشرم چلا گیا اور وہیں ٹھہرا میرا ارادہ تھا کہ میں دوسرے ہی روز واپس چلا جاؤنگا۔

اسوقت تک آشرم میں کچھ مکانات بن گئے تھے، وہاں کے ایک کمرے میں ایک چار پائی پہ وہ لیٹے تھے

میں بہت صبح وہاں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ فکر مند اور پریشان ہیں۔ تھوڑی دیر میں شری چھگن لال گاندھی آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مہاتما جی خود ہی باتیں کرنے اور کہنے لگے کہ "کل میں بخار کی حالت میں ضد کر کے یہاں چلا آیا۔ میں وہاں اس بڑے محل میں پڑے پڑے سوچتا تھا کہ اس محل میں میرا کیا کام ہے، مجھے تو آشرم میں ہی رہنا چاہئے۔ اور جب تک آشرم میں نہ جاؤں، مجھے سکون کہاں اور کیسے ملیگا، یہاں بھی آ کر میں بہت دیر تک جاگتا اور سوچتا رہا کہ میں کیا کر رہا ہوں، ایک کام بھی پورا نہیں کر پاتا کہ دوسرے میں ہاتھ لگا دیتا ہوں وہ ابھی ادھورا ہوتا ہے کہ اس کو چھوڑ کر تیسرے کو شروع کر دیتا ہوں، اس آشرم کو میں نے بہت سی امیدوں اور حوصلے سے قائم کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں رہ کر جیسا یہ آشرم ہونا چاہئے ویسا اسے بنانے اور جیسے آشرم کے رہنے والے ہونے چاہئیں، ویسے ہی ان کو تیار کرنے میں لگا رہوں

لیکن وہ کام ابھی ٹھیک طرح سے شروع بھی نہ ہوا۔ کہ مجھے چمپارن چلا جانا پڑا۔ اور تم لوگوں پر آشرم چلانے کا سارا بوجھ پڑگیا۔ یہانتک کہ جس روز سے آشرم کا کام باضابطہ شروع ہوا، اس روز بھی میں نہ آسکا۔ چمپارن میں جہانتک کہ گورنمنٹ سے کام لیکر کسانوں کو راحت دلانے کا تعلق تھا۔ وہ تو ایک طرحسے پورا ہوا۔ لیکن کیا اتنی ھی بات سے کسانوں کا بھلا ہوگا؟ ان میں رہ کر ان کی رہن سہن سدھارنا، ان کو بے خوف بنانا، اور سچی تعلیم دینی اصل کام ھے۔ اس کیلئے میں نے کچھ اسکول کھلوائے۔ وہاں انہیں رہ کر کچھ کام کرنا چاہئے ایسا سوچا ضرور لیکن وہ تعمیری کام ابھی شروع نہ ہوا تھا، کہ مجھے "کھیڑا" جانا پڑا۔ کھیڑا کا کام ابھی ادھورا ھی تھا۔ کہ فوج کی بھرتی کا کام آگیا۔ وھی کرتے کرتے اتنا بیمار ہوگیا ہوں معلوم نہیں کیا ہوگا۔ احمدآباد کے مل مزدوروں میں بھی میں نے کام شروع کیا لیکن اسکو بھی ادھورا چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جانا پڑا۔ تو کیا ساری زندگی اسی طرح کے ادھورے کام کرکے ختم کرنا ھے۔ کل وہ محل مجھے آرام نہیں دیرہا تھا۔ بلکہ تکلیف دیرہا تھا۔ اسی لئے میں اتنی ضد کرکے بخار کی حالت میں

یہاں چلا آیا یہی رات بھر سوچتا رہا کہ اب آئندہ کیا ہوگا میں کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں۔

اسطرح کی باتیں کرتے کرتے وہ اتنے جوش میں آگئے۔ کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، ہملوگ چپ بیٹھے دیکھتے رہے۔ کیا بولتے؟ کیا کہتے؟ اور ان کو کیا سمجھاتے؟ تھوڑی دیر کے بعد جب سکون ہوا تو خود ہی بولے «اتنے آنسو بہنے سے کچھ سکون ہوا جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا» اتنا کہکر چپ ہوگئے، پھر تھوڑی دیر کے بعد آشرم کی اور دوسری باتیں کرنے لگے۔ مجھے بھی پٹنہ جانیکی اجازت ملی میں وہاں سے پٹنہ چلا آیا۔ اسوقت کا منظر برابر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے علم میں توانہوں نے کام ادھورا چھوڑا، لیکن جس کام کو ادھورا چھوڑا اسکو بھی بہت دور تک پہونچادیا اگر اسمیں بھی کچھ باقی رہ گیا ہے تو اسے ملک کو «اور خاصکر ان لوگوں کو جو اپنے تئیں انکا پیرو مانتے ہیں» پورا کرنا ہے۔ اگر وہ پورا نہیں کرتے تو ملک کی بدقسمتی اور ان کی بے عملی ہے:-

آٹھواں باب

جرمن جنگ کے زمانہ میں دو بڑے واقعات پیش آئے. جن کا ہندوستان کی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے. ایک واقعہ کا تھوڑا سا ذکر میں کرچکا ہوں. وہ آئینی اصلاحات کا اعلان اور اس سلسلے میں مانٹیگو چمسفورڈ کی رپورٹ کے متعلق سارے ملک میں اختلافات وغیرہ. دوسرا واقعہ «رولٹ کمیشن» کی تشکیل. یہ کمیشن ملک میں باغی جماعتوں کی کارروائیوں کی جانچ کرنے اور ان سے ملک کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کیلئے قائم ہوا تھا. اس کا نام اسکے «صدر مسٹر رولٹ» پر تھا کمیشن نے ایک رپورٹ تیار کی اسمیں انقلاب پسند جماعت کی تاریخ کے علاوہ ملک اور بیرون ملک میں جو بغاوت کی کوشش کی گئی تھی. ان کی بھی تفصیل تھی اس کمیشن کی سفارشیں اسی قسم کی تھیں. کہ آئندہ کسی بغاوت کرنے والے کو بغاوت کا موقع نہ ملے. لڑائی کے زمانہ میں

سبھی ملکوں میں دشمن کے جالوں سے بچنے کیلئے ایسے قانون بنادئے جاتے ھیں. ایسے قانون کے ذریعہ. عدالتوں کی مداخلت کے بغیر محض شبہ پر کسی کو گرفتار کرکے نظر بند کردینے اور اسکے گھر اور جائداد پر قبضہ کرلینے کا اختیار حاکموں کو دیدیا جاتا ھے وغیرہ وغیرہ چونکہ دشمن سے مقابلہ رھتا ھے اس لئے لوگ ان باتوں کو برداشت کرلیتے ھیں، جہاں اپنی سرکار رھتی ھے، وھاں ان اختیارات کا استعمال بھی احتیاط میں ھوتا ھے، جب ملک کیلئے ضروری ھوجاتا ھے، اسطرح کا اختیار سرکار ھند کو بھی لڑائی کے زمانہ میں ملا تھا، ملک میں اپنی حکومت تو تھی ھی نہیں لہذا ایسے قانون کو، غیر قانونی طور پر بری طرح سے استعمال کیا گیا. خاصکر لڑائی کیلئے چندہ وصول کرنے اور بھرتی کرنے میں بہت ظلم اور زیادتیاں ھوئیں. اسی وجہ سے ملک میں بے چینی اور ناراضگی بہت تھی. خاصکر پنجاب میں، جہاں کے بڑے جابر اور زبردست لفٹنٹ گورنر سرمائیکل اوڈائر تھے.

رولٹ کمیٹی کی سفارشیں تھیں کہ لڑائی کے واسطے وضع کئے ھوئے، اس «قانون حفاظت ملک» کی بری سی بری دفعات کو

بھی مستقل طور سے ہندوستان کے قانون میں جگہ دی جائے، یہ کمیشن لڑائی کے زمانہ میں قائم ہوا تھا۔ لیکن اسکی رپورٹ شایع ہوتے ہوتے لڑائی ختم ہوگئی۔ اس وقت گورنمنٹ نے اس کی سفارشوں کے مطابق ایك بل تیار کیا۔ جو « [1]امپریل لیجسلٹیو کونسل » کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ گورنمنٹ کی دو عملی بہت زمانہ سے جاری تھی۔ ایك طرف آئینی اصلاحات کر کے سوراج کے مانگ کرنیوالونکا منھ بند کر دینا تھا۔ اور دوسری طرف زیادہ چیخ پکار کرنے والوں کے ساتھ سختی کرنی تھی۔ اس اصول کے مطابق ایك طرف اصلاح کی اسکیم منظور ہوئی۔ تو دوسری طرف « رولٹ بل » بنا۔ یہ دونوں چیزیں ایك ساتھ ملك کے سامنے آئیں « اصلاحی اسکیم » کے متعلق تو ضرور ملك میں اختلاف رائے تھا۔ لیکن « کالے [2] قانونون » کے متعلق ملك بھر میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ نام ان « دو بلوں » کا پڑ گیا تھا۔ جنکے ذریعہ « رولٹ کمیشن » کی سفارشونکو قانونی شکل دی گئی تھی ملك کے اعتدال پسند، انتہا پسند، انقلاب پسند سب کی سب

---

۱ اس زمانہ میں جو اصلاحات سے قبل کا تھا « مرکزی اسمبلی » کا نام و لقب یہی تھا یعنی « شاہی کونسل وضع قانون » اب وہ پارلیمنٹ ہے۔

۲ جب یہ رولٹ بل « پیش ہوا تو اسی وقت اسکا نام کالا قانون رکھ دیا گیا۔

جماعتیں ان قانونوں کی سخت مخالف تھیں اس زمانہ میں کونسل میں تھوڑے ھی لوگ عوام کی نمائندگی کرتے تھے۔ زیادہ تر سرکاری ملازم اور سرکاری نامزد لوگ ھی کونسل کے ممبر ھوا کرتے تھے۔ چنے ھوئے نمائندوں میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا۔ جو ان قانونوں کا سخت مخالف نہ ھوتا، سارے ملک میں یہ آواز اٹھی کہ لڑائی جیتنے میں کتنی مدد کی اور اسکا پھل «کالے قانونوں» کی شکل میں گورنمنٹ دے رھی ھے۔ لیکن گورنمنٹ نے کچھ نہ سنا ایسا معلوم ھوا کہ یہ ضرور منظور ھوجائیں گے۔ مہاتما جی کو جو حال ھی میں بیماری سے اٹھے تھے۔ ان بلوں کے پیش ھونے سے بہت تکلیف ھوئی۔ انہوں نے انکی سخت مخالفت کی دوسرے لوگ شاید اپنے بیان دے کر ھی چپ ھوجاتے۔ اور اپنی مخالفت کو کوئی عملی شکل نہ دیتے۔ لیکن گاندھی جی اس طرح چپ بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے سبھی جگہوں پر جلسے کرکے مخالفت کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا۔ بہت سے جلسے ھم نے بہار میں بھی کیے، خاص کر پٹنہ میں کئی جلسے ھوئے جن میں بہت سے لوگ شریک ھوئے۔ اس قسم کے جلسے کبھی پہلے ھم نے بہار میں ھوتے نہیں دیکھے تھے۔ نئی بیداری

اور نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔

آخر میں جب سرکار نے کچھ نہ سنا تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ اگر یہ قانون پاس ہوجائیں۔ تو کسی حالت میں نہ مانے جائیں۔ جولوگ ایسا کرنے کیلئے تیار تھے انکے نام لکھکر اور ایک عہدنامے پر دستخط کرا کر بھیجنے کی ہدایت کی۔ چونکہ میں پٹنہ ھی میں رہتا تھا اسلئے بہار میں دستخط کروانے کا کام میرے ھی ذمہ رہا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ھے۔ کہ چمپارن میں جو انکے رفیق کار تھے نہ صرف انہوں نے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی بخوشی اس عہد نامے پر دستخط کردئے۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ گاندھی جی نے ھندوستان آنے کے بعد پورے ھندوستان کے سامنے قانون شکنی کا پروگرام رکھا۔ اور اس پروگرام میں ایک بڑی مشکل یہ تھی، کہ جو «کالے قانون» بن رہے تھے۔ اور جنکی مخالفت میں ھی ستیہ گرہ ھونیوالی تھی۔ انکو آسانی سے نہیں توڑا جاسکتا تھا، کیونکہ ان میں کوئی ایسی چیز فوراً سامنے نہیں آتی تھی، جسکی خلاف ورزی کی جاسکتی، لیکن اس دقت کو گاندھی جی نے اسطرح حل کیا کہ جو عہدنامہ انہوں نے مرتب کیا تھا۔ اسمیں لکھا گیا تھا۔ ھر دستخط کرنے

والا ان قانونوں کے علاوہ ہر اس قانون کو بھی توڑیگا جسکے لئے یہ کمیٹی اسکو حکم دیگی۔ اسلئے کمیٹی کو جسکا نام ستیہ گرہ کمیٹی رکھا گیا تھا۔ یہ اختیار دیدیا گیا تھا۔ کہ وہ یہ بنائے کہ کون سا قانون توڑنا ہوگا۔ سارے ملک میں جوش پھیلا ہوا تھا لیکن بہت سے لوگ جو کالے قانون کے سخت مخالف تھے۔ ستیہ گرہ یعنی قانون شکنی کا پروگرام پسند نہیں کرتے تھے۔ یہیں پر یہ صاف ہوگیا کہ گاندھی جی کے اور آجتک کی مروجہ سیاسی تحریک کے طریقہ میں کتنا فرق ھے۔ آئینی اصلاح کی وجہ سے کانگریس کے اندر جو جو اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اس طریق تحریک کی وجہ سے اور عیاں ہوگیا۔ بہار میں اسکے متعلق اتنا سخت اختلاف نہیں تھا۔ یہانتک کہ حسن امام صاحب نے عہد نامہ پر دستخط کردئے تھے۔ اسی سلسلہ میں گاندھی جی نے ایک تاریخ مقرر کردی۔ جس میں تمام ملک کو روزہ رکھنے سب کاروبار بند کردینے، جلوس نکالنے اور جلسے کرکے مخالفت کی قرار دادیں منظور کرنے کی ہدایت کی انہوں نے بتایا کہ یہ تحریک ملک کے لئے صفائی اور پاکی کی تکمیل کی ھے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے عدم تشدد کی تاکید بھی کی، انہوں نے یہ بھی

کہا «کہ سب لوگ اپنے مذہب کے اعتبار سے اپنی اپنی عبادت گاھوں میں دعائیں کریں. تاریخ کی اشاعت میں کچھ گڑبڑ ہوگئی اسلئے کسی جگہ ایك ہفتہ پہلے اور کہیں ایك ہفتہ بعد دن بتایا گیا.

ملك کیلئے یہ ایك نیا پیغام تھا. اس وقت تك تحریك کی شکل جلسوں میں، رزولیوشن پاس کردینے اور اخباروں میں مضمون بھیجدینے کی حد تك ھی رھا کرتی تھی. البتہ تقسیم بنگال کے وقت انگریزی چیزونکا بائیکاٹ اور سودیشی کا پرچار بھی کیا گیا تھا. لیکن وہ صرف اسی بنگال تحریك ھی کی حدتك رہا. تقسیم بنگال منسوخ ہوجانے کے بعد اسکو بھی بہت سے لوگ بھول گئے تھے. ھاں جو لوگ تیز اور سخت مزاج کے تھے، وہ انقلابی جماعت کیساتھ شریك ہوگئے. انقلابی لوگ انگریزی اور ھندوستانی افسروں کو جو تحریك دبانے میں بہت کام کررھے تھے مار ڈالنے کی کوشش میں تھے، اس کے لئے وہ بم بناتے اور ادھر ادھر سے پستول لاکر بھی جمع کرتے. کچھ لوگ خفیہ طور سے انکو رقم دیتے، ورنہ وہ خود ڈکیتیاں کرکے روپیہ جمع کرتے. اس گروہ میں خاص طور سے جوان

نوجوان هی تھے، انکا اعلانیہ پرچار نہیں ہوتا تھا، بلکہ ہر کام خفیہ طریقہ سے کیا جاتا تھا۔ ملك کی جنتا میں اس کا بہت پرچار نہیں ہو پایا تھا۔ لیکن جو اسمیں شریک ہوتے وہ دھن کے بڑے پکے اور جان ہتیلی پر لیکر کام کرتے تھے۔

بہت سے مقدمے بھی ہوئے جن میں بہت سے لوگوں کو پھانسی اور کالے پانی کی اور بعضوں کو لمبی لمبی قید کی سزائین ملیں۔ ان میں ایك یہ کمزوری تھی کہ جب کبھی مقدمے چلتے پولس ہر ممکن طریقہ سے ان میں سے کسی نہ کسی کو توڑ کر سرکاری گواہ بنا لیتی۔ مقدمہ چلنے پر کچہریوں میں پیروی کی جاتی اور جہاں تك ہوسکتا بچنے کی تدبیر کی جاتی۔

گاندھی جی نے جو پروگرام بنایا تھا وہ اس سے مختلف تھا، ایك تو اسمیں کسی مخالف یا دشمن پر ہاتھ اٹھانے کی ممانعت تھی دوسرے جو کچھ کرنا تھا وہ ایك اعلانیہ طور پر، چھپے چوری نہیں کرنا تھا، اس کے لئے جو بھی سزا ہو اسے ہنسی خوشی برداشت کرنا، «رولٹ بل» کے خلاف ملك میں جتنے جلسے ہوئے، انمیں جتنے لوگ شریك ہوئے اور انمیں جوش و ہمت کے جو خوبصورت منظر دیکھے گئے ان کی مثال نہیں

مل سکتی، جو لوگ پہلے طریقوں سے مطمئن نہیں تھے اور ان کو بیکار اور بے نتیجہ سمجھتے تھے اور ساتھ ھی انقلابی پروگرام کو بھی پسند نہیں کرتے تھے. وہ اس نئے پروگرام کو دیکھکر بہت متاثر ہوئے. ایسا معلوم ھوا کہ ملک کے ھاتھ میں ایک نیا ھتیار گاندھی جی نے دے دیا تھا.

چمپارن سے جانے کے بعد بھی گاندھی جی نے چمپارن سے تعلق رکھا، ھملوگ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کہیں اس کو کرنا ھی چاھئے. ان کو بھی بھروسہ تھا کہ وہ جو کچھ کہیں گے بہار کے لوگ اسکو مان لینگے، اس ستیا گرہ میں ھم نے اپنی ذمہ داری سمجھکر ھی اس کام کو ھاتھ میں لیا تھا. اگر چہ یہ ابھی واضح نہیں ھوا تھا کہ کب اور کس طرح اسکی ابتدا ھوگی پٹنہ میں ۲ اپریل کی ھڑتال. جلوس اور جلسے ایسے ھوئے کہ بہار میں اس سے پہلے کبھی نہیں ھوئے تھے. صرف پٹنہ نہیں بلکہ بہار کے دوسرے شہروں اور گانوؤں میں بھی یہ دن بڑی شان سے منایا گیا. شہرونمیں اس روز ایک بھی دکان نہ کھلی اور نہ کوئی سواری چلی، سارے شہر کے ھندوؤں نے گویا اس دن کو ایک مبارک دن مان کر گنگا اشنان کیا اور

مندروں میں پرارتھنا کی. مسلمانوں مسجدوںمیں دعائیں مانگیں،
دوپہر کو دو ڈھائی میل لمبا ایک جلوس نکلا جس میں سبھی
لوگ ننگے سر اور ننگے پیر شریک ہوئے، پٹنہ میں قلعہ پر
جلسہ ہونے والا تھا لیکن وہ جگہ چھوٹی ثابت ہوئی، لھذا
سب لوگ گنگا کے کنارے ریت پر پھیل گئے، وہیں ایک
بڑا جلسہ ہوا کہ پٹنہ میں اس سے بڑا جلسہ کبھی نہیں ہوا.
گاندھی جی کا نام بہار کے دیہاتوں، خاص کر اتر بہار میں
لوگ اچھی طرح جانتے تھے. کیونکہ چمپارن کا معاملہ
گھر گھر پھیل چکا تھا، گاؤں کے لوگوں نے اس دن کام
بند رکھنے کی ھدایت کی ایسی تعمیل کی کہ اس روز دیہاتوں
میں نہ ھل چلے اور نہ بیل گاڑیاں چلیں، سبھی جگہوں پر
لوگوں نے روزے رکھے اور جلسے کئے. یہ خبر جب ہم
لوگوں کو معلوم ہوئی کہ گاؤں میں بھی لوگوں نے یہ دن
منایا تو ہملوگوں کا جوش اور بھی بڑھ گیا. اب اسکی توقع
کرنے لگے کہ آئندہ کیا ھدایات ملتی ہیں.

دھلی میں کچھ واقعات ہوجانیکی وجہ سے گاندھی جی احمدآباد
سے دھلی جارہے تھے. دھلی کے قریب پہونچنے پر گورنمنٹ

کے حکم سے وہ گرفتار کر لئے گئے اور کسی جگہ پہنچا دیئے گئے، اسوقت گورنمنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو کہاں لے جایا جارہا ہے. شری مہادیو بھائی ان کے ساتھ تھے. ان کو یہ معلوم نہ ہوا کہ مہاتما جی کہاں لے جائے گئے، اسوقت وہ بمبئی واپس ہوئے اور انہوں نے مجھسے تار دیا کہ مہاتما جی کو، دہلی جاتے ہوئے گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ پر بھیج دیا گیا، اسکے ساتھ ہی انہوں نے مجھسے فوراً آنے کے لئے لکھا تاکہ وہیں مل کر صلاح و مشورہ کیا جائے کہ اب کیا کیا جائے؟ میں تار ملتے ہی بمبئی کے لئے روانہ ہوگیا. میں سمجھ چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوکر ہی رہے گا اور اب زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں ہوگی. راستے میں مجھسے کچھ اخبار ملے جن سے یہ معلوم ہوا کہ کئی جگہوں پر بلوے شروع ہوگئے ہیں. پٹنہ سے بمبئی جانے میں تقریباً دو روز ریل میں لگ جاتے ہیں، مجھسے یہ خبر بھی ایک روز دیر سے ملی تھی اسلئے میرے بمبئی پہنچتے پہنچتے تین یا چار دن گزر چکے تھے، میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ مہاتما جی کو اور کہیں نہیں لے گئے بلکہ ان کو

بمبئی ھی میں لا کر چھوڑ دیا، ان کی گرفتاری کی خبر سے
بمبئی میں بھی کچھ فساد شروع ھوا تھا لیکن ان کے وھاں
پہنچ جانے پر امن ھوگیا۔ اور وہ وھاں سے احمدآباد چلے
گئے تھے جہاں سخت فساد ھورھا تھا اس صورت میں بمبئی
میں میرا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا یہ سوچ کر احمد آباد چلا
جاؤں میں اسی دن شام کی گاڑی سے ادھر کو روانہ ھوگیا
مہاتما جی کے وھاں پہنچنے کے بعد وھاں بھی فساد کم ھوگیا
تھا لیکن سرکاری نگرانی اور چوکسی سارے شہر میں دکھائی
دے رھی تھی۔ کیونکہ پولس اور فوج کے آدمی سزا دے
رھے تھے، اسٹیشن سے سابر متی آشرم پہنچنے میں مجھے
مشکل پیش آئی۔ لیکن اسٹیشن پر خفیہ پولس نے تانگہ
ٹھیک کر کے میرا کام آسان کردیا۔ مہاتما جی کے پاس بخیریت
پہنچ گیا۔ وہ شہر میں سب جگہ اپنے کارکنوں کو بھیج
رھے تھے اور لوگوں کو سمجھا بجھا کر پر امن رھنے کی
کوشش میں لگے ھوئے تھے۔ شہر میں کافی امن ھو چکا
تھا لیکن پھر بھی لوگ نمیں پرچار کی ضرورت تھی، وھاں کی
حالت سدھارتے ھی اسی روز یا دوسرے روز رات کو

مہاتما جی پھر بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ مین بھی ان کے ساتھ تھا اور ریل میں انہیں کے ڈبہ میں بیٹھا۔ رات کو وہ سوئے نہیں بلکہ کچھ لکھتے ھی رھے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا وہ انہوں نے سویرے مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ اور وہ تحریک ستیا گرہ بند کرنے کا اعلان تھا، ان کی گرفتاری کی وجہ سے جو فسادات دھلی، پنجاب، بمبئی، احمدآباد اور دوسرے بہت سے شہروںمیں ہوئے تھے ان کا اثر ان کے دل پر بہت پڑا، انہوں نے اسوقت ریل ھی میں سوچ لیا تھا کہ ملک نے ان کے طریقہ کو ابھی تک ٹھیک طور سے نہیں سمجھا، اسلئے تحریک کو موقوف کرنا ھی مناسب ہوگا۔

جو لوگ ابھی ان کی ستیا گرہ کی حقیقت کو ٹھیک طور سے نہیں سمجھے ہوئے تھے انہوں نے اس پر نکتہ چینی کی اور تحریک موقوف کردینے پر برا بھلا بھی کہا، ابھی تک ستیا گرہ نہ تو کہیں شروع ہوئی تھی اور نہ اسکی ٹھیک طور سے شکل متعین ہوئی تھی، جن لوگوں نے عہد نامہ پر دستخط کئے تھے وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کو

کب کرنا چاهئے ؟ اسلئے مہاتما جی کا اعلان نکلتے هی ستیا گرہ کا مسئله تو ملتوی هوگیا لیکن اسی عرصہ میں « جنرل ڈائر » کے ذریعه سے جلیانوالے باغ اور صوبه پنجاب میں بلا وجه قتل و غارت اور زبردست ظلم هوئے جنکی پوری خبر ملك کو بہت دنوں تک نه مل سکی ، لیکن خبر ملنے پر سارے ملك میں آگ لگ گئی . وهی ظلم اور غارت گری سوراج کے متعلق سارے ملك میں تحریك کی بنیاد ڈالنے کا سبب هوا اسی عرصہ میں خلافت کے متعلق برٹش گورنمنٹ کے رویه اور اسکی وعدہ خلافی سے مسلمانوں میں بهی زبردست بیداری پیدا کردی تهی ، جب پنجاب کے قتل و خون اور زیادتیوں کے متعلق گورنمنٹ نے تحقیقات کے لئے « هنٹر کمیشن » مقرر کیا اور اس کمیشن کے ساتھ کانگریس کا نباہ نه هوسکا تو کانگریس کی طرف سے تحقیقات کے لئے ایك علحدہ کمیٹی بنائی گئی جس کے ایك ممبر مہاتما گاندهی بهی تهے ، جب قتل و خون اور زیادتیوں کے مفصل حالات لوگوں کر معلوم هوئے تو ملك کی بے چینی کا پارہ اور بهی چڑھ گیا ، میں اس زمانه میں پٹنه هی میں رها ، لیکن اس جانچ

کمیٹی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہوا، جب گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کو عدم تعاون کی رائے دی تو اس نے خلافت کے خلاف سرکاری رویہ کی وجہ سے عدم تعاون کا ارادہ کرلیا. گورنمنٹ نے بھی ھنٹر کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بعد پنجاب کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جو عوام کو مطمئن کرتا، اسوقت کانگریس کے سامنے بھی یہ سوال آیا کہ اب اسکو کیا کرنا چاھئے؛ اسطرح دونوں کانگریس کمیٹی اور خلافت کمیٹی ایک ساتھ مل کر کام کرنے لگے، دونوں کے سامنے عدم تعاون کا مسئلہ آیا؛ بنارس میں ایک جلسہ ھوا، وھاں طے پایا کہ کانگریس کا خاص اجلاس اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کلکتہ میں کیا جائے. لالہ لاجپت رائے حال ھی میں بیرون ملک سے واپس ھوئے تھے اس اجلاس کے وھی صدر منتخب کئے گئے. ستمبر ۱۹۲۰ع کو اجلاس کرنے کا ارادہ کیا گیا.

عدم تعاون کا جو پروگرام گاندھی جی نے بنایا تھا اسمیں تھا کہ سرکاری خطابوں کو نہ قبول کرنا؛ کونسل کے لئے زمینداروں کا نہ کھڑا ھونا، ووٹ نہ دینا، سرکاری یا

سرکار سے متعلق اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کرنا یعنی نہ انمیں تعلیم پانا اور نہ اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے انمیں شریک کرنا. سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کرنا، یعنی نہ انمیں مقدمہ دائر کرنے اور نہ وکالت اور مختاری کرنی، اسی طرح یہ چار بائیکاٹ عدم تعاون کے اهم جُز تھے، ساتھ ہے بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ. چرخے اور کھدر کا پرچار ملک کی تعلیم جاری اور پنچائتی عدالت قائم کرنا وغیرہ وغیرہ. یہ اس کے تعمیری کام تھے. ملک میں اس پروگرام کا بہت چرچا ہونے لگا.

گاندھی جی نے اخبار «ینگ انڈیا» کی ایڈیٹری اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اسلئے ان کے خیالات ملک کو ہفتہوار معلوم ہوجایا کرتے، میں دور سے ھی ان باتوں کو دیکھتا اور سنتا رها، مہاتما جی سے بھی میری ملاقات کانگریس کمیٹی کے کسی خاص اجلاس میں یا ایسے ھی کسی دوسرے موقع پر ہوتی رھی، لیکن اس کے متعلق خاص طور پر نہ تو میں نے ان سے کچھ جاننے یا پوچھنے کی ضرورت سمجھی اور نہ انہیں کچھ کہنے یا لکھنے کی، میں ان کے مضامین وغیرہ

سے مطمئن ہوجاتا تھا۔ اسکے دلمیں شاید یہ بھروسہ تھا کہ جب کام کا موقع آئیگا اسوقت بہار کے لوگ ان کے پروگرام کو حتی‌الامکان پورا کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

اس موقع پر میرے اسقدر کم تعلق کا سبب یہ بھی تھا کہ سنۂ ۱۹۲۰ کی ابتدا سے ھی میں ایک بڑے مقدمہ میں کام کر رہا تھا، جس میں پنڈت موتی لال نہرو اور دیس بندھو داس بھی تھے، میں نے یہ خیال کرلیا تھا کہ عدم تعاون شروع ہونے پر مجھے شریک ہونا ھی پڑیگا اور اسکے لئے مجھے دو چیزیں فوراً چھوڑنی پڑینگی، ایک وکالت اور دوسری اسمبلی کی امیدواری، نومبر سنۂ ۱۹۲۰ میں انتخاب ہونے والا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ چمپارن سے کھڑا ہونگا کیونکہ وھاں کے کسان ھملوگوں کو جان چکے تھے میں سمجھتا تھا کہ وھاں سے چنے جانے میں آسانی ہوگی اور میں اس ضلع کے لوگوں کی نمائندگی بھی کرسکونگا۔ کیونکہ وھاں کے لوگوں کے متعلق خاصی واقفیت ہوچکی تھی لیکن یہ اسی وقت کرنا ہوگا جب کانگریس فیصلہ کردے یہ امید تھی کہ مقدمہ بھی اسوقت تک ختم ہوجائیگا اسلئے میں

بہرحال اپنا کام کرتا رہا.

اگست کے مہینے میں صوبۂ بہار کی « پولیٹکل کانفرس » کا اجلاس بھاگلپور میں ہونیوالا تھا، اسکا صدر لوگوں نے مجھ ہی کو بنایا تھا اسکو ملک کے سب سے بڑے مسئلے اور اور عدم تعاون کے پروگرام پر غور کرنا تھا لوگوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں عدم تعاون کا طرفدار ہوں مجھکو صدر بنایا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ « کانفرنس » اس پروگرام کو مانے گی یا نہیں، ابھی تک ملک کے کسی صوبہ نے اسکے متعلق اپنی رائے نہیں دی تھی میں ہچکچاتا تھا، لیکن بابو برجکشور وغیرہ کے زور دینے پر میں نے صدارت منظور کرلی، « شری سچدانند سنہا » جیسے بزرگ رہنماؤں سے بھی پوچھ لیا تھا انہوں نے بہت دل سے میرا صدر ہونا پسند کیا اور یہ رائے بھی کہ اگر تمہارا خیال عدم تعاون کی موافقت میں ہے تو تم اسکو کانفرنس کے سامنے صاف صاف ظاہر کردینا اور آخری فیصلہ کانفرنس پر چھوڑ دو. میں نے ایسا ہی کیا اور اپنی تقریر میں خلافت اور پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ عدم تعاون کا

پروگرام ایک طرح سے اسوقت تک لازمی ھے جب تک برٹش گورنمنٹ حقیقی انصاف نہ کرے۔ اسکے علاوہ کچھ اپنے صوبہ کی جو ضروری باتیں تھیں ان کا بھی ذکر تھا، یہ کانفرنس کانگریس کے خصوصی اجلاس سے چند روز پہلے ھی ھوئی میں جہاں تک جانتا ھوں یہ پہلی ھی کانفرنس تھی اور پہلا صوبہ تھا جس کے نمایندوں نے عدم تعاون کی تائید میں باضابطہ قرار داد منظور کی۔ قرار داد کی ترتیب اور غور کے وقت عدم تعاون کے اسباب میں بابو برجکشور پرشاد نے پنجاب کے واقعات اور خلافت کے متعلق شکایت کے علاوہ حصول سوراج کو بھی شریک کرا دیا۔ یہ اسوقت خاص کر ھمکو کھٹکا، ابھی تک ھم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ یہ عدم تعاون تھوڑے ھی دنوں کے لئے ھوگا جس طرح چمپارن کا کام پورا کر کے ھم اپنے اپنے دھندے میں لگ گئے ویسے اسکو بھی پورا کرلینگے اور پنجاب اور خلافت کے متعلق انصاف کرا کے اپنے اپنے دھندوں میں لگ جائینگے، ھم یہ نہیں جانتے تھے کہ سوراج لینا بہت مشکل ھے جس کے لئے ایک بار عدم تعاون شروع کر دینے کے

بعد شاید ساری زندگی عدم تعاون ھی میں گذارنی پڑے،
اسکے لئے کانفرنس سے پہلے تک میں نے سوچا ھی نہیں
تھا اور نہ اسکے لئے تیار تھا لیکن جب کانفرنس نے یہ تجویز
منظور کرلی تو اسکی تکمیل چاھے جتنا وقت لگے اسوقت
عدم تعاون جاری رکھنے کا عزم و ارادہ کرنا ھی پڑیگا.

بہت دنوں بعد جب گاندھی جی سے اسکے متعلق بات چیت
ھوئی تو انھوں نے سمجھا دیا کہ دیکھنے میں خلافت اور
پنجاب کی باتیں اگرچہ چھوٹی معلوم ھوتی ھیں لیکن پھر بھی
برٹش گورنمنٹ ان کو اسوقت تک نہیں مانے گی، اور نہ
ھماری خواھش کے مطابق انصاف کرے گی. جب تک وہ
ھمارے ھاتھوں میں اختیارات سونپنے کے لئے تیار نہ ھوگی
اسلئے حصول سوراج کے مسئلے کا اضافہ کردینے سے ھم نے
اپنے مطالبہ کو برٹش گورنمنٹ کے لئے زیادہ مشکل نہیں
بنایا ھے بلکہ اپنے اور ملک دونوں کیلئے اسے زیادہ جامع
اور قابل عمل بنایا دیا، اسوقت میں محترم برجکشور بابو کی
دور اندیشی اور عملی قابلیت کا اور بھی قائل ھوگیا.

بہار کانفرنس کے بعد اور کانگریس کے اجلاس خصوصی

کے پہلے ھی گجرات میں صوبائی کانفرنس ہوئی. اس نے بھی عدم تعاون کی تائید کی. میں کلکتہ میں مخصوص اجلاس میں شریک نہ ہوسکا. ٹھیک اسی زمانہ میں اس بڑے مقدمہ کی بحث چل رھی تھی جس میں ہمارے فریق کی طرف سے پنڈت موتی لال نہرو بحث کرنیوالے تھے لیکن اسوقت کلکتہ کے دوسرے بیرسٹر مسٹر نوبندر ناتھ سرکار جو بعد میں ایڈوکیٹ جنرل اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے اور سر این این سرکار کے نام سے مشہور ہوئے، بحث کر رہے تھے، اور میں ان کی مدد کر رہا تھا دیس بندھو داس اس دوسرے فریق کی طرف سے بعد میں بحث کرنے والے تھے لیکن وہاں جو کچھ فیصلہ ہوا اس سے میں پورا متفق تھا کیونکہ وھی فیصلہ انہوں نے بہار کانفرنس میں کرلیا تھا، اب یقین ہوگیا. میرے لئے اب شاید یہ آخری مقدمہ ہوگا. کلکتہ اجلاس کے کچھ عرصہ بعد تک مقدمہ کی بحث چلتی رہی، لیکن اکتوبر کے مہینے کے شروع ہوتے ھی مقدمہ سے فرصت مل گئی. اب میں عدم تعاون کے کام میں لگ گیا. کانگریس کے اجلاس کے بعد بھی

« آل انڈیا کانگریس کمیٹی » کی نشست ہوئی جس میں عدم تعاون کے متعلق پرچار کا فیصلہ کیا گیا میں پنڈت موتی لال جی نہرو کے ساتھ ہی گیا تھا وہاں جو پروگرام پیش و منظور ہوا، ہم واپس آ کر اسی کے مطابق کام کرنے لگے ۔

نواں باب

نومبر سنہ ۱۹۲۰ میں نئے آئین کے موافق کونسلوں کا انتخاب ہونے والا تھا۔ کلکتہ کانگریس کے بعد کانگریس والے سب ہی جگہوں کی امیدواری سے دست کش ہوگئے۔ میں نے تو اس سے پہلے ہی خیال چھوڑ دیا تھا۔ اس کے متعلق اخباروں اور جلسوں کے ذریعہ خوب پرچار کیا گیا۔ لوگوں کو ووٹ دینے سے بھی منع کیا گیا۔ بہار میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔ باوجودیکہ امیدواروں کے بغیر کوئی جگہ خالی نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی ووٹ دینے والے بہت ہی کم شریک ہوئے۔ ایک تو اس قسم کا یہ پہلا انتخاب تھا۔ اس لئے کم ہی لوگ اس میں ووٹ دیتے۔ دوسرے جو ووٹ دیتے کانگریس کے پرچار سے ان میں سے بہت ہی کم شریک ہوئے۔ اس لئے جب کبھی کونسل کے ممبر کے

متعلق کوئی بات چیت ہوتی تھی - تو یہ سچائی کے ساتھ کہہ دیا جاتا تھا - کہ یہ لوگ ملك کے سچے نمایندے نہیں ہیں لیبرل جماعت کے لوگوں سے کانگریس کا اس جگہ اعلانیہ اختلاف ہوگیا - ان لوگوں نے صرف انتخاب ہی میں حصہ نہیں لیا - بلکہ انتخاب کے بعد نئے قانون کے اعتبار سے جو وزارت بنی اسمیں بھی آ کر شریک ہوگئے - اسطرح وہ نئے آئین کو کامیاب بنانے میں - جہاں تک ان سے ہوسکتا تھا - کوشش کرنے لگے - اگرچہ کانگریس کے مخصوص اجلاس میں عدم تعاون کا پروگرام منظور ہوچکا تھا - پھر بھی ایک بڑی جماعت تھی جو اس کو منظور نہیں کرتی تھی - وہ جماعت کانگریس کے سالانہ اجلاس کا - جو ناگپور میں ہونے والا تھا - اسلئے انتظار کر رہی تھی - کہ وہاں اسکو نامنظور کرا دیا جائیگا - بات یہ ہے کہ اس پروگرام کو لوگ پوری طرح سمجھتے نہیں تھے - اسلئے اسکو بیکار مانتے تھے - یہ اکثر سننے میں آتا تھا کہ اس سے برٹش گورنمنٹ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا - اسکے ساتھ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ لوگ اسکو نہیں مانیں گے - اور اگر مان بھی لینگے تو کسی طرح سے انہیں

کا نقصان ہوگا۔ برٹش گورنمنٹ کا نہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر کہا جاتا تھا کہ سارا پروگرام ناکام ہوگا۔

سرکاری خطابوں کو چھوڑنے کے متعلق کہا جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ یہ خطابات جن لوگوں کو دئے گئے ہیں۔ وہ اس جماعت سے متعلق ہیں۔ جو کانگریس سے تقریباً ہمیشہ الگ ہی رہی۔ وہ اس بات کو نہ مانیں گے۔ دوسرے اگر کچھ ایک دو آدمیوں نے اپنے خطاب واپس بھی کر دئے۔ تو اس سے برٹش گورنمنٹ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اصل یہ ہے کہ سارے پروگرام کی تہہ میں یہ بات رکھی تھی۔ کہ یا تو اس سے برٹش گورنمنٹ کا رعب و دبدبہ اس ملک میں کم ہوجائے یا جو لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے گورنمنٹ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ اسے چھوڑ کر اپنے اوپر بھروسہ کرسکیں۔ لوگوں کے دلوںمیں جو دھاک بیٹھی ہوئی ہے، وہ کسی طرح کم ہوجائے۔ اور وہ پوری بے باکی سے آزادی پر غور کرنا سیکھیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے منہ موڑ کر جنتا کی طرف رخ کریں۔ یہ صحیح ہے کہ خطاب تھوڑے ہی لوگوں نے چھوڑے۔ لیکن جنتا میں جو ان کے خلاف پرچار ہوا

اسکا نتیجه یه هوا که لوگوں کے دلوں میں جو ان کی عزت تھی - وہ گھٹ گئی، اسکا مطلب یه نہیں که کسی کے دل میں خطابوں کی عزت نہیں رهی، یا ان کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا، کچھ لوگ تو ایسے تھے هی، جو ان کی عزت کرتے رهے، اور ان کے حاصل کرنے کی خواهش کی وجه سے گورنمنٹ کو خوش کرنے کی کوشش میں لگے رهے، لیکن عوام میں ان کے بارے میں مخالفت نہیں تو حقارت کا جذبه ضرور پیدا هوگیا تھا، کہیں کہیں تو خطاب یافتوں کے ساتھ لوگوں نے بدسلوکی بھی کی، لیکن یه بدسلوکی پروگرام کا جز نہیں تھی، پروگرام تو صرف اتنا هی تھا. که برٹش گورنمنٹ کے دئے هوئے اعزاز کو لوگ اعزاز نه سمجھیں. اس مسئله میں پوری کامیابی هوئی، میرا خیال هے که عدم تعاون کے پروگرام کے دوسرے اجزاء سے زیاده اسی میں کامیابی هوئی، کیونکه اور باتوں کے متعلق بعد میں کچھ اختلاف رائے بھی هوا، لیکن اسکے متعلق کبھی کوئی اختلاف نہیں هوا، خطاب یافته لوگوں کے لئے روز بروز جذبۂ حقارت بڑھتا هی گیا.

کونسلوں کے متعلق بہت اختلاف تھا، کیونکہ سیاست سے تعلق رکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ کونسلوں میں میں شریک اور وزیر ہو کر. اگر ہم جنتا کی بھلائی نہ کر سکیں گے، تو کم سے کم کونسلوں میں رہ کر برٹش گورنمنٹ کی نیش زن چالوں سے ملک کو کسی حد تک بچاسکیں گے لیبرل جماعت و نیز دوسری جماعتوں کے لوگ. یا وہ جو کسی جماعت میں نہیں تھے. پہلے خیال کے تھے. یہی لوگ پہلے انتخاب اور انتخاب کے بعد وزارتوں میں شریک ہوئے، جو لوگ کانگریس میں رہ گئے تھے. وہ یہ کہتے تھے کہ انتخاب میں اگر کوئی حصہ نہ لیں اور کونسلوں کی کرسیاں سب کی سب خالی رہ جائیں. تو ہم اسطرح کے بائیکاٹ کو ایک طرح سے کامیاب مان سکتے ہیں. لیکن ایسا نہ اس انتخاب میں ہوا اور نہ آئندہ ہوسکتا تھا. اس لئے جب ملک کے کچھ لوگ منتخب ہوکر، خواہ وہ کتنے ہی کم ووٹوں سے سہی، کونسلوں کی جگہوں کو بھر دیں گے اور وہاں کام کریں گے تو اسوقت گورنمنٹ کہہ سکے گی کہ بائیکاٹ تو نہ ہوسکا، اور دنیا بھی اسی بات کو مانے گی. اسلئے کونسلوں

کے انتخاب میں حصہ لیکر اس قسم کی اصلاح کو کام میں لانے والے لوگوں کو ہرا دینا چاہئے۔ اسی وقت اپنی مرضی کے مطابق کام کر کے دنیا کو دکھا سکینگے۔ کہ یہاں ملک کے سچے نمائندے ہم ہیں۔ لیکن اس دفعہ کا انتخاب ہو چکا تھا اور اب جب تک تین سال کے بعد دوسرا انتخاب نہ ہو۔ اسکی کچھ اہمیت نہیں ہے۔ لیکن آئندہ چل کر اسکے متعلق آپس میں بڑا اختلاف ہوگیا.

وکالت اور بیرسٹری چھوڑنے اور عدالتوں سے عدم تعاون کرنے کے متعلق بھی زیادہ بحث نہیں رہی۔ کیونکہ اگر کوئی اسکو نہ چھوڑتا اور اسکی مخالفت کرتا۔ تو جنتا خود یہ سمجھ لیتی کہ اسکی ساری بحث خود غرضی کی وجہ سے ہے۔ چونکہ یہ خود وکالت چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسلئے اس پروگرام کی مخالفت کر رہا ہے۔ بہت بڑے بڑے لوگوں نے کام چھوڑنے کے بعد ہی اس پروگرام میں حصہ لینا مناسب سمجھا اسکا ایک تو یہ نتیجہ ہوا کہ تمام ملک میں بہت سے لوگ جو پہلے سے پبلک کام کیا کرتے تھے یا جن کو لوگ وکالت میں شہرت کی وجہ سے جانتے تھے۔ اپنا سارا وقت

دے کر عدم تعاون کے کام میں لگ گئے - اسکا جنتا پر بہت زیادہ اثر ہوا - اسوقت تک سب لوگوں پر یہ بات واضح نہیں تھی کہ کتنے دنوں تک کے لئے اپنا پیشہ چھوڑنا ہوگا - بہت سے لوگ تو جوش میں ہی آ کر شریک ہوگئے تھے - مہاتما جی نے کہدیا کہ ملک نے اگر پروگرام کو پورا کر دیا - تو ایک سال میں ہم سوراج لے سکتے ہیں - بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ پروگرام صرف ایک سال کے لئے ہے - ایک سال کے بعد تو سوراج ہو ہی جائیگا - اسوقت خاص طور سے کچھ کرنا کرانا نہیں ہوگا - لوگ مہاتما جی کی شرط کو بھول گئے اور سوچنے لگے کہ ١٩ دسمبر ١٩٢١ع تک تو سوراج مل ہی جائیگا - اسلئے بہت سے لوگ جو جوش میں وکالت چھوڑ کر آئے تھے سنہ ١٩٢١ کے بعد آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے پھر وکالت کرنے لگے - اسمیں ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا - کیونکہ بال بچوں کی پرورش کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہ تھا - ان کی اپنی اور ان کے گھر والوں کی زندگی ایسی بن گئی کہ وہ کوئی دوسرا کام کر کے گذر کر بھی نہیں سکتے تھے - پھر بھی

کچھ تو ہمیشہ کے لئے اس کام میں رہ ھی گئے ۔ اور بہت سے لوگ جو اسوقت واپس چلے گئے تھے ۔ سنہ ۱۹۳۰ میں پھر موقع آنے پر شریک ہوگئے۔

اس پروگرام میں عوام نے عدالتوں میں جانا نہیں چھوڑا کیونکہ آخر میں کسی طرح کا نقصان پہنچتے ھی عدالت کی پناہ لینی ضروری ہو جاتی ھے ، لوگ خاتمہ پر نقصان برداشت نہیں کر سکتے تھے ، ساتھ ھی بے ایمان لوگ اس بائیکاٹ سے ناجائز نفع اٹھا کر عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے والوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے تھے ۔ تو بھی ایک سال تک عدالتوں کا بائیکاٹ چلتا رہا ۔ جو آمدنی سرکار کو عدالتوں کے ذریعہ ہوتی تھی ، اسمیں خاصی کمی آ گئی ۔ ایک سال کی بات مان کر بہت سے لوگوں نے اپنے دعوے ملتوی کر دئے کہ ایک سال بعد دیکھا جائیگا ، جہاں پبلک میں زیادہ جوش تھا ، وہاں پنچایتوں کا کام کچھ دنوں تک بہت اچھی طرح سے چلا ، دونوں فریق کے لوگ پنچایتوں کے فیصلہ کو مان لیتے اور ان کے مطابق کام بھی کرتے تھے ، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی دیکھا گیا کہ ان پنچایتوں کے سامنے ایسے

ایسے دعوے بھی پیش کر دیے جاتے، جن کی سماعت کبھی عدالت میں بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر پنچائت کچھ نہ کر پاتی تو وہ لوگ اسکی شکایت کرتے: بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ عدالتوں کا دبدبہ بھی بہت کم ہوگیا. وکالت کا پیشہ جس کی بڑی عزت تھی، کچھ دنوں کے لئے کم سے کم اگر اس کا بائیکاٹ نہیں ہوا تو ذلیل ضرور ہوگیا تھا.

سرکار اور سرکار سے تعلق رکھنے والے اسکولوں کے مسئلہ میں سب سے زیادہ اختلاف رہا۔ اس پروگرام کی تہہ میں یہ بات تھی کہ انگریزی تعلیم نے ملک کے تصورات کو یکبارگی بدل دیا ھے۔ صرف خیال ھی نہیں بلکہ دماغ بھی بدل گئے ھیں، ذریعہ تعلیم انگریزی ہونے کی وجہ سے اپنی زبان کے ساتھ لوگوں کا تعلق بھی چھوٹ گیا، اسکے ذریعہ سے برٹش نے ھمارے اوپر صرف سیاسی سیادت ھی نہیں بلکہ دماغی اور اخلاقی سیادت بھی قائم کردی۔ تعلیمی نصاب بھی ملک کی خواھش کے اعتبار سے نہیں بنایا گیا۔ اس میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ھے کہ ان درسگاھوں کے ذریعہ سے برٹش کاروبار چلانے کے لئے ھندوستانی کلرک

تیار کر لئے جائیں۔ جیسا کہ میکالے نے سوچا تھا کہ تعلیم کے ذریعہ سے ایسے لوگ تیار کئے جائینگے جو شکل و صورت میں ہندوستانی رہتے ہوئے اندر سے انگریزیت سے بھرے رہیں گے۔ اس لئے جب تک یہ طریقہ نہ بدلا جائے دماغی غلامی نہیں جاسکتی۔ اور اگر دماغی غلامی نہ چھوٹی تو سیاسی غلامی بھی دور نہیں ھوسکتی۔ مگر مروجہ طریقہ کے خلاف یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگرچہ اتنے دنوں سے انگریزی تعلیم دی جارہی ھے، مگر پھر بھی قدیم زمانہ میں علم کے ذریعہ دنیا کو جو یوروپ کی دین ھے، خاص کر اس علم کی اصلی شکل کو یہاں کے تعلیمی طریقہ میں بہت کم مقام دیا گیا، کیونکہ برٹش راج چلانے کے لئے ہندوستانیوں میں اس علم کی اتنی ضرورت نہیں تھی، ممکن ھے کہ یہ بھی خیال کیا گیا ہو کہ اگر ہندوستانی اس میں کامل ہو جائینگے تو یوروپ اور خصوصاً انگلینڈ کے صنعتی پیشوں میں بھی مقابلہ کرنے لگ جائینگے۔

اس پروگرام کی مخالفت میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر ان علمی اعزازوں کو جن کا تعلق گورنمنٹ سے تھا، چھوڑ

دیا جائے، تو تعلیم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رہ جاتا، اگر اس پروگرام کو پورا کر لے تو بچوں کو جاھل ھی رھنا پڑیگا. کچھ لوگ اس بات کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ انگریزوں نے تعلیم ھی کے ذریعہ ھم پر اخلاقی اور دماغی سیادت حاصل کی ھے؛ مجھے یاد ھے کہ « اڑیسہ » میں میں مہاتما جی کے ساتھ سفر کر رھا تھا، ایک جاسہ میں کسی نوجوان دوست نے یہ سوال کر دیا کہ آپ اس تعلیم کی کیوں اتنی برائی کرتے ھیں، کیا اس تعلیم سے « لوکمانیہ تلک » اور آپ جیسے لوگ نہیں پیدا ھوئے. کیا یہ ساری تحریک سوراج اسی تعلیم کا نتیجہ نہیں ھے؟ مہاتما جی نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا چاھتا لیکن « اوکمانیہ تلک » کا جو نام لیا گیا ھے تو کون کہہ سکتا ھے؟ کہ ان کا دماغ اگر انگریزی تعلیم کے بوجھ سے دب نہ گیا ھوتا اور دیسی زبان کے ذریعہ سے اسے پھلنے پھولنے کا موقع ملتا تو وہ اور کہاں تک پہنچ جاتا، مثال میں انہوں نے کہا اگر غور کر کے دیکھا جائے تو « لوکمانیہ تلک » بہت بڑے آدمی

ہونے پر بھی آج کی دنیا کے لئے تبلیغی اور ترقی کے ذرائع ہوتے ہوئے بھی اتنا مظبوط و مستقل و وسیع پیمانہ پر کام نہیں کرپانے جتنا پرانے زمانے کے شنکر اچاری یا حال کے تلسی داس اور کبیر داس کر گئے ہیں. اور جن کے اعمال آج ہر گھر میں رائج ہیں، سوراج کے متعلق جو تحریک ہوئی ہے وہ اور بھی کہیں زیادہ زور دار ہوتی، اگر ملک ان دماغی بندھنوں سے نجات پائے ہوئے ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہم ابھی تک جو کچھ کرتے آئے ہیں، ایک طرح سے یوروپ کی نقل ہے، ہماری جو حالت ہے اسمیں ہم کو اپنا راستہ نکالنا ہوگا اور وہی نرالا ہوگا، وغیرہ وغیرہ.

میں نے اس پروگرام کو بھی مان لیا تھا، اس کے مطابق اپنے گھر کے بچوں کو سرکاری سکول اور کالج سے ہٹا لیا تھا، انہیں پھر کبھی وہاں نہ جانے دیا، اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ وہ آج سوراجی سرکار کے دفتروں میں بھی کسی یونیورسٹی کی چھاپ (ڈگری) نہ رہنے کی وجہ سے کوئی نوکری چاہیں بھی تو نہیں پاسکتے، لیکن میرے دل میں کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ گیا تھا، وہ شک مندرجۂ بالا گفتگو

سننے کے بعد بالکل دور ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی میں نے ملکی تعلیم کی تبلیغ میں حصہ لینا پوری طرح شروع کر دیا تھا۔ بہار میں «مہا ودّیالیہ» ملکی «ودّیا پیٹھ» اور بہت سے مدرسے اور مکتب قائم کرنے اور کرانے اور ہزاروں طالب علموں کو سکول اور کالج چھوڑ دینے میں پوری مدد بھی دی تھی؛ لیکن دل و دماغ کے ایک کونے میں شک و شبہ کی تھوڑی سی مقدار اپنا مقام رکھتی تھی۔ وہ اڑیسہ ہی میں دور ہوئی۔ اب جتنا سوچتا ہوں مہاتما جی کی اسکے متعلق دور اندیشی اور گہری سمجھ کا اپنے تئیں قائل مانتا ہوں۔ آج ہمیں سوراج حاصل ہے۔ اور ملک کی قسمت ہمارے ہاتھوں میں ہے، پھر بھی ہم اپنی تعلیم اور دماغی بندھن کی وجہ سے یوروپی اثر سے اب تک الگ نہیں ہو سکے ہیں آج بھی ہمارے سامنے چیزوں کے ناپنے کے لئے کوئی ترازو اگر ہے تو وہ یوروپی ترازو ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کو خوامخواہ کوئی دوسری ترازو رکھنا چاہئے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ آج تک ہم اتنے بندھے ہوئے ہیں کہ دوسری ترازو کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتے مثال کیلئے

آئین کی بات لے لیجئے کہ آج ہم کو پورا اختیار ھے کہ ہم جو آئین بنانا چاھیں وہ بنا سکتے ھیں۔ لیکن ہم نے جو مسودہ تیار کیا ھے اس میں مغربی قوانین کی ھی نقل ھے۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ھے جس کے متعلق ہم کہہ سکیں کہ دنیا کے سامنے ہم یہ ایك نئی چیز پیش کر رھے ھیں، ایك ھی مسئلہ کو لے لیجئے، ہم اھل ملك کے متعلق کہتے ھیں کہ ہم نے یہ سوچا ھے کہ بالغ رائے دھی ضروری ھے جس کا مطلب یہ ھوتا ھے کہ قانون میں جاھل اور عالم، سادھو اور چور، خوش چلن اور بد چلن ان سب کی عقلوں کی ایك ھی قیمت ھے، صرف یہی نہیں بلکہ جو نمائندے منتخب ھوکر ھماری لیجسلیٹو کونسلوں (قانون ساز کونسلوں) میں بھیجے جائیں گے۔ اور جن پر ملك کی حکومت کا بوجھ ھوگا، ان میں بھی کوئی خصوصیت نہیں ھونی چاھئے۔ کوئی آدمی خواہ کتنا ھی ناقابل کیوں نہ ھو، وہ ناقابلیت چاھے جہل کی وجہ سے ھو یا بدچلنی کی وجہ سے وہ منتجب ھونے اور جنتا کی نمایندگی کا حق رکھتا ھے۔ ہم چاھتے ھیں کہ ملك کی ترقی ھو۔ اس میں رونق ھو

لیکن کیا اس کے لئے علم اور کردار دونوں کی ضرورت نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کے لئے ہم قانون میں کوئی جگہ نہیں دے رہے ہیں کیوں کہ مغربی قوانین میں اسکی کوئی مثال نہیں ملتی، اگر ہم کوئی چیز ایسی نکالتے ہیں، جن میں علم اور کردار بلکہ علم سے بڑھکر کردار کو ملکی حکومت میں اگر خاص مقام ملتا تو یہ ہماری ایک دین ہوتی۔ ابھی تک ہم کچھ نہیں سوچ پائے ہیں۔ کیونکہ ہمارے دماغ جدید تصورات سے جو مغربی تصورات کے عکس ہیں اتنے زیر اثر اور دبے ہوئے ہیں کہ ان کے باہر ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں، ہمارے خیالات وہاں تک پہنچ نہیں سکتے، اس میں ہمارا قصور نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری تعلیم کا پھل ہے۔

ایک دوسری چھوٹی سی بات لے لیجئے۔ آپ جہاں کہیں جاتے ہیں وہاں یہی دیکھتے ہیں کہ لوگ اس زمانے کی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی مصنف اور شاعر ہے۔ تو اس کو یا تو ترقی پسند یا قدامت پرست کا لقب دے دیا جاتا ہے، اسی طرح سے کوئی سیاسی میدان میں کام کرنے والا

ھے تو اسے ترقی پسند یا قدامت پرست یا آزادی پسند کہا جاتا ھے اور اگر کچھ غور کر کے دیکھا جائے تو یوروپی تصورات سے جو لوگ متفق نہیں ھیں وہ ترقی پسند و تجدد پسند نہیں ھیں وغیرہ مطلب یہ ھے کہ رفتار زمانہ کی ترازو ھم نے وھی مان لی ھے جو یوروپ نے مانی ھے - جتنے اختلافات وغیرہ یوروپ کے تصورات میں پیدا ھوتے ھیں ان سب کا اثر ھمارے خیالات پر بھی پڑ گیا ھے - اس لئے ھندوستان کے قدیم تصورات تو سب کے سب پرانے ھی ھیں لیکن جو یوروپی ترازو سے ترقی پسند بھی ھیں ان میں بھی اختلافات ھیں - یعنی کوئی ترقی پسند اور کوئی قدامت پسند - کیا رفتار زمانہ کے معلوم کرنے کی کوئی دوسری ترازو نہیں اور اگر ھوسکتی ھے تو کیا ھم اسے ماننے کے لئے تیار ھیں - ھماری تعلیم ھی ھم کو نا اھل بنا دیتی ھے اس لئے ھم دوسری ترازو کام میں نہیں لاسکتے .

دسواں باب

ناگپور کانگریس سے پہلے مہاتما جی نے علی برادران کے ساتھ دورہ شروع کیا۔ کونسل کا کام ہوچکا تھا۔ اب خاص کر کالجوں سے طالب علموں کے نکالنے ھی کا کام جاری تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے وھاں عدم تعاون کی سب ھی باتیں بتاتے۔ اسی دورے میں سب سے پہلے لوگوں نے ان کو دیکھا۔ جو آئندہ چل کر گاندھی جی کے ساتھ سب ھی سفروں میں دیکھنے میں آئے۔ بہت بڑے بڑے جلسے۔ راستے میں لوگوں کا ھجوم۔ ایک ایک دن میں کئی کئی جلسے وغیرہ۔ دسمبر میں بہار بھی وہ پہنچے کئی اضلاع میں گئے میں ان کے ساتھ تھا۔ اس وقت انہوں نے قومی اسکول کھولنے کی ھدایت کی۔ پٹنہ میں قومی اسکول کھولا گیا بہار میں بڑی ھلچل تھی۔ ایک دن سرکاری پٹنہ کالج کے

بہت سے طلباء نکل کر ہمارے پاس چلے آئے۔ ان کو لے
کر مہا ودیالیہ کھول دیا گیا۔ اس سے چند دن پہلے ہی
انجینیرنگ اسکول کے طلباء اسکول چھوڑ کر اور جلوس بنا
کر مظہرالحق صاحب کے گھر پہونچ گئے تھے۔ جہاں آج
صداقت آشرم ہے وہاں ان دنوں آس پاس دور تک کوئی
بستی نہیں تھی۔ سڑک کے کنارے آم کے باغ ہی
تھے۔ جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ رات میں
وہاں آنا جانا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انہیں
میں سے ایک باغیچہ میں ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے
مالک کو مظہرالحق صاحب جانتے تھے اس سے اجازت لے
کر وہ لڑکوں کے ساتھ وہیں جا کر رہنے لگے۔ اس طرح
صداقت آشرم کی بنیاد پڑی۔ ہم لوگوں نے چمپارن میں اسکول
کھولنے کے لئے کچھ روپے جمع کئے تھے میں اوپر بتا چکا
ہوں کہ گاندھی جی نے ہمارے کالج کھولنے کی تجویز کو
ناپسند کردیا تھا۔ اسلئے کام بند ہوگیا تھا لیکن روپے ابھی
پڑے ہوئے تھے۔ انہیں روپوں سے اور کچھ نوجوان
جوشیلے لوگوں کو ساتھ لیکر جو قومی مدرسے میں کام

کرنے کے لئے تیار تھے ہم نے قومی مہا ودیالیہ کھول دیا تھا۔ اس میں پرانے طریقہ سے تقریباً انہیں مضمونوں کو جو سرکاری کالجوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ ہم نے بھی پڑھانا شروع کردیا۔ اس بات پر لوگوں کا زور تھا کہ ہم کو ودیالوں میں امتحان لینا چاہئے ان کا کہنا تھا کہ بہت سے طالب علم جو اسکول اور کالجوں کو چھوڑ کر نکلے ہیں۔ اپنے لئے امتحان کا انتظام نہ دیکھکر مایوس ہوجائینگے اس لئے ہمکو اسکول اور کالج بھی کھولنے چاہئیں اور ساتھ ھی امتحان لینے اور ان سب کو ایک ساتھ اور متحد کرنے کیلئے امتحان لینے والی یونیورسٹی جیسی درسگاہ بھی کھول دینی چاہئے۔ میں اس مسئلہ میں کچھ زیادہ پرجوش نہیں تھا میرے دل میں ڈر ہوتا تھا کہ اتنے لوگ جو تقریباً جوش کی لہر میں بہہ کر اسکول اور کالج چھوڑ رہے ھیں۔ ایک تو وہ بہت دنوں تک ٹھہریں گے نہیں۔ دوسرے ہم ان کیلئے کافی انتظام بھی نہیں کرسکیں گے۔ ہمارے مدرسوں میں پڑھے ہوئے طالب علموں کو نوکریاں بھی نہیں ملیں گی آئندہ چل کر یہ ایک بڑا مسئلہ ہو جائیگا۔ اسلئے اگرچہ میں نے

پروگرام کو مان لیا تھا اور اس کے مطابق کام بھی کرنا شروع کردیا تھا لیکن پھر بھی وہ پورے اعتماد کے ساتھ نہیں تھا۔

جب گاندھی جی پٹنہ آئے تو ان سے میں نے اسیوقت کہدیا تھا کہ مدرسہ تو کھل گیا اور کچھ دنوں تک اس کو چلا لیجانے کیلئے ھملوگوں کے پاس رقم بھی موجود ھے۔ لیکن اسکے بعد رقم کی دقت ھوگی اسلئے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کہاں سے رقم جمع کرسکوں گا۔ گاندھی جی نے اسی وقت کہا تھا کہ رقم کیلئے کچھ فکر نہ کرو۔ کہیں نہ کہیں سے آ ھی جائیگی۔ کام ٹھیک طرح سے چلنا چاھئے۔ ابھی تک پبلک کاموں کیلئے بہار میں چندہ سے بہت روپے جمع نہیں کئے گئے تھے۔ میں نے بھی کسی کام کیلئے چندہ جمع کر کے بہار میں کوئی کام نہیں کیا تھا لیکن مجھے دو ایک باتیں معلوم تھیں جن سے میں بہت ڈرتا تھا۔ ناگپور کانگریس سے پہلے کانگریس کا ایک اصول تھا جس کے اعتبار سے ھر ایک صوبہ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا خرچ چلانے کے لئے ھر سال ایک رقم دینی پڑتی تھی۔ بہار کو بھی شاید پندرہ سو (۱۵۰۰) روپے ھر سال دینے پڑتے تھے۔

لیکن یہ رقم کبھی پوری ادا نہیں ہوتی تھی - بہت تقاضا ہونے پر بڑے بڑے لوگ سو دو سو روپے چندہ کر کے بھیج دیا کرتے تھے - پھر بھی بڑی رقم ہمیشہ باقی رہتی تھی - کلکتہ سے پٹنہ جانے کے بعد میں صوبائی کانگریس کمیٹی کا وائس پریسیڈنٹ ہو گیا تھا؛ میں جانتا تھا کہ اس رقم کی ادائیگی میں کتنی دقت ہوتی تھی - دوسری بات جس نے مجھے ڈرا دیا تھا یہ تھی کہ پہلے پہل جب پٹنہ میں کانگریس کا اجلاس سنہ ۱۹۱۲ میں ہوا، تب خرچ کیلئے مجلس استقبالیہ کافی روپیہ جمع نہ کر سکی تھی - مجلس استقبالیہ کے صدر « شری سچدانند سنہا » کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی تھی - جب ایک باقاعدہ طور سے ودیالیہ کا ماہوار خرچ چلانے کا سوال ہوتا تھا - اس وقت میں گھبراتا تھا - اس کام کو اٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن مہاتما جی کے کہنے پر میں نے فوراً اس کام کو بھی شروع کر دیا تھوڑے دنوں کے بعد مہاتما جی کا تار ملا کہ وہ پھر آ رہے ہیں - اس موقع پر ودیاپیٹھ کا افتتاح کیا جائے؛ روپے کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ اچھی رقم ساتھ لا رہے ہیں، بات یہ

تھی کہ مہاتما جی بنگال سے جھریا آئے تھے وہاں ساٹھ ستر ہزار (۶۰۰۰۰ ۔ ۷۰۰۰۰) کی رقم کوئلے کی کان کے مالکوں نے ان کو دی تھی وہ رقم انہوں نے ودیاپیٹھ چلانے کیلئے ہم کو دے دی۔ اب رقم مل جانے کے بعد کم از کم کچھ دنوں کیلئے رقم کی طرف سے بے فکر ہوگئے ہم لوگوں نے خوشی خوشی ودیاپیٹھ کو بھی قائم کردیا۔ کانگریس کا سالانہ جلسہ دسمبر کے مہینے میں بڑے دن کی تعطیلات میں ہوا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ کا اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا وہاں بڑے دھوم سے یہ اجلاس ہوا۔ کانگریس کے اصول کے اعتبار سے نمائندوں کی تعداد پر کوئی روک نہ تھی: اسلئے جس صوبہ سے جتنے نمائندے بھیجے جا سکے وہ سب شریک ہوئے۔ عدم تعاون کا پروگرام کلکتہ کے مخصوص اجلاس میں منظور ہو چکا تھا: لیکن ناگپور میں اس پر دوبارہ بحث ہونے والی تھی۔ ناگپور کے اجلاس میں میں سمجھتا ہوں نمائندوں کی تعداد اتنی تھی جتنی کسی بھی دوسرے اجلاس میں نہیں ہوئی۔ کافی بحث کے بعد آخر میں عدم تعاون دوبارہ منظور ہوا۔ میں صوبوں میں اکثر

بیمار ہو جایا کرتا تھا۔ اس سال بھی گاندھی جی کے ساتھ چند دنوں بہار میں سفر کرنے کے بعد بیمار پڑ گیا۔ اس وجہ سے ناگپور کانگریس میں شریک نہ ہو سکا جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں۔ عدم تعاون پروگرام میں ایک مسئلہ تھا جس کے کافی اختلاف تھا لیکن ایک طرح سے انتخاب ہو جانے کی وجہ سے کم از کم دو سال کے لئے یعنی جب تک دوسرے انتخاب کا زمانہ نہ آئے۔ اب وہ اختلاف زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اسلئے پروگرام کی منظوری میں آسانی ہو گئی تھی۔ کانگریس کے بعد عدم تعاون کا پرچار بہت زور کے ساتھ سارے ملک میں ہونے لگا۔ کانگریس کے لئے جو نیا آئین بنا اس کا اور چرخہ اور کھدر کا پرچار بھی ساتھ ساتھ ہونے لگا۔ بہت سے قومی ادارے کھل گئے۔ جگہ جگہ درسگاہوں کا افتتاح ہوا۔ پنچایتیں آپس کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے لگیں۔ جگہ جگہ شراب بندی کا پرچار بھی ہونے لگا۔ کافی جوش تھا۔ اسکول اور کالج کے طلباء بڑی تعداد میں نکل آئے۔ کچھ تو قومی درسگاہوں میں تعلیم پانے لگے اور بہت سے لوگ پرچار کے کام میں بھی لگ گئے۔ اسی طرح

بہت سے قانون پیشہ لوگ بھی جن میں وکیل، مختار، بیرسٹر سب ہی درجہ کے لوگ تھے اس کام میں مصروف ہوگئے بہار میں جہاں پہلے شاید گنتی کے دو چار آدمی بھی اپنا سارا وقت دے کر ملک کا کام نہیں کر رہے تھے۔ دفعتاً وہاں ہزاروں آدمی ایسے نکل آئے جو اپنا سارا وقت اس کام میں صرف کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے صوبہ کے کونے کونے میں کام کرنے والے پہنچ گئے۔ وہ لوگ عدم تعاون کے پیام کے ساتھ ساتھ سوراج۔ کھادی اور شراب بندی کا بھی سندیس گاؤں گاؤں پہنچانے لگے میں سمجھتا ہوں کہ اس سال شاید ہی کوئی گاؤں ایسا بچا ہوگا۔ جہاں کانگریس کا "کارکن" نہ پہونچا ہو اور جہاں گاندھی جی کا نام اور کانگریس کا پیام نہ پہونچا ہو۔

میں سارے صوبہ کا دورہ کرنے لگا۔ پہلے تو صرف چند ضلعوں ہی سے تعلق تھا لیکن اس سال سنۂ ۱۹۲۰ میں سارے صوبے کے تقریباً سب ہی "سب ڈویژنوں" میں گیا بہت سے تھانوں میں بھی پہونچا۔ اکثر گاؤں تو راستے ہی میں آ گئے۔ اس طرح سارے صوبہ سے واقف ہوگیا جہاں

کہیں میں جاتا وہاں بڑے بڑے جلسے ہوتے میں اس سے پہلے زیادہ تقریریں کرنیکا عادی نہیں تھا، لیکن اس سال اتنی تقریریں کرنی پڑیں کہ اب زبان کھل گئی تھی۔ گھنٹوں تقریر کرنے کی عادت پڑچکی تھی۔ اس زمانہ میں دس بیس ہزار آدمیوں کا جلسہ اکثر ہوجایا کرتا تھا۔ ابھی اس وقت تک «لاؤڈ اسپیکر» رائج نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بڑے بڑے جلسوں مین اپنی آواز ھی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ میں پانچ ھزار تك کے مجمع میں بغیر دقت محسوس کئے ہوئے بول سکتا تھا۔ دس ھزار سے زیادہ ہونے پر ذرا محنت پڑتی تھی۔ بیس کے اوپر ھو جانے پر مشکل ھو جاتی تھی اور آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ مہاتما جی علی برادران کے ساتھ سارے ملك کا چکر لگا رہے تھے بہار سے جانے کے بعد وہ اور اور صوبوں میں بھی سفر کرتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اڑیسہ پہنچے۔ وہاں میں بھی ان کے ساتھ ھو لیا وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شریك ہونے کیلئے «بجوڑہ» چلے گئے۔ میں بھی ساتھ ھی ساتھ گیا۔ رات میں لوگ چلتی ریل گاڑی کے بھی

درشن کرنے آیا کرتے تھے۔ جن اسٹیشنوں پر گاڑی نہیں ٹھہرتی ان پر بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ درشنوں کے لئے جمع ہوجاتے اور چلتی گاڑی ھی کو دیکھ کر قناعت کر لیتے۔ دن کو ریلوے لائن کے قریب لوگ کھڑے رہتے اور چلتی گاڑی ھی کو دیکھ کر تسکین حاصل کر لیتے۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھکر تلسی داس جی کا وہ بیان یاد آجاتا تھا جو انہوں نے «شری رام چندر جی» کے بن باس کے متعلق کیا ھے۔ بھواڑہ میں طے کیا گیا کہ تلک سوراج فنڈ کے لئے ایک کروڑ روپے تیس جون تک جمع کر لئے جائیں۔ کانگریس کے ممبر اور چرخے بھی کم از کم دس لاکھ کر دئے جائیں۔

اپنے صوبہ سے باھر جانے کا یہ میرے لئے پہلا موقع تھا۔ مہاتما جی بڑے بڑے پبلک جلسوں کے علاوہ مقامی کارکنوں سے جس طرح ملتے اور باتیں کرتے وہ قریب سے اس تحریک میں دوبارہ دیکھنے کو ملا۔ چمپارن میں ان کے عمل کی طاقت اور محنت کو دیکھ کر ھم حیران رہتے تھے لیکن وھاں کا سارا کام۔ بغیر کسی پبلک جلسے ھی کے

ہوا تھا اور اب تو کام کرنے والوں سے باتیں بھی ہوتیں۔ تو وہ بھی ایک پبلک جلسے ہی کی شکل اختیار کر لیتیں۔ اِسمیں اور اُسمیں بہت فرق تھا۔ لیکن مہاتما جی کا طریق کار ایک ہی تھا۔ گو اسکی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ وہ برٹش گورنمنٹ کی شکایت زور دار الفاظ میں کیا کرتے تھے، کہیں کہیں اسے شیطانی سلطنت بھی کہا تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہیں کہیں رکاوٹ بھی پڑتی تھی۔ بہت سے لوگ گرفتار بھی ہوئے خاص کر شراب بندی کے سلسلے میں۔ لیکن دو باتوں کی بہت تاکید تھی۔ ایک تو یہ کہ اہنسا (عدم تشدد) پر خوب زور دیا جائے تا کہ کہیں بلوہ اور فساد نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ ابھی اپنی طرف سے کوئی قانون توڑنے کا کام نہ کیا جائے۔ لوگ اپنے جوش میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ اب قانون توڑنے کا حکم دیا جائے لیکن مہاتما جی ان کو برابر روکے جارہے تھے۔ بھواڑے کے جلسے کے بعد جو پروگرام وہاں مرتب کیا گیا۔ اسکو پورا کرنے میں ہم لوگ مصروف ہوگئے۔ مہاتما جی ابھی ستیہ گرہ کرنی نہیں چاہتے تھے۔

کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ابھی لوگوں میں اگرچہ یہ
جوش بہت ھے لیکن پھر بھی انہوں نے ابھی پورا طریقہ
نہیں سیکھا ھے۔ ان کو شاید اسکا بھی اندیشہ تھا کہ ستیہ
گرہ کی وجہ سے جو سختی ھوگی اسکو عدم تشدد پر رہ کر
لوگ برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔ اسلئے ابھی وہ روک تھام
کرتے تھے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ بھی کہدیا تھا کہ
ھمارے بنائے ھوئے پروگرام کو لوگ پورا کردیں تو ایک
سال کے اندر ھی ھم سوراج لے سکتے ھیں۔ لوگوں کے
دلوں پر اسکا بھی بڑا اثر ھوا۔ شرط کو تو لوگ بھول گئے۔
لیکن ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ع کو اپنے دلوں میں لوگوں نے
سوراج کے قیام کے لئے مقرر کردیا۔ میں نے "دیش" کے
نام سے ایک ھفتہ وار اخبار کچھ دن پہلے پٹنہ سے جاری
کیا تھا۔ اسکے ایڈیٹر کی جگہ میرا نام چھپتا تھا۔ اگرچہ
کبھی کبھی مضمون لکھ دینے کے علاوہ میں اور کچھ
نہیں کرتا تھا۔ اسمیں کسی نامہ نگار کے بھیجے ھوئے ایک
خط یا خبر کی اشاعت ھوگئی جس میں کسی کی شکایت تھی،
اسلئے اس نے مجھ پر فوجداری کا مقدمہ چلا دیا۔ مجھے

آرہ کے مجسٹریٹ کی کچہری میں حاضر ہونا پڑا۔ دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ شکایت غلط اور بے بنیاد تھی۔ اسلئے غلطی مان کر معافی مانگ لینے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن یہ سوال بھی سامنے آیا۔ کہ مجھ جیسے آدمی کے لئے معافی مانگنے کا صرف مطلب یہ لیا جائیگا کہ جیل سے بچنے کے لئے میں نے ایسا کیا۔ اس کا بہت برا اثر دوسرے کام کرنے والوں پر پڑیگا۔ میں اس دبدھا اور مشکل میں پڑ گیا کہ اگر میں اپنی غلطی کا اقرار نہیں کرتا ہوں تو یہ جھوٹا طریقہ ہونے کے علاوہ اس آدمی کے ساتھ بڑی بے انصافی بھی ہوگی۔ جسکی غلط شکایت چھپ گئی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی مطلب اسکا نکالا جائے مجھے سچی بات ہی کہنی چاہئے اس ارادے پر پہنچنے میں مظہرالحق صاحب اور بابو برجکشور پرشاد نے میری مدد کی اور میرے دل کو مضبوط بنایا۔ میں گاندھی جی سے سنا کرتا تھا کہ سچائی میں اگرچہ بظاہر وقتی نقصان بھی معلوم ہوتا ہو تو اس سے گھبرانا نہ چاہئے اور اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہئے کہ آخر میں اس

سے نفع ہی ہوگا اور نقصان نہ ہوگا۔ میں نے معافی مانگ لی اور ساتھ ہی یہ بھی میں نے کہدیا کہ سچائی کی بنیاد پر معافی مانگنی چاہتا ہوں سزا سے بچنے کے لئے نہیں۔ اسکے بعد مقدمہ اٹھا لیا گیا۔ پس یہ بات وہیں ختم ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ کام کرنے والوں پر اسکا کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ مجھے جو خوف پیدا ہوا تھا وہ بے بنیاد تھا۔ بجواڑے کا پروگرام ۳۰ جون تک ناقص شکل میں پورا ہوا۔ ایک کروڑ سے زیادہ روپے جمع ہوگئے۔ کانگریس ممبروں کی تعداد بھی کافی ہوگئی۔ لیکن چرخوں کا کام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اور پورا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس چیز کے جاننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے۔ اسکا پروگرام بھی ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں جوش میں لوگوں نے چرخے بنائے جو آخر میں کسی کام کے لائق نہ نکلے۔ سوت تیار کرایا گیا مگر ان سے کپڑا وغیرہ بنوانے کا مناسب انتظام نہ ہونے اور خود سوت بھی بنائی کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے بہت برباد ہوا۔ مہاتما جی نے اس پر خاص طور سے آرڈر دیا تھا کہ قومی اسکولوں میں چرخہ کو بڑا مقام دیا

جائے انہوں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ « ودیاپیٹھوں » کو بھی چرخے کے ھی مرکز مان کر سارے تعلیمی کاموں کو سنوارنا چاھئے - چرخے سب ھی قومی اسکولوں میں جاری تو کئے گئے - لیکن وھاں بھی ان کی صحیح تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی - یہ پروگرام مردہ ھی سا رہا - ودیاپیٹھوں کے چلانے والے اکثر تعلیمی طبقہ کے ایسے ھی لوگ تھے جو کتابی تعلیم کو زیادہ اھمیت دیتے تھے - چرخہ کے بارے میں نہ تو ان کا یقین تھا اور نہ انہیں اسکا علم - جہاں کوئی ایسا پڑھانے والا مل گیا جس کو اسمیں کوئی خاص دلچسپی تھی وھاں پروگرام خوب چلا - لیکن بیشتر جگہوں پر اگرچہ رہا تو لیکن مردہ ہوکر، روپے ھاتھ میں آ گئے تو اس وقت اسمیں سے ایك اچھی رقم لگا کر کہیں کہیں کھادی تیار کرانے کا کام شروع کیا گیا - ایسی جگہوں پر جہاں لوگ چرخہ کو بھولے نہیں تھے اسمیں کامیابی بھی ہوئی اور کھادی بننے لگی - بہار میں یہ کام خوب چلا - مجھے یاد ھے کہ ایک مہین دھوتی جو مجھے چرخے کے سوت کی بنی بتائی گئی تھی - مہاتما جی

کے سامنے میں نے پیش کی۔ مولانا محمد علی اسے دیکھ کر
بہت خوش ہوئے۔ مہاتما جی بھی بہت خوش تھے۔ اور
اب جب میں سب باتوں پر غور کرتا اور یاد کرتا ہوں کہ
اسکے کئی سال بعد اس طرح کا مہین سوت تھوڑی مقدار
میں بہار میں تیار ہوتا رہا تو مجھے آج خیال ہوتا ھے کہ
ہم یہ بتا کر اس وقت شاید ٹھگے گئے تھے کہ کھادی کا کام
اچھا چلنے لگا.

جس وقت ھندو اور مسلمان دونوں ھی بڑے جوش کے
ساتھ عدم تعاون میں شریك تھے۔ دونوں میں سب ھی
کاموں میں ایک طرح کے مقابلے کی رقابت ھوجاتی، سب
جگہوں میں کانگریس کے علاوہ خلافت کمیٹیاں قائم ھوگئیں
اور جوش کے ساتھ ھندوؤں نے خلافت کمیٹیوں کو منظم
کرنے اور چندہ جمع کرنے میں مدد کی۔ مسلمان تو کانگریس
میں ھوتے اور مدد کرتے ھی تھے۔ ایسا معلوم ھوتا تھا کہ
یہ ایکا اور اتحاد کبھی ٹوٹنے والا نہیں ھے۔ بہت سے
لوگ ایسا بھی خیال کرتے تھے۔ بقرعید کا دن ایک ایسا
دن ھوتا ھے۔ جب خاص کر ھند میں گائے کی قربانی کی

وجہ سے ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑے ہوجایا کرتے ہیں۔ اس سال جب بقر عید کا دن قریب آیا تو سب کو یہ فکر ہوئی کہ اس اتحاد میں کوئی رکاوٹ نہ پڑنے پائے۔ گاندھی جی مولانا محمد علی کے ساتھ پھر دورہ کرنے آئے، کئی دن تک مختلف اضلاع میں پھرتے رہے۔ سب ہی مقامات پر ان کی مولانا کی تقریریں ہوئیں۔ انہوں نے گائے کی "رکھشا" اور حفاظت مسلمانوں پر چھوڑ دی، مسلمانوں کی طرف سے اعلان نکالے گئے کہ جہاں تک ہو سکے گائے کی قربانی نہ ہونی چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال بقرعید میں گائے کی قربانی اتنی کم ہوئی کہ اس سے پہلے شاید کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے اتحاد اور ایکے پر اور بھی مضبوطی کی مہر لگ گئی لیکن بعد میں ایسا معلوم ہوا کہ یہ اتحاد مستقل نہیں تھا۔ مہاتما جی اور علی برادران کے متحدہ دورے کے ختم ہونے سے پہلے ہی اسکی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔

بہار سے مہاتما جی کلکتہ گئے۔ وہاں سے مدراس کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے ہی میں مالا بار کے موپلوں میں

ہلچل کی خبر ملی ۔ مولانا محمد علی گرفتار کر لئے گئے ۔ ہندو مسلمانوں میں اختلاف اور بے اعتمادی کی علامتیں اس موپلہ ہلچل میں دکھائی دینے لگیں ۔ موپلہ لوگ سیدھے لیکن جوشیلے ہوتے ھیں ۔ ان کی بغاوت خلافت کی وجہ سے برٹش سرکار کے خلاف تھی ۔ اسمیں مذھبی جذبہ ھی اھم سبب تھا ۔ مذھبی جذبہ جب ایك بار ابھر جاتا ھے تو اسکی بہت سی شکلیں ھوجاتی ھیں ۔ اس بار مالا بار میں مذھبی جذبہ نے ایك عجیب رنگ دکھایا ۔ موپلوں کا جھگڑا برٹش سرکار کے ساتھ تھا لیکن کچھ ایسے ھندوؤں کے ساتھ جن کے متعلق ان کو شبہ تھا کہ یہ برٹش گورنمنٹ کی مدد کر رھے ھیں ۔ انہوں نے سختی اور زیادتی کی ۔ اسکا اثر دوسرے ھندوؤں پر پڑا ۔ ان موپلوں کا جھگڑا اس طرح سے ھندوؤں کے ساتھ شروع ھوگیا ۔ اسکا نتیجہ بہت برا نکلا ، کیوں کہ جو لڑائی برٹش گورنمنٹ سے تھی اسمیں وہ ھندوؤں کو بھی ایك فریق سمجھنے لگے ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اب اسکا اثر ھندوستان کے دوسرے حصوں پر بھی کچھ نہ کچھ پڑا ، اگرچہ یہ بات اس وقت اتنی نہیں پھیلی تھی لیکن پھر بھی یہ خبر

زوروں سے پھیلی تو — کہ موپلوں نے بہت سے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیا ھے — اسلئے سارے ملک میں اشتعال و غصہ پیدا ہوگیا لیکن ابھی گاندھی جی باہر تھے پھر بھی کانگریس اور خلافت کمیٹی کا اتنا زور تھا کہ یہ خیال اور برا جذبہ ٹک نہ سکا بلکہ دور ہوگیا۔

علی برادران اور کچھ دوسرے لوگوں پر جن میں شری شنکر اچاری بھی شامل تھے - کراچی میں خلافت کمیٹی کے جلسوں میں حصہ لینے اور تقریر کرنے کے الزام میں مقدمے چلائے گئے - الزام یہ تھا کہ ان لوگوں نے وہاں ایک ایسے فتوے کا پرچار کیا جس پر گورنمنٹ نے پابندی لگا دی تھی کراچی کے مقدمے کی وجہ سے سارے ملک میں بڑی ہلچل تھی - شری شنکر اچاری نے بھی ایک مجرم ہونے کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو بڑی تائید ملی - لیکن جو پھوٹ اور نفاق کا بیج پڑ گیا تھا وہ وقت پا کر بعد میں اُگ آیا۔

ادھر ملک میں سب جگہوں سے اس بات کا مطالبہ ہونے لگا کہ انفرادی ستیہ گرہ شروع کرنی چاہئے - شہزادہ (پرنس آف ویلز) کے ہندوستانی دورے کے دن بھی قریب

آ گئے۔ احمد آباد میں ہونے والی کانگریس کا وقت بھی آ پہنچا۔ مہاتما جی ابھی تک ستیہ گرہ کرنے کے طرفدار نہ تھے۔ اس کے لئے انہوں نے کل شرطیں لگائیں۔ یہ بھی اطلاع دی کہ جب تک یہ کڑی اور سخت شرطیں پوری نہیں ہوں گی وہ ستیہ گرہ کی اجازت نہیں دینگے۔ ان میں ایک شرط یہ بھی کہ اسی علاقہ میں ستیہ گرہ کی جاسکتی ہے جہاں کھادی کا کافی پرچار ہوچکا ہو۔ تعمیری کام کے جز حسب ہدایت پورے کئے گئے ہوں۔ اب جگہ جگہ ان شرائط کے پورے کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ «بہار» میں ضلع «چھپرا» کے تھانہ «بسنت پور» کے لوگوں نے یہ دعوی پیش کیا کہ وہ شرائط کو پورا کرچکے۔ اس لئے ان کو اب اجازت ملنی چاہئے۔

پرنس بمبئی میں اترے وہاں بلوہ ہوگیا۔ اس میں پارسیوں کے ساتھ جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ شہزادے کے استقبال میں شریک ہوتے تھے۔ زیادتیاں کی گئیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ فساد دور تک پھیلے گا جس کی وجہ سے مہاتما جی فکر مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے روزہ رکھ

لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں فساد موقوف ہوگیا۔ یہ ایک نیا تجربہ ملک کو ہوا۔ « ورکنگ کمیٹی » کی ایک نشست بمبئی میں ہوئی اسمیں بھی میں شریک تھا۔ اس جلسے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس سے ہم لوگوں کو مہاتما جی کی بڑائی اور تحمل کی ایک جیتی جاگتی مثال مل گئی۔ بمبئی میں بلوہ کی وجہ سے جو لوگ پہلے ہی سے شہزادے کے بائیکاٹ کے مخالف تھے وہ اور بھی کہنے لگ گئے کہ اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا۔ جو ہوا۔ اس سارے پروگرام کی مخالفت میں وہ بہت زور سے بولنے اور لکھنے لگے۔ ایسے لوگوں میں « شریمتی بی سینٹ » بھی تھیں۔ وہ شروع ہی سے اس پروگرام کی مخالفت کرتی چلی آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک سخت مضمون اپنے ہفتہ وار پرچہ میں لکھا۔ « دیش بندھو داس » کا خیال ہمیشہ سے « شریمتی بی سینٹ » کے خلاف تھا وہ اس مضمون کو ساتھ لائے مہاتما جی سے انہوں نے « کانگریس ورکنگ کمیٹی » میں کہا کہ میں امید کرتا ہوں کہ آپ « ینگ انڈیا » کی اگلی اشاعت میں اس کا ایک منہ توڑ جواب دیں گے اور ہم لوگ

اسے دیکھ سکیں کے مہاتما جی نے مسکرا کر کہا۔ " کہ آپ ایسی چیز " ینگ انڈیا " میں پانے کی امید نہ رکھیں۔ ینگ انڈیا کا اصول برابر جاری رہا۔ انہوں نے اپنے کسی مخالف کے متعلق کبھی کوئی ایسی بات کبھی نہ لکھی۔ جس میں کڑوا پن ہو یا مخالف مضمون کے بارے میں کسی قسم کے بڑھے جذبے کی گندگی تک بھی ہو۔ اگرچہ دیش بندھو داس نے اپنے طریقہ سے ان دلیلوں کو رد کیا۔

نومبر کا مہینہ آچکا تھا۔ اب لوگوں میں ستیہ گرہ کے لئے جوش اور اضطراب بہت بڑھتا جارہا تھا۔ ستیہ گرہ کے لئے کوئی مخصوص پروگرام بنانے یا اس کو باضابطہ شروع کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ جہاں جہاں شہزادے کو جانا تھا۔ وہاں بائیکاٹ کے متعلق مظاہروں کی وجہ سے گورنمنٹ نے گرفتاریاں شروع کردی تھیں۔ اب کسی مقام پر شہزادے کے پہونچنے کا انتظار گورنمنٹ نہیں کرتی تھی بلکہ اس سے پہلے ہی مظاہرہ روکنے کے لئے گرفتاریاں کرتی تھی لیکن پھر بھی مظاہرے نہ رکتے بلکہ زوروں سے ہوتے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ملک کے سب ھی جلسوں میں والنٹیر جماعت بنانے کی ھدایت دی تھی۔ سب ھی جگھوں میں والنٹیر بھرتی کئے جا رھے تھے۔ حکومت نے اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ والنٹیر بڑی تعداد میں گرفتار ھونے لگے۔ جو لوگ کبھی والنٹیر نہیں بنے تھے وہ لوگ والنٹیر بن کر گرفتار ھونے میں اپنی عزت اور شہرت سمجھنے لگے اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ آپ سے آپ ستیہ گرہ چھڑ گئی اور وہ بھی گورنمنٹ کی وجہ سے۔ لوگوں میں اس قدر جوش پھیلا کہ گورنمنٹ بھی گھبرا گئی وہ اب اس کوشش میں لگ گئی کہ کسی طرح صلح ھو جائے۔ بڑے بڑے نیتا بھی مثلاً دیس بندھو داس، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ گرفتار ھو چکے تھے پھر بھی جنتا کے جوش میں کمی نہیں آئی۔ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ اس فکر میں تھے کہ شاھزادے کے کلکتہ پہونچنے پر کسی طرح کی گڑ بڑ نہ ھونے پائے اس لئے انہوں صلح کی بات چیت شروع کی۔ دیس بندھو داس کلکتہ ھی کے جیل میں تھے

اسلئے ان سے بات چیت کی گئی۔ وہ کسی حد تک صلح کے لئے تیار بھی ہوگئے لیکن جن شرائط پر وہ صلح کرنا چاہتے تھے مہاتما جی کو ناکافی معلوم ہوئیں اسلئے انہوں نے شرائط کو نامنظور کر دیا۔ آخری بات چیت ابھی پوری ہونے بھی نہ پائی تھی کہ پرنس کلکتہ پہنچ گئے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں زور دار مظاہرہ ہوا جہاں شاہزادے گئے مظاہرہ ہوتا ہی گیا۔ تحریک کو دبانے کے لئے پہلے سے کارروائی ہو رہی تھی اس میں لارڈ ریڈنگ نے اور بھی سختی کر دی۔ دیس بندھو داس۔ مہاتما جی کی اس کارروائی سے بہت غیر مطمئن ہوئے اسلئے جیل سے نکلنے کے بعد انہوں نے اس پر سخت نکتہ چینی بھی کی۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی بہار میں ہوا۔ جو لکھنے کے قابل ہے۔ وہاں بھی اور جگہوں کی طرح خوب زور سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب کے سب گرفتار کر لئے جائیں گے لیکن میں بچ گیا اور میری گرفتاری نہیں ہوئی میں نے سنا کہ غلط فہمی کی وجہ سے میں گرفتار نہیں کیا گیا صرف میں ہی نہیں بچا۔ بلکہ سارے بہار میں

گرفتاریاں بند ہوگئیں۔ وہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ جس وقت دیش بندھو داس کے ساتھ لارڈ ریڈنگ سمجھوتے کی بات چیت کر رہے تھے تو انہوں نے اپنی ایگزیکیٹو کونسل کا اجلاس کلکتہ میں کیا۔ اسکا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ان شرطوں کو باضابطہ منظور کرلیا جائے جن کو دیش بندھو داس نے منظور کرلیا۔ اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب سمجھوتہ ہو ہی جائیگا۔ سر تیج بہادر سپرو وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ اس جلسہ میں شرکت کے لئے وہ کلکتہ آرہے تھے وہ جب پٹنہ ہوکر گذرے تو وہاں پر ان سے۔ بہار کے گورنر سے کچھ بات چیت ہوئی جس سے گورنر کو ایسا محسوس ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ اب صلح ہوگئی۔ اسلئے اس نے گرفتاریاں بند کر دیں صلح تو آخر میں ہوئی نہیں لیکن میں اور بہت سے لوگ جن کی گرفتاری ہونے والی تھی گرفتار نہیں کیئے گئے۔

اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد احمدآباد میں کانگریس کا اجلاس بڑی شان کے ساتھ ہوا۔ دیش بندھو داس صدر منتخب ہوئے لیکن چونکہ وہ جیل میں تھے اسلئے حکیم

اجمل خان نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ مظاہرے بھی بڑے جوش کے ساتھ کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کانگریس کا اجلاس بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ اب تک کانگریس میں لوگ کرسیوں اور بنچوں ھی پر بیٹھا کرتے تھے۔ احمد آباد میں سب سے پہلے فرش پر کانگریس کا اجلاس ہوا ایک بڑے معرکہ کی تجویز جس پر بڑی سرگرمی کے ساتھ بحث ہوئی۔ مولانا حسرت موہانی کی تھی جس میں انہوں نے برٹش سامراج سے الگ ہو کر ہندوستان کے آزاد ہونے کو کانگریس کا مقصد بنائے جانے پر زور دیا تھا۔ مہاتما جی نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی تھی۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے وہ تجویز نامنظور ہوگئی تھی۔

ایک بڑا واقعہ سبجکٹ کمیٹی میں پیش آیا۔ وہ بھی لکھنے کے قابل ھے اس سے یہ معلوم ہوتا ھے کہ مہاتما جی ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے جو ستیہ گرہ کا مقصد سمجھے بغیر ھی اس پر چلنا اور دوسروں کو مجبور کرنا چاہتے تھے ایک دوست گئو رکھشا کے بڑے

پرچار کرنے والے تھے۔ سبجکٹ کمیٹی کے بیچ میں وہ آ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک ان کے لئے گئو رکھشا کے متعلق قابل اطمینان کار روائی نہ کی جائے گی اسوقت تک وہ سبجکٹ کمیٹی کی کار روائی نہیں ہونے دیں گے یوں تو اگر رضا کار چاہتے تو ان کو پکڑ کر آسانی سے باہر لے جاسکتے تھے اور کار روائی بھی کی جاسکتی تھی لیکن مہاتما جی کو یہ طریقہ پسند نہ تھا انہوں نے ایسا نہ کرنے دیا سب لوگوں کو اس بات کی حیرت تھی کہ دیکھیں ایسے ضدی آدمی کے ساتھ بغیر زبردستی کے مہاتما جی کیا برتاؤ کرتے ہیں اور کس طرح کانگریس کے کام میں اس پڑی ہوئی رکاوٹ کو دور کرسکتے ہیں انہوں نے اور دوسرے لوگوں نے بھی گئو رکھشا والے مہاشے کو بہت سمجھایا کہ آپ اس طرح کام میں رکاوٹ نہ ڈالئے لیکن وہ کب کسی کی سننے والے تھے آخر میں مہاتما جی نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ ستیہ گرہ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے ہیں اب دیکھئے کہ میں کس طرح آپ کے ہاتھ لگائے بغیر اپنا کام کر لیتا ہوں۔ اتنا کہہ کر انہوں نے والنٹیروں سے کہا کہ ان کے

چاروں طرف تم لوگ کھڑے ہوجاؤ۔ اس کے بعد اور لوگوں سے کہا ہم لوگ کسی دوسری جگہ پر اپنا کام کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچ ہی میں گھرے پڑے رہے۔ ان کے کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ ادھر کمیٹی نے اپنا کام الگ ہٹ کر جاری رکھا۔

گیارھواں باب

احمد آباد کانگریس میں مہاتما جی کو ستیہ گرہ کے متعلق پورا اختیار دے دیا تھا اور ایسا سمجھا تھا کہ جلد کہیں نہ کہیں ستیہ گرہ شروع کر دی جائے گی۔ مہاتما جی کے دھیان میں ضلع سورت کا باردولی تعلقہ تھا۔ جس کو انہوں نے ستیہ گرہ کے لئے میدان منتخب کیا تھا۔ دوسری جگہوں کو بھی تیاری کرنے کی ھدایت کی تھی لیکن باردولی ھی کو سب سے پہلا میدان چننے کی وجہ یہ تھی۔ کہ اول تو وھاں کے رھنے والے بیدار اور جوشیلے تھے کھادی کے پرچار اور دوسری باتوں میں بھی اپنی آمادگی دکھا کر انہوں نے اپنی اھلیت ظاھر کر دی تھی۔ دوسرے اس تعلقہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مہاتما جی کے ساتھ دکھنی افریقہ میں کام کر چکے تھے اور وھاں کی ستیہ گرہ میں

حصه لیکر انہوں نے ستیه گره کا اچھا عملی تجربه حاصل کیا
تھا کچھ دنوں کے بعد مہاتما جی اور دوسرے لوگ اس تعلقه
میں دوره کر کے جنتا کی تیاری سے مطمئن ہو چکے تھے
خیال ہوا که مہاتما جی بار دولی میں ستیه گره شروع کریں کے
اس لئے تعلقه کے بڑے لوگوں کا جلسه وہاں ہوا میں بھی
اس دن وہیں موجود تھا۔ ستیه گره میں عدم تشدد پر رہ کر
ہر طرح سے سرکاری زیادتی برداشت کرنے کی ہدایت
دے کر ان لوگوں سے ایك آم کے درخت کے نیچے جہاں
سب ہی بیٹھے تھے عہد لیا که وہ لوگ ستیه گره میں
غلط راسته اختیار نه کریں گے خواه ان کو پیٹا جائے یا وہ
جیل خانے بھیجے جائیں یا ان کی دھن دولت گورنمنٹ کی
طرف سے ضبط کر لی جائے ان میں جو کچھ بھی خامیاں
دیکھی گئی تھیں ان کو بھی دور کرنے پر زور دیا گیا تھا
مہاتما جی نے اس بعد لارڈ ریڈنگ کو ستیه گره کی اطلاع
کردی انہوں نے جو خط لکھا اس میں ساری باتیں بتادی
تھیں جن کی وجه سے ستیه گره کرنی لازم ہوگئی تھی —
میں عہد نامه کے جلسے کے بعد بہار واپس آ کر صوبه

میں دورہ کرنے لگا اس لئے کہ ستیہ گرہ شروع ہوجانے کے بعد سب ہی جگہوں پر شانتی رہنی چاہئے تھی اور ستیہ گرہ کی تیاری بھی پوری طرح ہونی چاہئے تھی - یہی پیغام میں جگہ جگہ پہونچا رہا تھا اچانک « سیتا مڑھی » کے علاقہ میں پپری کے ایک جلسے میں تقریر کرتے وقت مجھے ایک تار ملا کہ باردولی میں ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک ہونے والی ہے مجھے فوراً وہاں پہنچنا چاہئے - میں وہاں سے سیدھا پٹنہ آ کر « باردولی » کے لئے روانہ ہوگیا - جب میں باردولی اسٹیشن پر اترا تو میں نے پنڈت مدن موہن مالوی جی کو اس گاڑی سے روانہ ہوتے دیکھا - ان سے بہت تھوڑی باتیں ہوسکیں - ان سے اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی نشست ختم ہوگئی اور یہ طے کر دیا گیا کہ ستیہ گرہ ملتوی کر دی جائے اس ارادے کا سبب یہ تھا کہ ضلع گورکھپور کے مقام « چوری چورا » میں ایک بلوہ ہوگیا تھا جس میں وہاں کے لوگوں نے وہاں کے پولیس تھانے کو جلا دیا تھا اور پولیس کے کئی سپاہیوں کو مار ڈالا تھا وہاں کچھ ایسا جوش پیدا ہوگیا تھا کہ لوگ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے -

پولیس اسٹیشن پر دھاوا کر کے فساد کر دیا۔ اس کی اطلاع پاتے ھی مہاتما جی نے ارادہ کر لیا کہ ایسی حالت میں جبکہ جنتا نے اہنسا کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ کر اتنا بڑا بلوہ کر دیا تو ستیہ گرہ کے لئے فضا ٹھیک نہیں ھے اسے ملتوی کرنا ھی چاھئے۔ اسی بات پر غور کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی طلب کی گئی۔ اس میں مہاتما جی کے فیصلے سے اتفاق کر کے ملتوی کرنے کا فیصلہ وھیں کر دیا۔ جب میں نے مالوی جی سے اتنا سنا تو میرے دل میں خیال ھوا کہ اس سے جو جوش ملک میں پیدا ھوا تھا اس کو ٹھیس لگے گی۔ میں راستہ میں یہی سوچتا ھوا مہاتما جی کے پاس پہونچا۔ انہوں نے دیکھتے ھی کہا کہ دیر کر کے پہنچے۔ اس کے بعد پوچھا "یہاں کا فیصلہ معلوم ھوا یا نہیں" میرے اس کہنے پر کہ فیصلہ کا حال سن لیا ھے انہوں نے دوسرا سوال کیا کہ "کیا فیصلے سے متفق ھو" میں اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں نے صرف اتنا ھی کہا کہ لوگوں میں اس سے بے اطمینانی ھو جائے گی اس پر انہوں نے میرا خیال جاننا چاھا۔ میں نے کہا کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ انہوں

نے اس بات کو پسند کیا۔

میں نے جب اور لوگوں سے ورکنگ کمیٹی کی پوری کار روائی تفصیل وار سن لی اس وقت اور کچھ سوچ کر اپنے دل میں میں نے فیصلہ کر لیا جو کچھ ہوا ہے وہ ٹھیک ہوا ہے اس کے بعد مہاتما جی کے پاس جا کر میں نے ان سے کہہ دیا کہ لوگوں میں بے اطمینانی تو ہوگی لیکن جو ہوا ہے وہ اچھا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مہاتما جی کو میری رائے سے اطمینان ہوا۔ انہوں نے اپنے خیالات مجھسے تفصیل سے بتائے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ستیہ گرہ کے لئے اہنسا لازم ہے۔ اس میں اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ ستیہ گرہ صرف مخالف کو تنگ کرنے یا اس سے زبردستی اپنی بات منوانے ہی کے لئے کی جاتی ہے تو یہ غلط ہے۔ ستیہ گرہ کا مقصد تو اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر مخالف کے دل کو جیت لینا ہے جس میں وہ ستیہ گرہ کی بات ٹھیک سمجھ کر مان لے دباؤ میں پڑ کر نہیں بلکہ اسکی سچائی اور موزونیت کو مان کر یہ جذبہ جب تک کامل طور سے لوگوں میں نہ پیدا ہو جائے اور لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ کسی نہ کسی

طرح گورنمنٹ کو تنگ کرنا ہی ستیہ گرہ کا مقصد ہے لیکن
اس پر تنگ کرنے میں کہیں زیادتی کرنا بھی ضروری ہو جانے
والا جائز رہے۔ لیکن وقت تک ستیہ گرہ نہیں چل سکتی تھی
اور چوری چورا کے واقعہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ابھی
جنتا کو کوئی کیا کہتے کانگریس کے کام کرنے والوں نے
بھی اس مقصد کو نہیں سمجھا تھا کیونکہ کانگریس کے کام
کرنے والوں ہی نے جنتا کو ابھارا تھا اور اسی کے ذریعہ
تھانہ جلایا اور پولیس کے آدمی مروا ڈالے۔ دیا خصوصیہ
لسیا تھا [illegible]
مہاتما جی نے کہا تھا کہ جس طرح ہانڈی کے ایک دو
چاول دیکھ کر بھی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ساری ہانڈی کا
چاول پک گیا ہے یا نہیں اسی طرح اس واقعہ سے سارے
ملک کی حالت اور جذبات کا پتہ چل گیا۔ اگر
نلس ناطور کت میں ستیہ گرہ جاری رہتی تو دوسری بہت سی
جگہوں میں بھی چوری چورا جیسے واقعات نظر آنے لگتے۔
اور بار دولی میں ستیہ گرہ کی بجائے بہت سے چوری چورا
سامنے آ جائیں گے۔ مہاتما جی نے بھی انہیں باتوں پر غور کر کے یہ

ارادہ کرلیا تھا اور مہاتما جی کی باتوں نے کئی سال پہلے ان ارادے میں اور بھی مضبوطی پیدا ہو گئی تھی لیکن اتنا جانتا تھا کہ اس فیصلے کو بہت سے لوگ پسند نہ کریں گے کیونکہ وہ اتنے لڑنے جھگڑنے میں سے غور کرنے کو چاہیں گے۔ جیسا اسکے بعد میں دیکھنے میں آیا [illegible]
[illegible]
[illegible] بارڈولی میں میرے قیام کے وقت ہی امید آم کے درخت کے سایہ میں پھر بڑے لوگوں کا جلسہ ہوا اس میں مہاتما جی نے ستیہ گرہ ملتوی کرنے کے اس فیصلے کو لوگوں کو سنایا اور اسکے اسباب کو سمجھایا۔ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں اس خیال اور مصلحت کے متعلق کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس فیصلے سے وہ بہت دکھی اور رنجیدہ تھے اس کا سبب یہ تھا کہ وہ یہ مانتے تھے کہ ان کو ملک کے لئے کچھ کرنے کا جب موقع ملا تھا وہ خوش نصیبی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ملک کی آزادی اور بہبودی کے لئے وہ سارا دھن قربان کر دینے کو تیار تھے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر پائیں گے اسی کی ان کو تکلیف تھی۔ کئی آدمی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مہاتما جی

نے سمجھا بجھا کر ان کو شانتی دی —

وہیں پر یہ بھی ارادہ کیا گیا کہ چند دنوں کے اندر ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ کیا جائے جس میں باردولی کے فیصلے کو رکھا جائے - یہ اجلاس دلی میں ہونا طے پایا جو تاریخ مقرر کی گئی تھی اس دن پھاگن کی شیو راتری تھی کئی آدمیوں نے اس تاریخ پر ناراضگی ظاہر کی - تار اور چٹھیوں سے مہاتما جی کو متنبہ بھی کیا کہ اس مبارک موقع پر بہت سے ہندو روزہ رکھ کر شیو کی پوجا میں لگے رہتے ہیں اس لئے یہ اجلاس اس تاریخ پر نہ ہو بلکہ کسی دوسری تاریخ پر اسکو ہونا چاہئے - مہاتما جی نے اسکو نہیں مانا مجھے بھی یہ بات خود بری معلوم ہوئی - مہاتما جی سے میں نے کہا کہ اس سے ہندوؤں میں بے اطمینانی ہے اور وہ واجب بھی ہے - اس لئے ایک دو دن ٹال دینے میں کوئی حرج نہ ہوگا - انہوں نے میری بات نہ مان کر مجھے سمجھایا کہ ، جب کوئی ارادہ کرلیا جائے تو جہاں تک ممکن ہو اسے بدلنا نہیں چاہئے - جب تک کوئی اہم وجہ نہ ہو - لیکن یہاں کوئی ایسی وجہ دکھائی نہیں دیتی -

کیونکہ جو روزہ رکھنا چاہتے ہیں وہ دھلی میں بھی آسانی سے رکھ سکتے ہیں. عبادت اور پوجا میں بھی کوئی دقت نہ ہوگی. کیونکہ اجلاس دن رات نہیں ہوگا. باقی وقت میں عبادت کرسکتے ہیں». انہوں نے پھر کہا «یہ تو کسی شاستر میں نہیں لکھا ھے کہ کوئی اچھا کام مبارك تاریخ کو نہیں کرنا چاھئے، خاصکر جب اس کو پبلك اهمیت ھے». میں نے دیکھا کہ مہاتماجی کس ارادہ کو کتنی اهمیت دے رہے ہیں. مجھے چمپارن کا وہ واقعہ یاد آگیا. جب وہ رات میں گٹھری اٹھا کر نئے مکان میں چل دئے تھے. کیونکہ نئے مکان میں جانے کا پہلے سے ارادہ کر لیا تھا. دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ہمارے برتوں اور تیوھاروں کا کیسا اچھا مطلب نکالتے ہیں اور ہماری ان خواهشوں کو کس قدر صحیح طور سے وہ غلط سمجھتے ہیں، جو همکو برت کے دن ایك طرح سے بیکار اور نکما کر دیتی ہیں.

اس فیصلہ کی اشاعت ہوتے ھی چاروں طرف سے اس کے خلاف آواز اٹھنے لگی. بڑے بڑے نیتا اسوقت جیل میں تھے. دیش بندھو داس تو پہلے ھی سے ناراض تھے. جب ان کی

بات نہ مان کر مہاتماجی نے لارڈ ریڈنگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا. اب اس بات سے اور بھی ناراض ہوئے. اب ان کو ایسا معلوم ہوا کہ مہاتماجی نہ تو سمجھوتہ کرتے ھیں اور نہ لڑتے ھی ھیں. سارے ملك میں جوش پیدا کرکے اس کو ٹھنڈا کر دیتے ھیں. پنڈت موتی لال نہرو بھی انہیں کے هم خیال تھے. انھوں نے بھی اپنے خیالات دھلی کے اجلاس کے موقع پر لکھ بھیجے. لاله لاجپت رائے کے بھی ایسے ھی خیالات تھے. جہاں تك مجھے یاد ھے علی برادران نے بھی مہاتماجی سے اختلاف ظاھر کیا تھا. میں نے سنا تھا کہ جب ایك جیل سے کہیں دوسرے جیل تبادله ہوتے وقت کسی اسٹیشن پر علی برادران سے کسی کی ملاقات ھوگئی تھی. اس وقت ان لوگوں نے اسے اپنی رائے بتادی تھی. آل انڈیا کانگریس سے پہلے جو ورکنگ کمیٹی کی نشست دھلی میں ھوئی تھی اس میں سبھی باتیں کہی گئی تھیں. ان باتوں کو سن کر بھی مہاتماجی اپنی باتوں پر اٹل رھے. آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں باردولی کا تصفیہ منظور کرنے کی تجویز مہاتماجی نے پیش کی. اپنے خیالات کو انھوں نے کھول کر رکھ دیا. ڈاکٹر مونجے

نے اس تجویز میں ترمیم پیش کی، جس کا منشا مہاتماجی کی ساری کارروائیوں اور سارے پروگرام کی مذمت کرنے کا تھا. اس پر بحث ہوئی. حکیم اجمل خاں اسوقت کانگریس کے صدر تھے. انھوں نے اچانک اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے مہاتماجی کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور خود اٹھ کر چلے گئے. لوگوں کو خیال ھوا کہ مہاتماجی کی اپنی ھی تجویز ھے. جس کے خلاف ڈاکٹر مونجے کی ترمیم ھے، اس پر بحث ھو رھی ھے، دیکھنا ھے کہ مہاتماجی کیا کرتے ھیں. لیکن انھوں نے ایک انوکھا ڈھنگ اختیار کیا. جب کوئی تقریر کے لئے اٹھتا تو اس سے پوچھتے کہ آپ کس طرف سے بولنا چاھتے ھیں. جب وہ کہتا کہ «ھم ڈاکٹر مونجے کے خلاف بولنا چاھتے ھیں» تو کہتے آپ ذرا ٹھہر جائیے. اگر وہ کہتا کہ میں ڈاکٹر مونجے کی ترمیم کی موافقت میں بولنا چاھتا ھوں، تو اس کو اجازت دے دیتے. اس طرح سب ھی تقریریں مہاتماجی کی مخالفت میں ھونے لگیں. کچھ دیر بعد مہاتماجی کی طرف سے جو لوگ بولنا چاھتے تھے انھوں نے، یہ سمجھ کر کہ مہاتماجی ھمکو تو بولنے دینگے نہیں، کھڑے ھو کر اپنی خواھش اور مرضی

ظاہر کرنی بھی موقوف کر دی. اس سے ایسا معلوم ہونے لگا. که مہاتماجی کی تجویز کی موافقت میں کوئی بھی نہیں ھے. اور ان کی تجویز شاید نامنظور ہو جاے. رات کے دس بج گئے تھے. مہاتماجی کی مخالفت میں یکے بعد دیگرے لوگ بولتے ھی چلے گئے. میں بھی بیٹھے بیٹھے سنتا رھا. مجھے بھی یه برا معلوم ھوا که اس طرح مہاتماجی اپنی موافقت کو کیوں کمزور کر رھے ھیں. جب سچ مچ وھی فریق ٹھیك ھے. جو کچھ میں نے ورکنگ کمیٹی اور اسوقت تك آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں سنا، اس سے میرا اپنا خیال اور بھی مضبوط ھوگیا که فیصله ٹھیك ھے آخر میں مہاتماجی نے کسی کو بھی اپنی تجویز کی موافقت میں بولنے کا موقع نه دیکر راے لینی شروع کر دی. یه دیکھ کر مجھے اور بھی برا معلوم ھوا. لیکن مہاتماجی نے یا تو جلسه کا رخ جان لیا تھا، یا سوچ لیا تھا که ھماری پہلی تقریر سے لوگوں نے اگر اس تجویز کو اچھی طرح نہیں سمجھا ھے تو اسکی موافقت میں تقریر کرا کر اس پر زور ڈالنا کہاں تك ٹھیك ھوگا اور اس سے ان کی عقل کو سمجھایا نہیں جاسکے گا. کچھ لوگوں کے یه کہنے پر بھی که دوسری جانب کو کچھ کہنے کا موقع نہیں

دیا گیا ان کو خیال ظاہر کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ مہاتما جی نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ انہوں نے ان لوگوں سے جو ڈاکٹر مونجے کی ترمیم کی موافقت میں تھے ہاتھ اٹھانے کے لئے کہدیا جب ہاتھ گنے گئے تو معلوم ہوا کہ تقریباً اتنے ہی ہاتھ اٹھے جتنی ان کی موافقت میں تقریریں ہوئیں تھیں۔ اس طرح ترمیم بہت بڑی اکثریت سے نامنظور ہوگئی اور مہاتما جی کی تجویز منظور کرلی گئی۔ میرا خیال ہے کہ مہاتما جی کی ترمیم اور باردولی کے فیصلہ کی جتنی شدت سے سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی گئی اتنا ہی لوگ مہاتما جی کی تجویز کے موافق اور ڈاکٹر مونجے کی ترمیم کے مخالف ہوتے گئے۔ اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر مونجے اور ان کے طرفداروں نے کبھی نان کواپریشن کے پروگرام کو پوری طرح سے منظور نہیں کیا تھا وہ عوام کی رائے کو اسکی موافقت میں دیکھکر چپ ہوگئے تھے لیکن جب کبھی موقع ملتا تھا تو اس پر سخت نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ اس جلسہ میں ممبروں پر یہ اثر پڑا کہ یہ لوگ تو ہمیشہ مہاتما جی کی مخالفت ہی کیا کرتے ہیں اس لئے یہ ایک موقع دیکھکر کہ کچھ اور لوگ بھی ان کے مخالف ہیں۔ ڈاکٹر

مونجے نے کھل کر مذمت کی تجویز پیش کرنے کا طریقہ ڈھونڈھ لیا۔ اس سے جو کوئی باردولی کے فیصلہ کا مخالف بھی تھا وہ ڈاکٹر مونجے کی ترمیم کا مخالف اور مہاتما جی کی تجویز کا موافق بن گیا۔

اس کے بعد یہ ظاہر ہوگیا کہ کانگریس میں دو مکتب خیال چل رہے ہیں اور آپس میں کافی اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ گورنمنٹ اس بات سے ضرور فائدہ اٹھانے کی شاہزادے کا دورہ ختم ہوچلا تھا اسلئے اب کانگریس کے ساتھ سرکار کے سمجھوتہ کرنے کا کوئی سبب نہیں رہ گیا تھا بہت سے لوگ پہلے ہی سے جیل میں تھے اب مہاتما جی کے گرفتار کر لینے میں کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ ایسا میں نے " دلی " ہی میں ایک ایسے دوست سے سنا تھا جن کی رسائی گورنمنٹ کے لوگوں تک تھی تھوڑے ہی دنوں بعد " ینگ انڈیا " میں مہاتما جی کے دو شائع شدہ مضمونوں کی وجہ سے گورنمنٹ نے ان کو گرفتار کرلیا۔ دفعہ ۱۲٤ الف کے ماتحت سشن جج کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اسوقت وہ گرفتار ہوکر " سابر متی " جیل میں رکھے گئے میں خبر پاتے ہی وہاں گیا۔ ایک بار تو جیل کے پھاٹک پر

دور سے ھی میں نے مہاتما جی کا درشن کیا۔ پورے درشن ور ملاقات کا موقع تو جب ھی ملا جب سشن جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ نان کواپریشن تحریک کے بعد مہاتما جی عدالت کے سامنے مجرم کی شکل میں لائے گئے۔ چمپارن میں تو ان پر مقدمہ چلا ھی تھا لیکن آج اور اس وقت کی حالت میں بہت فرق تھا۔ اسوقت گاندھی جی کو تھوڑے ھی لوگ جانتے تھے۔ لیکن اب تو وہ ملک میں اپنے دو شاھکار بھی دکھا چکے تھے۔ ایک ھندو مسلم ایکا و اتحاد کا اور دوسرے سارے ملک میں عام بیداری کا چمپارن میں جس دن انہوں نے سرکاری حکم نہ مان کر جیل کی سزا بھگتنے کا ارادہ کیا تھا اس دن ان کےساتھ ایک دو انجان آدمی تھے جو نہ تو ان کے طریق کار کو جانتے تھے اور نہ ان سے کوئی خاص واقفیت رکھتے تھے لیکن آج تو انکی آواز پر لاکھوں آدمی سارے ملک میں اپنا سارا وقت دے کر کام کر رھے تھے اور لاکھوں لوگ ان کے کہنے سے جیل خانے میں پڑے تھے جنھوں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کو ایسا کرنا پڑے گا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس دن اور آج میں بہت مطابقت بھی تھی - آج بھی مہاتما جی برٹش سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے - جیسے اس روز تھے - آج بھی ان کا بھروسہ خدا اور مصیبت سہنے کی طاقت پر تھا - آج بھی عدالت کے سامنے جو بیان انہوں نے دیا - اسمیں وہی استقلال اور بھروسہ جھلک رہا تھا جو موتی ہاری کی عدالت کے بیان میں تھا -

عدالت میں سب کو آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن ملک کے شری کیلکر جیسے مانے ہوئے نیتا جو جیل کے باہر رہ گئے تھے وہاں موجود تھے - چمپارن میں تو سزا نہیں ہوئی تھی لیکن احمدآباد کے جج نے چھ سال کی سزا دے دی - رخصت ہونے وقت میرے جیسے لوگ اپنے تئیں سنبھال نہ سکے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے وہاں سے ہم لوگ ایک طرح سے لاچار ہوکر گھر واپس آئے -

مہاتما جی نے چلتے وقت ہدایت دیدی تھی کہ ستیہ گرہ نہیں کرنا چاہئے ہمارے سامنے یہی بڑا سوال تھا کہ جو جوش لوگوں میں آچکا ہے وہ کس طرح قائم رکھا جائے - لیکن

اس کی علامتیں ظاہر میں دیکھنے لگے تھے کہ یہ بہت مشکل کام تھا۔ ہم نے تعمیری کام پر زور دے کر اس کے ذریعہ لوگوں کا جوش قائم رکھنے کی تدبیر کی۔ لیکن روز بروز وہ جوش کم ہوتا گیا۔ گورنمنٹ بھی اپنی طرف سے جہاں کچھ بھی جوش دیکھنے میں آتا تھا اسے طاقت سے دبانے میں باز نہیں آتی تھوڑے ہی دنوں میں یہ ظاہر ہوگیا کہ اب کام ڈھیلا پڑجائے گا۔ میں احمدآباد سے لوٹ کر بہار کے ضلعوں کا دورہ کرنے لگا ہمارے سامنے کام بھی ایسا تھا کہ ہمارا سارا وقت لگ سکتا تھا احمدآباد کانگریس ھی میں ہم نے کانگریس کے اگلے اجلاس کو بہار کے لئے دعوت دے دی تھی اب پہلے یہ ارادہ کر لینا تھا کہ بہار میں کہاں پر کانگریس ہو اس کے لئے کس طرح روپیہ جمع کیا جائے اور کیا انتظام کیا جائے۔ بہار میں جوش کافی تھا۔ اس لئے اس بات کی کافی امید تھی اور پورا یقین بھی تھا کہ ہم انتظام کرلیں گے۔

بارھواں باب

ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ کانگریس کے جو کام کرنے والے باھر تھے وہ اس پر بہت زور دے رہے تھے کہ اب ستیہ گرہ شروع کی جائے۔ گاندھی جی نے ملک میں اھنسا کی فضا نہ ھونے کی وجہ سے وائسرائے کو نوٹس دینے کے بعد بھی باردولی کی ستیہ گرہ روک دی تھی وہ جیل جانے کے وقت بھی ستیہ گرہ کرنے کی ممانعت کر گئے تھے۔ تعمیری کام میں لگ جانے کی ھدایت کر گئے تھے لیکن تعمیری کام بہت ھی خشک اور دھیما ھوتا ھے اسمیں چٹ پٹا مزہ اور جوش و خروش نہیں ھوتا اسلئے اسمیں بہت سے لوگوں کا جی نہیں لگتا۔ یہ بات اسی وقت دیکھنے میں آ گئی تھی۔ پچھلے چھبیس ستائیس سال کے تجربہ نے بھی اسکی تائید کی ھے۔ جب ستیہ گرہ نہیں کی جاسکتی تھی

اور تعمیری کام میں بہت سے لوگوں کا جی نہیں لگتا تھا تو پھر کیا کیا جائے - کہیں کہیں دھیمی آواز خاصکر مہاراشٹر میں یہ اٹھی کہ کونسل بائیکاٹ کا پروگرام اب موقوف کر دینا چاہئے اب اگلے انتخاب میں شریک ہونے کے لئے کانگریس کو ابھی سے تیاری کرنی چاہئے لیکن عوام اور کانگریس کے کارکن ابھی اس بات کو سننے کیلئے تیار نہیں تھے مگر وہ بات اٹھی اور جو موافق تھے وہ کانگریس کو اس طرف کھینچنے کی فکر میں لگ گئے -

احمدآباد کانگریس میں شری وٹھل بھائی پٹیل صدر چنے گئے سب لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ « نان کوآپریشن » کو دل سے نہیں مانتے تھے - جب یہ کہا گیا کہ مہاتما جی کیساتھ ان کی کیسے نبھے گی تو مہاتما جی نے جوابدیا کہ صدر کوئی بھی ہو اس سے وہ اپنا کام نکال ہی لینگے اسلئے کسی کو اسکی فکر نہیں کرنی چاہئے وٹھل بھائی پٹیل زیادہ تر بمبئی میں رہا کرتے تھے ان کے چھوٹے بھائی ولبھ بھائی پٹیل گجرات میں رہا کرتے تھے جو گاندھی جی کے سچے مقلد اور سارے پروگرام کو پوری طرح مانتے تھے - احمدآباد استقبالیہ کمیٹی کے صدر بھی وہی تھے - اور ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے دکھن میں شری راجگوپال اچاریہ

اور ان میں ڈاکٹر انصاری بھی باہر تھے —

تھوڑے ہی دنوں بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک ہوئی - اس میں شری وٹھل بھائی پٹیل کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس بات کی جانچ کرے کہ کس جگہ کے لوگ کہاں تک ستیہ گرہ کیلئے تیار ہیں اور اس کمیٹی کے اعتبار پر جہاں ہو سکے وہاں ستیہ گرہ کی جائے - شری وٹھل بھائی پٹیل بہت ہی ہوشیار تھے - ان کا مطلب یہ تھا کہ کمیٹی نے اگر یہ کہا کہ کہیں ستیہ گرہ نہیں کی جا سکتی تو پھر یہ قدرتاً کہا جا سکے گا کہ اب کونسلوں میں جانے کا پروگرام پھر جاری کیا جائے - جو لوگ کونسلوں کے مخالف تھے اور ستیہ گرہ چاہتے تھے - انہوں نے اس تجویز کو ٹھیک مانا - کیوں کہ ان کو امید تھی کہ کمیٹی کی رپورٹ پر ستیہ گرہ ہو سکے گی - لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ کونسل کو بھی نہیں چاہتے تھے - اور مہاتما جی کی ہدایت کے مطابق ستیہ گرہ کرنی بھی نہیں چاہتے تھے - ان کے لئے بھی اس تجویز کو ماننے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا —

خیر کمیٹی مقرر ہوگئی. اور سارے ملک میں دورہ کرکے ستیہ گرہ کی تیاری کے متعلق باتوں کی جانچ کرنے لگی. یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا. کمیٹی نے اتنا کام تو ضرور کیا کہ جہاں جہاں اس کے ممبر جاتے وہاں بیداری بھی پیدا ہو جاتی. اور جنتا میں جوش بڑھ جاتا. ساتھ ہی وہ کونسل کے متعلق بھی سوال کرتی اور اس بات کی واقفیت حاصل کرتی کہ کہاں تک کونسل کے انتخاب میں کانگریس کو کامیاب ہونے کی توقع ہے.

« نان کو اپریشن » میں مسلمانوں نے بہت کام کیا تھا. کانگریس کمیٹیوں کے ساتھ ساتھ خلافت کمیٹیاں بھی ہوا کرتی تھیں. خلافت کمیٹی نے بھی اس بات کیلئے کمیٹی مقرر کر دی، جو کانگریس کمیٹی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ جا کر جانچ کرتی رہی. آخر میں کانگریس کی جانچ کمیٹی میں بڑا اختلاف دیکھنے میں آیا. کمیٹی کے چھ ممبروں میں تقریباً سبھی اس بات پر متفق تھے کہ ستیہ گرہ نہیں کی جاسکتی لیکن کونسل بائیکاٹ کے متعلق تین ممبر بائیکاٹ جاری رکھنے کے موافق اور تین ممانعت اٹھا دینے کے طرفدار تھے. انھوں نے کانگریس کی ان تجویزوں سے

بچنے کے لئے، جن میں کونسل بائیکاٹ کی صاف تائید کی گئی
تھی، یہ راستہ سمجھایا کہ بائیکاٹ وہ بھی چاہتے تھے. لیکن
وہ اس بائیکاٹ کا طریقہ بدلنا چاہتے تھے. وہ انتخاب کا بائیکاٹ
کرکے کونسل میں پہونچ کر کونسلوں کا بائیکاٹ کریں گے. یعنی
جو لوگ کانگریس کے پروگرام کو نہیں مانتے ہیں. ان کو کونسلوں
میں نہ جانے دیں. اس طرح وہ دکھا دیں کہ ملک عدم تعاون کا
طرفدار ہے. جب ہم سب لوگوں کو روک نہیں سکتے ہیں اور
سبھی جگہوں کے لئے امیدوار کھڑے بھی ہو جاتے ہیں. اور
کوئی مخالفت نہ ہونے کی وجہ سے بلا اختلاف چن لئے جاتے
ہیں، تو برٹش گورنمنٹ اچھی طرح کہہ سکتی ہے اور کہتی بھی
ہے کہ کونسل بائیکاٹ کا پروگرام بالکل کامیاب نہیں ہوا. کیونکہ
ایک بھی جگہ خالی نہیں ہے، اور تمام صوبوں میں وزارتیں
بھی بن گئیں جو کام کر رہی ہیں. ان کا کہنا تھا کہ ہم لوگ
الکشن لڑکر ایسے لوگوں کو جانے نہ دیں اور ہم متفق ہوکر کوئی
وزارت بھی نہ بننے دیں، اس طرح کا نان کواپریشن بہت کارگر
ہوگا، اس وقت برٹش گورنمنٹ بھی یہ نہ کہہ سکے گی کہ نئے قانون
کے مطابق سبھی جگہوں میں وزارتیں کام کر رہی ہیں، اور

بائیکاٹ کی تحریک ناکام ہوگئی۔ موافقین کا کہنا تھا کہ ہم کو برٹش گورنمنٹ کی کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ اس لئے عدالتوں، درسگاھوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ کیونکہ جنتا کو انہیں اداروں سے آئے دن کام پڑتا ھے، انہیں کے ذریعہ برٹش گورنمنٹ کا وقار بڑھتا ھے۔ ہم نے ایک بار جانا منظور کرلیا تو ان اداروں کے ساتھ ھمارا تعلق پھر سے قائم ہو جائےگا اور گورنمنٹ کی عزت جنتا کی آنکھوں میں بڑھ جائے گی، گورنمنٹ کے وہ دو عمل بھی کامیاب ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے ایک طرف وہ ھماری تحریک کو طاقت سے دباتی تھی اور دوسری طرف یہ دکھاتی تھی کہ اس نے جو اصلاحات دی ھیں ان سے، کچھ تھوڑے لوگوں کے سوا جو صرف تحریک کرنا ھی جانتے ھیں، سب لوگ مطمئن ہو گئے ھیں۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ نان کواپریشن کے پروگرام سے اسیطرح ایک ایک چیز کو ھٹا کر ہم لوگ سارے پروگرام کو چھوڑ دیں گے۔ ہم یہ بھی مانتے تھے کہ کونسلوں کے اندر جا کر بائیکاٹ کا اصول نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ قانون میں اس بات کا موقع تھا کہ کثرت رائے اگر وزارت کے خلاف ہو پھر بھی گورنمنٹ کا کام نہیں رکے گا۔ اگر گورنمنٹ مناسب

سمجھے تو کونسل کو توڑ کر نیا انتخاب کرا سکتی ھے. اگر اس نے ایسا کیا تو بار بار الکشن لڑنا ناممکن ھو جائے گا. اس طرح کمیٹی میں دو فریق ھو جانے کی وجہ سے اس مسئلہ پر اس کی اکثریت سے بھی کوئی سفارش نہیں ھوسکتی تھی.

اس بات کا تصفیہ کرنا پھر کانگریس ھی پر رہ گیا. کمیٹی کے ممبروں میں پنڈت جواھر لال نہرو جو جیل کی میعاد پوری کرکے نکل آئے تھے، شری وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خاں کونسل میں داخلے کے موافق تھے. شری راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر انصاری اور شری کستوری رنگ آئنگر کے موافق تھے. پہلے پنڈت جواھر لال نہرو کے خیالات صاف معلوم نہیں تھے. جہاں تک پتہ چل سکتا تھا وہ بائیکاٹ ھی کے طرفدار تھے، لیکن آخر میں رپورٹ لکھی جانے کے وقت وہ بڑے زوروں سے کاؤنسل میں داخلہ کے موافق ھو گئے. دیش بندھو داس بھی جیل سے نکلنے کے بعد داخلہ کے موافق ھو گئے، وہ تو جیل کے نکلنے کے پہلے بھی موافق ھی تھے. پنڈت جی کے خیالات کو مضبوط کرنے میں ان کو زیادہ سے زیادہ کامیابی ھوئی. اس طرح تینوں بڑے نیتا، جن کا مقام گاندھی جی کے بعد سمجھا جاتا

تھا، ایک طرف ہوگئے. لیکن عوام اور کانگریسی کارکن زیادہ
سے زیادہ "نان کواپریشن" کے پروگرام کے بدلنے کے مخالف
ہوگئے. یہ جھگڑا پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے آیا
لیکن اس نے ٹال کر "گیا" میں ہونیوالے کانگریس کے اجلاس
کیلئے چھوڑ دیا. دیش بندھوداس احمدآباد کے صدر چنے گئے
لیکن جلسے میں حاضر نہ ہوسکے تھے. حکیم اجمل خاں نے ان
کی غیرموجودگی میں صدارت کا کام انجام دیا. فطرتاً لوگوں نے
ان کو ہی "گیا" کانگریس کا صدر منتخب کیا. اجلاس سے
پہلے ہی یہ بات ظاہر ہوگئی کہ صدر اور عام نمایندوں کے
درمیان اختلاف ہوگا.

میں اس اختلافی بحث میں عدم تبدیلی کا سخت حامی سمجھا
جاتا تھا. ہمارے موافق تین بڑے نیتا تھے، یعنی شری
راجگوپال اچاری. سردار وابھ بھائی پٹیل، اور ڈاکٹر انصاری.
کانگریس کا انتظام ہم بہار والوں ہی کو کرنا تھا. میرا زیادہ وقت
اسی میں صرف ہوتا تھا. اس کے متعلق ایک واقعہ لکھنے کے
قابل ہے. جو استقبالیہ کمیٹی بنی اسکا میں ہی صدر تھا. ابھی
صدارت کا انتخاب نہیں ہوا تھا. مہاتما جی نے ہم کو ایک بات

سکھادی تھی جو بہت کام کی نکلی. انھوں نے کہا تھا کہ پبلك کا کام جتنا کم سے کم خرچ میں ہوسکتا ھے اتنا ھی کرنا چاھئے، یعنی ایك پیسه کی بھی فضول خرچی نه ھونی چاھئے. پبلك کا کام اس وقت چل سکتا ھے جب سب لوگ اسکی مدد کریں اور جو خرچ ھو وہ جنتا ادا کرے. اگر کوئی کام ایسا ھے جس کے خرچ کے لئے جنتا پیسه دینا نہیں چاھتی، تو سمجھ لینا چاھئے کہ جنتا اس کام کو پسند نہیں کرتی یا نہیں چاھتی. اس لئے وہ اس کے مخالف تھے کہ کسی پبلك ادارے کے لئے ایسا بھی کیا جائے کہ اس کے لئے ایك بار چندہ جمع کر کے رکھ لیا جائے. اور سود سے ھی کام چلتا رھے. ایسا کرنے سے ادارہ یقینی طور پر کمزور پڑجائے گا اور اپنے مقصد سے الگ بھی ھوسکتا ھے. اس لئے ادارے کو اپنی افادیت اور خدمت کے ذریعه سے جنتا سے خرچ پانے کا حق دار ثابت کرتے رھنا چاھئے. جب اسکو جنتا بیکار سمجھے گی تو وہ خرچ دینا بند کر کے اس کو بیکار کر دے گی. اور محض بوجھ ھوکر نه رہ جائے گا.

اسی سلسلے میں یه بات بھی تھی که کسی پبلك خدمت کرنے والے کو کوئی ایسا کام نہیں شروع کرنا چاھئے جس کے لئے جنتا

چندہ دینے کو تیار نہ ہو اور جو پیسے کے بغیر نہ ہوسکتا ہو۔ ہم اکثر ہی بھول کر جاتے ہیں. اس امید میں کہ آج اگر جنتا پیسے نہ دے تو کوئی حرج نہیں. پبلک کام رُکنا نہیں چاہئے، وہ بعد میں پیسے دے گی، فوراً ادھر دوسری طرح سے نہیں ہوسکتا تو قرض لے کر بھی کام چلا لینا چاہئے. یعنی پبلک کام کے لئے صرف ذاتی ذمہ داری پر، جب تک ہم اس کے لئے تیار نہ ہوں کہ جنتا اگر پیسے نہ دے تو ہم اپنے پاس سے اور اپنی جائداد بیچ کر ھی قرض ادا کر دیں گے، کسی کو قرض نہیں لینا چاہئے. کیونکہ ایسا کرنے سے آدمی جھوٹا بن سکتا ھے اور وعدہ خلافی پر بھی مجبور ہوسکتا ھے. ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہر کسی کام کرنے والے پر جواب دھی اتنے ھی کام کی حد تک ھوتی ھے جتنے کام کے لئے جنتا اس کو خرچ کے لئے مدد کرتی ھے. اگر جنتا خرچ نہیں دیتی ھے تو اس کو بھی کام کرنے والے سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں کہ اس نے کیوں قرض لیکر یا اور کسی طرح سے کام نہیں پورا کیا.

مجھے مہاتما جی کی نصیحت برابر یاد رھتی ھے اور اسوقت بھی یاد تھی. بہار میں کانگریس کے پٹنہ کے اجلاس میں اس

قسم کے تلخ تجربے کو، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ھے، بھولا نہیں ھوں. اس لئے میں نے شروع ھی میں استقبالیہ کمیٹی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صدر کی حیثیت سے میں اپنے کو اتنے ھی خرچ کا ذمہ دار بناؤں گا جتنے روپے استقبالیہ کمیٹی کے ھاتھ میں آئیں گے. کوئی چیز اس امید سے ادھار نہ لوں گا اور نہ کوئی کام ادھار کراؤں گا کہ اگر آج پیسے نہیں ھیں تب بھی کام رکنا نہیں چاھئے، کیونکہ استقبالیہ کمیٹی کو رقم مل ھی جائے گی. نتیجۃ یہ ھوا کہ میں نہ تو کوئی ایسی چیز ادھار لینے کو اور نہ ایسے کام کو ٹھیکے پر دینے کے لئے تیار تھا جس کے لئے استقبالیہ کمیٹی کے پاس پیسے نہ آ گئے ھوں. بہار میں بارش کے دنوں میں بہت زیادہ سفر بھی نہیں کیا جاسکتا ھے. برسات میں پیسے بھی نہیں مل سکتے تھے. کیونکہ اس موسم میں نہ تو کسان کے پاس پیسے ھوتے ھیں اور نہ زمیندار کے پاس. اس زمانہ میں بیوپار اور کارخانے بھی بہت ھی کم تھے. اس لئے جو کچھ تھوڑا بہت ھم جمع کرسکے تھے وہ برسات کے پہلے ھی ھوا تھا. اب ھم لوگوں کا دھیان پیسے جمع کرنے کی شدید ضرورت اتنا نہیں تھا.

برسات ختم ہوتے ہی وقت نزدیک آگیا، کیونکہ ان دنوں اجلاس دسمبر کے آخری ہفتہ میں ہوا کرتا تھا. اب اس بات کی فکر ہونے لگی کہ فوراً سب چیزوں کے لئے اگر ٹھیکے نہ دے دیئے جائیں گے تو ٹھہرنے کے لئے جھونپڑے تیار نہ ہوسکیں گے اور نہ زائرین وغیرہ کے لئے، اور نہ دوسرا کوئی سامان وقت پر مہیا کرسکیں گے. اب استقبالیہ کمیٹی کے کارکنوں کا ایک جلسہ ہوا. اس میں یہ دیکھ کر، کہ میں کوئی چیز یا ٹھیکہ اس وقت تک ادھار لینا نہیں چاہتا ہوں اور نہ دینا، جب تک استقبالیہ کمیٹی کے ہاتھ میں روپے نہ آجائیں، کارکنوں کو تصفیہ کرنا پڑا کہ اس کے بڑے لوگ جب بہار بینک سے اپنی ذاتی ذمہ داری پر قرض لیں تب خرچ کیا جائے. اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو قرض دینے والا ایک ہی ہوگا، ہم کو بہت سے لوگوں کی رقموں کے لئے تقاضے نہیں سننے پڑیں گے. بینک کو بھی اگر ادا کرنا ہوگا تو جو لوگ قرض لے رہے ہیں وہی کسی نہ کسی طرح اسکو ادا کردیں گے. اس طرح بینک کو بھی بہت سے لوگوں پر مقدمہ چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی. اس کے ساتھ ہی

هم نے یہ بھی تصفیہ کیا کہ سب جگہوں کے کارکن، استقبالیہ کمیٹی کے جتنے زیادہ ہوسکیں، اپنے اپنے ضلعوں میں ممبر بنائیں اور پیسے والوں سے جلسے کے لئے چندے بھی مانگیں. ابھی تک کانگریس کے کام کرنے والوں میں، حالات ٹھیك نہ سمجھنے کی وجہ سے، کچھ بے توجہی کا جذبہ پایا جاتا تھا. لیکن جب یہ تجویز شائع ہوگئی تو سب کی آنکھ کھل گئیں. اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ انھوں نے اگر جوش سے کام نہیں کیا تو سارے صوبہ کی بدنامی ہوگی اور پھر وہ ملك اور اپنے صوبے میں بھی منہ نہ دکھا سکیں گے. کیونکہ صوبے کی جنتا بھی کیسے کہہ سکے گی کہ تم نے کبھی ہم سے چندہ نہیں مانگا. اس لئے سب لوگ بہت جوش سے چندہ جمع کرنے میں مصروف ہوگئے اور بہت جلد رقم جمع بھی ہونے لگی.

گورنمنٹ کے نیچے درجہ کے حاکم کچھ سوچنے لگ گئے تھے کہ گاندھی جی کے جیل جانے کے بعد ایسی حالت ہوگئی ھے کہ اجلاس کے لئے بھی چندہ جمع نہیں ہوسکتا اور قرض لینے کی نوبت آگئی ھے. لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ھے سب لوگ چندہ جمع کرنے کے کام میں مصروف

ہوگئے. میں بھی اس کام کے لئے دورہ کرنے لگا. بنک سے بھی بات چیت ہوگئی اور وہ رقم دینے پر بھی راضی ہوگیا، لیکن ابھی رقم لی نہیں گئی تھی. میں چار پانچ دن کے سفر کے بعد کئی ہزار کی معقول رقم لیکر «گیا» لوٹا. دن کے تین چار بجے کا وقت تھا. پولیس کے لوگ اس بات کی فکر میں تھے کہ دیکھیں اب کانگریس ہوتی بھی ھے یا نہیں، ان لوگوں کو قرض ملتا بھی ھے یا نہیں. میں جب اسٹیشن پر اترا تو میں نے پہلے ھی سوچ لیا تھا کہ جو روپیہ میں لایا ہوں اسکو پہلے بنک میں جمع کر دوں گا. کیونکہ کانگریس کے جلسہ کی جگہ شہر سے کچھ دور پر تھی. وھیں پر ایک باغیچہ میں ایک چھوٹے سے مکان میں استقبالیہ کمیٹی کا دفتر تھا جہاں روپے رکھنے میں خطرہ تھا. اس لئے میں جیسے ھی اتر کر گاڑی میں روانہ ہو رہا تھا کہ پولیس کا داروغہ میرے پاس آیا، اور پوچھا کہ قرض لینے کا جو خیال تھا اس میں آپ کہاں تک کامیاب ہوئے اور کانگریس کا کام کیسے چلے گا. میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے دل کی بات تو یہ تھی کہ ہم لوگ مشکل میں پھنس گئے ھیں، اور اب شاید «گیا» میں کانگریس

نہ ہوگی. میں نے اسکو صاف صاف جواب دے دیا کہ ہم کو قرض لینے کی ضرورت نہیں. یہ سن کر اسکو بڑا تعجب ہوا. میں نے اسکو بتا دیا کہ روپے جمع ہونے لگے ہیں، میں خود ایك معقول رقم چار پانچ دن میں جمع کرکے ساتھ لایا ہوں. اس بات کا اسکو یقین نہیں ہوا. وہ سمجھا کہ میں اسکو چکمہ دیرھا ہوں. اسوقت میں سیدھا بنك گیا. وہ بھی میری گاڑی کے ساتھ ساتھ سائیکل پر گیا. جب میں نے روپے جمع کر دئے اور استقبالیہ کمیٹی کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا، جہاں میں ٹھہرا کرتا تھا، تو اس کو میری بات کا یقین ہوا. دفتر پہونچنے کے بعد مجھسے معلوم ہوا کہ روپے کے متعلق جو کامیاب تدبیریں ہو رہی تھیں ان کی خبر کئی ضلعوں سے آگئی ہے. اب بے فکر ہوکر میں انتظام کے کام میں لگ گیا. کل سامان خریدا جائے گا، جھونپڑے وغیرہ بھی تیزی سے بننے لگے.

اس طرح مہاتماجی کی نصیحت کو، جسے بہت سے لوگ ٹھیك سمجھ نہیں سکے تھے، ہم نے تجربہ سے ٹھیك پایا. اب تك اسی کے مطابق چل کر میں اپنے تئیں بہت سی مشکلات سے بچا سکا ہوں.

«گیا» کانگریس میں داخلہ کونسل کے سوال پر بہت بحث ہوئی. کانگریس کئی دنوں تک ہوتی رہی. آخر میں رائے لینے پر معلوم ہوا کہ تقریباً دو تہائی نمایندے داخلہ کونسل کے مخالف ہیں اور ایک تہائی موافق. اس طرح زبردست اکثریت سے داخلہ کی ممانعت «گیا» کانگریس نے بھی قائم رکھی. لیکن جھگڑا یہیں پر ختم نہیں ہوا. دیش بندھو داس نے استعفاء دے دیا کیونکہ اکثریت ان کے خلاف تھی. زیادہ اصرار کے باوجود بھی وہ صدر رہنے پر تیار نہیں ہوئے. پنڈت نہرو کے ساتھ مل کر انہوں نے سوراج پارٹی قائم کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ پارٹی کانگریس کو اپنی طرف لانے کی تدبیر اور داخلۂ کونسل کی تیاری کرے گی. میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر چنا گیا. شری راج گوپال اچاری کے ساتھ میں نے کئی صوبوں کا دورہ کیا. یہ آپس کا جھگڑا کسی نہ کسی طرح چلتا رہا. اس عرصہ میں ناگپور میں ستیہ گرہ شروع ہوگئی. سی پی گورنمنٹ نے پہلے جبلپور اور اس کے بعد ناگپور میں قومی جھنڈے کے ساتھ جلوس نکالنے پر پابندی لگادی. اس لئے ناگپور میں سیٹھ جمنا لال بزاز نے ستیہ گرہ جاری

کردی جو مہینوں تک چلتی رھی. اس میں دور دور سے رضاکار آکر حصہ لیتے رھے. بہار کے رضاکاروں کے ساتھ میں بھی کئی بار ناگپور آیا گیا. لیکن میں خود ستیہ گرہ میں شریک نہیں ھوا. سیٹھ جی کی گرفتاری کے بعد شری ولبھ بھائی پٹیل ناگپور میں رہ کر ستیہ گرہ کی رھنمائی کرنے لگے. اس کے بعد شری وٹھل بھائی پٹیل بھی ان کی مدد کو آگئے. آخر میں گورنمنٹ نے جھنڈے کا جلوس ان راستوں سے بغیر روک ٹوک جانے دیا جن سے پہلے نہیں گذرنے پایا تھا. اس طرح ستیہ گرہ ختم ھوگئی. جو لوگ جیل خانوں میں تھے تھوڑے ھی دنوں کے اندر سب چھوڑ دئے گئے.

کونسل کے متعلق اختلاف اتنا بڑھ گیا تھا کہ اب کانگریس کا اجلاس بغیر اس کے فیصلے کے ممکن نہیں تھا. نومبر سنہ ۱۹۲۳ع میں نیا انتخاب ھونے والا تھا. چونکہ اس کا فیصلہ اس کے پہلے ھی ھونا تھا. اسلئے کانگریس کا خاص اجلاس کرنے کا فیصلہ ھوا. وہ مولانا ابوالکلام کی صدارت میں دھلی میں ھوا. مولانا حال ھی میں دلی جیل سے نکلے تھے، کونسل کے داخلے کے موافق تھے. اجلاس کے پہلے ھی مولانا محمد علی بھی

جیل سے نکلے۔ اور سیدھے اجلاس میں پہونچے۔ کونسل میں داخلے کے مخالف تھے۔ ان کی رائے سے ایک سمجھوتہ ہوا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ کانگریس کی طرف سے "الکشن" نہ لڑا جائے۔ لیکن اگر کوئی کانگریسی کونسل میں جانا چاہے تو اس کو اس بات کی اجازت ہے۔ اس طرح سوراج پارٹی کو اپنے بل بوتے پر الکشن لڑنے کا موقع ملا۔ اس کی طرف سے بہت سے کانگریسی لوگ الکشن کے لئے کھڑے ہوگئے۔ صرف سی پی میں سوراج پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ بنگال میں اکثریت تو نہیں لیکن اچھی تعداد میں جگہ مل گئی۔ مگر دوسرے صوبوں میں کچھ ایسے سوراجی چنے گئے جو نہ تو وزارت بنا سکتے تھے اور نہ دوسروں کو وزارت بنانے سے روک سکتے تھے۔ سی پی میں وزارت نہ بنی۔ بنگال میں کچھ دنوں کے بعد دوسرے لوگ الگ ہوکر سوراجیوں کے ساتھ مل گئے۔ وہاں کی وزارت بھی ٹوٹ گئی۔ کوکناڈا میں کانگریس کا اجلاس مولانا محمد علی کی صدارت میں ہوا، اس میں بھی کونسل کے داخلے کی ممانعت قائم رکھی گئی۔

تیرھواں باب

جب سے یہ کونسل کا جھگڑا چھڑا اور مہاتماجی نے سنہ ۱۹۲٤ع میں جیل سے نکلنے کے بعد اس کو طے نہیں کرلیا اس وقت تک اس سوال پر سارے ملك میں بحث مباحثہ ھی ھوتا رھا. دوسرا کوئی کام بھی تیزی سے کیساتھ پورے جوش سے نہ ھوسکا. مہاتماجی نے تعمیری کام پر زور دیا تھا. ھم لوگوں سے جہاں تک بن پڑا اس میں زور لگایا. کھادی کے کام کو منظم کرنے کیلئے کوکناڈا کانگریس میں کھادی بورڈ قائم کیا. سیٹھ جمنا لال بزاز کی لیڈری ی میں یہ کام منظم صورت سے چلنے لگا. میرا بھی بہت وقت کھادی پرچار اور قومی تعلیم ھی میں صرف ھوتا رھا. کھادی میں روز بروز ترقی ھوتی گئی لیکن قومی تعلیم کا کام گرتا گیا. اس طرح دوسری طرف کونسل میں داخلے کے طرفداروں کا زور بڑھتا گیا. جتنے لوگ جیل سے نکلے ان میں بہت سے لوگ سوراج پارٹی کے پروگرام کو ھی زیادہ پسند کرتے. قومی تعلیم میں ھم لوگوں نے شروع ھی سے زبردست غلطی کی تھی، وھی اس کے ناکام ھونے کا سبب ھوئی. ھم نے

زیادہ سے زیادہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نقل کی تھی۔ لیکن ہمارے پاس نہ اتنے ذرائع تھے نہ اتنی رقم تھی کہ ان کا مقابلہ کرسکتے۔ ساتھ ھی قومی اسکولوں کے تعلیم پائے ہوئے طالبعلموں کو سرکاری یا غیرسرکاری نوکریاں پانے کی وہ آسانی بھی نہیں تھی جو سرکاری اسکولوں کے طالب علموں کو حاصل تھی۔ ھاں ھم نے ایك دو باتوں میں کچھ اپنی خصوصیت رکھی تھی۔ جیسے سبھی قومی اداروں کے طالب علموں کیلئے چرخہ چلانا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ رھن سہن میں بھی دوسرے طالب علموں کے مقابلہ میں بہت فرق تھا۔ کیونکہ وہ سادگی اور مہاتماجی کی سچائی اور اھنسا کی فضا میں رہتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی سادہ اور کردار روشن ھوا کرتا تھا۔ کچھ طالب علم ایسے بھی تھے جنہوں نے گورنمنٹ کی یونیورسٹیوں کے مقابلہ کی قابلیت پیدا کرلی تھی۔ لیکن ایسے طالب علموں کیلئے کوئی ایسا میدان عمل نہیں ملا جہاں وہ روزی بھی کما سکیں اور ملك کا کام بھی کرسکیں۔ اس لئے اب صرف ایسے ھی طالب علم آنے لگے جو پہلے ھی سے ملك کی خدمت اپنا مقصد بنا چکے تھے یا والدین ان کو ایسے کام میں لگانا چاھتے تھے۔ طالب علموں کی

تعداد گھٹتی گئی. ہم نے طریق تعلیم میں کبھی کبھی تبدیلیاں بھی کیں. سرکاری یونیورسٹی کی پیروی چھوڑ کر، جیسا گاندھی جی نے شروع میں کہا تھا. ہم نے ملك کے خادم تیار کرنے کی طرف زیادہ دھیان اپنے طریقه میں دیا. لیکن یه کافی نہیں ھوا. روز بروز قومی تعلیم گاھیں گرتی ھی گئیں یہاں تك که بہت سی بند بھی ھوگئیں، اور جو چلتی رھیں وه ادھه مری ھوکر. یه ظاھر ھوگیا که قومی درسگاھوں کو صرف خادم تیار کرنے کے کام میں لگ جانا چاھئے. ظاھر ھے که اس طرح طالب علم جو ملك کی ھی خدمت کو اپنا مقصد بنالیں کم تعداد میں ملیں گے. اس طرح طالب علموں کی تعداد روز بروز کم ھوتی گئی.

ھاں کھادی کا کام بڑھتا گیا. سوراج پارٹی نے بھی کھادی کو اپنایا. کیونکه دوسری جماعت والوں سے ان کو مقابله کرنا تھا. کھادی ھی ایك ایسی چیز تھی جو ان کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرسکتی. اس وقت کھادی مہین اور اچھی بنانے کی کوشش کی گئی. بکری بھی بڑھائی گئی. بکری اور پرچار کے خیال سے کہیں کہیں کھادی کی نمائش بھی کی جاتی تھی. جس میں بہتر

سے بہتر کھادی رکھی جاتی تھی۔ ایسے لوگ بھی جو کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس نمائش میں آتے اور کھادی خریدتے۔ میں ان نمایشوں میں خاصکر بہار میں بہت حصہ لیتا۔ اور اپنے ہاتھوں بہت کھادی بیچا کرتا۔ پیداوار کے مرکزوں میں بھی بہت جایا کرتا۔ وہاں ایسے ایسے منظر دیکھنے میں آتے جن سے کھادی کے بارے میں اور بھی پریم اور جوش بڑھتا۔ ہم نے ان مرکزوں میں دیکھا کہ غریب عورتیں چار چار پانچ میل کی دوری سے چتھڑے لپیٹے ہوئے ایک چتھڑے میں اپنا کاتا ہوا سوت لاتیں۔ اور اس کے عوض میں کچھ پیسے نقد اور روئی لے جاتیں۔ کہیں کہیں تو دن بھر یہ سلسلہ جاری رہتا۔ مرکز میں کام کرنے والے سوت تول کر لینے اور روئی تول کر دینے میں دن بھر لگے رہتے۔ اگر کسی دن اتفاق سے روئی گھٹ جاتی یا پیسے گھٹ جانے سے سوت خریدنا بند کرنا پڑتا، تو ان غریبوں کا مایوسانہ چہرا دیکھ کر بہت دکھ ہوتا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ کھادی کے پرچار کے بغیر ان غریبوں کا کوئی دوسرا سہارا نہیں ہوسکتا۔ جہاں کہیں مرکز کھولا جاتا وہاں غریبوں کے دل میں ایک نئی امید جھلکنے لگتی۔ اس

زمانہ میں کھادی کے متعلق خاصکر بہار میں سب سے بڑا سوال کھادی بیچنے کا رھتا. جتنی کھادی بیچ سکتے تھے اس سے کہیں زیادہ کھادی پیدا کرتے تھے. صوبہ کے باھر اور صوبہ میں ھمارا بہت وقت کھادی بیچنے اور بکوانے میں لگتا. کیونکہ ھم دیکھتے تھے کہ اسکی بکری اگر بڑھ جائیگی تو پیداوار میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوگی. جو لوگ ان باتوں کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے ان کو تعجب ھوتا تھا کہ ھمارا وقت کیسے کٹتا ھے. لیکن ھم کو اپنی منشاء پوری کرنے کے لئے ھی کافی وقت نہیں ملتا تھا. اس کام میں لگ جانے کے بعد کونسل کے جھگڑے سے بھی کچھ چھٹکارا ملتا. ھم نے دیکھا کہ کانگریس کے اکثر لوگ «چٹ پٹے» کام میں ھی زیادہ دلچسپی لیتے تھے. اس طرح کے تعمیری کام میں، جن میں سکون سے وقت صرف کرنا پڑتا، ان کا کم جی لگتا تھا.

کونسل میں داخلہ کے متعلق بحث کے وقت ھم لوگوں کو ایک بات کی فکر رھتی. ھم اس بات کے جاننے کے مشتاق رھتے تھے کہ مہاتماجی کا کیا خیال ھے؟ کیا وہ سبھی بڑے بڑے لیڈروں کی مخالفت، جو ھم کر رھے تھے، پسند کریں گے؟ کونسل

میں داخلہ کے متعلق ان کے خیالات کیا ہوں گے؟ ہمارے دل میں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا تھا. ہم لوگوں کو یقین تھا کہ وہ داخلہ کی مخالفت ضرور کریں گے. لیکن خطرہ اس بات کا ہوتا تھا کہ سبھی بڑے بڑے لیڈروں کی مخالفت کرنی ہمارے لئے مناسب تھی یا نہیں. خاصکر ایسی حالت میں جب مخالفت کے سبب سے کانگریس کے اندر اتنی بڑی پھوٹ پڑ گئی کہ ایک جماعت الگ پارٹی بنا کر کام کرنے پر اتر آئی. مہاتماجی کے خیالات جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، کیونکہ ان سے کسی قیدی کو بھی جیل میں ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا، جو پوچھنے پر کسی کو ان کے خیالات کو بتا سکتا. جو لوگ کبھی انسے باضابطہ ملنے جاتے تھے ان سے وہ کبھی کچھ نہ کہتے. کیونکہ جو بات کہنے کا ان کو باضابطہ اختیار نہیں تھا اسے کسی طرح کبھی اشارے سے بھی کہہ نہیں سکتے تھے. پہلے پہل تو ہم لوگوں کو کچھ پتہ اس وقت لگا جب شری شنکر لال بینکر جن کو ینگ انڈیا کے پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے مہاتماجی کے ساتھ اس مقدمہ میں دو سال کی سزا ملی تھی، اپنی میعاد پوری کر کے باہر نکلے تھے. اس وقت ہم لوگوں کو یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ مہاتماجی کے کونسل کے متعلق

خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ جس وقت دلی کے
خاص اجلاس میں مولانا محمد علی نے سمجھوتہ کی بات پیش کی،
ہم لوگ اسے بالکل ناپسند کرتے تھے۔ شری راج گوپال اچاری،
جو اس وقت تک اہم تبدیلی نہ چاہنے والوں کی لیڈری کر رہے
تھے، جان بوجھکر دلی کانگریس میں نہیں آئے۔ سردار ولبھ
بھائی پٹیل اور میں اس سمجھوتے سے بہت رنجیدہ تھے، لیکن
ہم لوگوں کے سامنے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ہم نے مجبوراً
اس تجویز کو مان لیا۔ کیونکہ ہم نے سوچا کہ اگر ہم اس کو
نہیں مانتے ہیں تو ایک اور ٹولی کا لیڈر ہمارے مخالف ہو جائیگا۔
مولانا محمد علی کا ذاتی خیال بالکل خلاف تھا، لیکن انہوں نے
سوراجیوں کو بغیر کانگریس کا نام لئے کونسل میں جانے کی
اجازت دے دی۔ جو تقریر انہوں نے کی اس میں انہوں نے
کونسل میں جانے سے جتنی برائیاں ہوسکتی تھیں سبھی بیان
کر دیں۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اگر
کچھ لوگ اس گھناؤنے کام کو کرنا ہی چاہتے ہیں۔ تو انہیں کرنے
دو، مرنے دو۔ اس مسئلہ پر بات چیت کے وقت انہوں نے
ایک بات اور کہی جس کا اثر ہم میں سے بہت سے لوگوں پر

پڑا. انھوں یہ کہا کہ کہیں سے ان کے پاس بے تار کی تار برقی سے خبر آئی ھے کہ جھگڑے کو ختم کرنا چاھئے، جو جانا چاھتے ھیں ان کو جانے دینا چاھئے. لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان کا اشارہ گاندھی جی کی طرف تھا. لوگوں نے اس وجہ سے ان کی بات مان لی. لیکن بعد میں معلوم ھوا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی.

چودھواں باب

سنہ ۱۹۲٤ع کے شروع ھی سے میں ھائی کورٹ میں اس مقدمہ کا کام کرنے لگا جس میں میں نے سنہ ۱۹۲۰ع میں کام کیا تھا، اور جو اس وقت ھائی کورٹ میں اپیل کی شکل میں پیش ھوا تھا. کیونکہ عدالت ضلع میں ھمارے موکل ھار گئے تھے. نان کواپریشن شروع ھونے سے پہلے ھی میں نے ان کو زبان دے دی تھی اور اپنے سب دوستوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس مقدمہ میں جب ضرورت پڑیگی اسوقت میں کام کر دونگا. بس اتنا ھی مجھے یاد ھے کہ اس درمیان میں میں نے ایک بار ھائی کورٹ میں کام کیا تھا، جب کہ فریق مخالف ھمارے مؤکل کی تمام جائداد پر دخل یابی چاھتا تھا. اب جب اپیل پیش ھوئی تو اس وقت مجھے خاص کر اس لئے کام کرنا پڑا کہ ھمارے مؤکل ابتدائی عدالت میں ھار چکے تھے، اگر وہ اپیل میں نہ جیتتے تو سب کچھ کھو بیٹھتے. میرا ان سے اس وقت سے تعلق تھا جب میں پڑھتا تھا، میرے انگلینڈ بھاگ کر جانے کے وقت انھوں نے کچھ روپیوں سے بھی مدد کی تھی. وکالت شروع

کرتے ھی دھنی لوگوں میں سے ایک وھی ایسے تھے جنہوں نے ھائی کورٹ کے اپنے تمام مقدمات میں مجھسے وکیل مقرر کر لیا تھا. جب وہ مقدمہ ان پر چلایا گیا تو ابتدا سے مجھسے ھی انھوں نے لگا رکھا تھا. میں اپنا دھرم سمجھتا تھا کہ مجھ سے جو کچھ ھوسکے ان کے لئے کرنا چاھئے. خاصکر جب کہ وہ مشکلات میں تھے. اس لئے میں نے اپیل میں کام کرنا شروع کر دیا تھا.

ابھی بحث ھوئے چند ھی دن گذرے تھے کہ اخباروں سے معلوم ھوا کہ مہاتما گاندھی جی جیل میں بیمار پڑگئے ھیں اور پونا کے اسپتال میں لے جائے جا کر ان کے پیٹ میں نشتر دیا گیا ھے. میں نے پونا جانے کا ارادہ کیا اور دو چار دن کی چھٹی لیکر روانہ ھوگیا. پونا پھونچ کر میں نے اسپتال میں مہاتماجی سے ملاقات کی. وہ بہت کمزور ھوگئے تھے لیکن زندگی کے متعلق کوئی خطرہ نہیں تھا. مجھسے دیکھ کر وہ بہت خوش ھوئے. میں نے اس کمزوری کی حالت میں ان سے کوئی بات کرنی مناسب نہیں سمجھی. اور اگر میں چاھتا بھی تو شاید وہ کسی سیاسی مسئلہ پر خود ھی باتیں نہ کرتے. کیونکہ وہ ابھی تک

قیدی تھے۔ میں ملاقات کرکے واپس پٹنہ چلا آیا اور ادھر گورنمنٹ نے ان کو رہا کردیا۔ اچھے ہونے تک وہ پونا ہی رہے۔ اس کے بعد "جوھو" بمبئی میں سمندر کے کنارے حصول تندرستی کے لئے چلے گئے۔ سیاسی معاملات میں حصہ لینے کے قابل ہوتے ہی، کونسل کے متعلق جو جھگڑا تھا۔ اس میں انہوں نے ہم لوگوں کی تائید کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ان کا یہ اس وقت کا خیال تھا، اب وہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال سے ملنے کے بعد اپنی آخری رائے قائم کریں گے۔

میں تو مئی کے آخر تک اس مقدمہ میں لگا رہا۔ اس درمیان میں مہاتماجی کی بات چیت ان لوگوں سے ہوئی۔ انہوں نے ان لوگوں سے سمجھوتہ کرنا چاہا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سوراج پارٹی کونسل کا کام جیسا کرنا چاہتی ہے ویسا کرے، لیکن کانگریس کے تعمیری کام میں بھی وہ مدد دے۔ تعمیری پروگرام میں سب سے بڑا کام کھادی پرچار کا تھا، اس لئے انہوں نے تجویز کی کہ سبھی لوگوں کو چرخہ چلانا اور کانگریس کا چندہ سوت کی شکل میں دینا چاہئے۔ اس بات کو وہ لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، کیونکہ چرخہ کے مسئلے میں سب کو

پورا بھروسہ نہیں تھا. بہت سے تو چرخہ چلانے میں وقت کی بربادی ھی سمجھتے تھے اور بہت سے لوگوں کے دل میں یہ شک بھی تھا کہ اگر اس قسم سے کانگریس کا چندہ اپنے ھاتھ سے کتے ہوئے سوت کی شکل میں ھی دینے کا دستور ھو گیا تو کانگریس چرخہ چلانے والوں کے ھی ھاتھ میں چلی جائے گی اور وہ کانگریس پارٹی کے ساتھ نہ معلوم کیا برتاؤ کریں گے.

انھیں سب باتوں پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک ھوئی، جس میں مہاتماجی نے اپنی تجویز پیش کی. سوراج پارٹی کے نیتاؤں نے اس کی مخالفت کی، پھر بھی تھوڑے ووٹوں سے مہاتماجی کی تجویز کامیاب ھوگئی. لیکن اس جیت کو انھوں نے اپنی ھار کہا اور "ینگ انڈیا" میں ایک بہت ھی دردناک مضمون لکھا. اس کے بعد وہ اس فکر میں لگ گئے کہ سوراج پارٹی کے ساتھ کس طرح کا سمجھوتہ ھونا چاھئے. آخر میں ایک سمجھوتہ ھوا. پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پھر بیٹھک ھوئی. سمجھوتہ کے ساتھ "آل انڈیا چرخہ سنگھ" قائم کیا گیا، جو کانگریس کے ذریعہ سے ایک مکمل لیکن اپنے کاروبار میں ایک آزاد انجمن مانی گئی. کانگریس کا جو کچھ دھن

«کھدر بورڈ» میں تھا وہ سب چرخہ سنگھ کے سپرد کر دیا گیا. اس سمجھوتے کا مطلب یہ ہوا کہ اس طریقہ سے کانگریس کے دو حصے مان لئے گئے: ایك کونسلوں میں کام کرنے کے لئے، جس کا اختیار سوراج پارٹی کے ھاتھ میں دے دیا گیا اور دوسرا تعمیری کام کے لئے، جو گاندھی جی کے ھاتھ میں رھا. ان لوگوں کو کونسلوں میں جانے اور اس کے متعلق کسی قسم کی مدد کرنے میں اصولی مشکل معلوم ھوتی تو ان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ غیر جانبدار رہ سکتے ھیں، لیکن دوسرے لوگ جو مدد دینی چاھتے ھیں دے سکتے ھیں اور جو خود کھڑا ھونا چاھتے ھیں وہ امیدوار بھی بن سکتے ھیں. سوراج پارٹی کے لوگوں نے وعدہ کیا کہ کونسل کے اندر یا باھر، ان سے جہاں تك ھو سکے گا، تعمیری پروگرام کی مدد کریں گے. بیلگاؤں میں اس سال کانگریس کا سالانہ جلسہ ھونے والا تھا. مہاتما جی اس کے صدر ھوئے. بالاتفاق سمجھوتہ وھیں منظور ھو گیا.

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے متفقہ جلسہ کے بعد، جس میں اپنی تجویز کو منظور کرانے کے بعد بھی مہاتما جی نے اپنی ھار مانی تھی، ایك ایسا واقعہ پیش آیا جو بہت تلخ تھا، جسکا اثر

بہتوں کے دل پر گہرا ہوا. مہاتماجی اس تجویز کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے، ایک ممبر نے بیچ میں کچھ بول کر چھیڑ چھاڑ کی. جسکا اثر ان کے دل پر اتنا ہوا کہ بولتے بولتے انکی آواز بھرا گئی اور کچھ منٹ کے بعد وہ بالکل چپ ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے. میں نے ایک ایسا منظر ایک دفعہ اور بھی دیکھا تھا، جسکا ذکر اس سے پہلے ایک جگہ کرچکا ہوں. مہاتماجی کی یہ حالت دیکھ کر بہت سے لوگ بے چین ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے. مہاتماجی کے بیکل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جن مہربان نے چھیڑ خانی کی تھی وہ مہاتماجی کے معتبر لوگوں میں سے تھے. ان کو اس بات کی بہت چوٹ لگی تھی کہ ایک ایسے آدمی نے اس طرح کی بات کیوں اٹھائی. ان بیچاروں کو بہت دکھ ہوا. انھوں نے بہت معافی مانگی. مہاتماجی اس واقعہ کے پہلے سے ھی بہت متاثر تھے. کیونکہ اس تجویز کے تھوڑے ووٹوں سے پاس ہو جانے کے بعد سوراج پارٹی کے لوگ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال کے ساتھ جلسہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جلسہ میں ایسے ھی لوگ رہ گئے تھے جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ

مہاتماجی کے ساتھ ھیں. یہ بیٹھک احمد آباد میں ھوئی تھی. ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ھوا تھا کہ گاندھی جی اپنی ھار مان کر بہت زوروں سے اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی نہ کسی طرح آپس کے جھگڑے کو ختم کرکے سوراج پارٹی کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر ھی لینا چاھئے. ھم نے دیکھا کہ اگر مہاتماجی چاھتے اور زور لگاتے تو کانگریس سوراج پارٹی کے ساتھ نہ جاتی اور سوراج پارٹی کو کانگریس سے الگ ھوکر ھی کام کرنا پڑتا. لیکن جہاں وہ اپنے خیالوں میں مضبوط رھنا چاھتے تھے وھاں وہ دوسروں کے خیالوں کا بھی پورا احترام کرتے تھے. اب جب انھوں نے دیکھ لیا کہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے لوگ اپنے خیال میں مضبوط رھنا چاھتے ھیں تو انھوں نے مخالفت چھوڑ دی اور اپنے خیالات پر قائم رھتے ھوئے بھی کانگریس کے ان لوگوں کو جو انکے کاموں میں سوراج پارٹی کی مدد کرنا چاھتے تھے، انھوں نے مدد کرنے کی اجازت دے دی. اس سے ان کی عظمت اور برتری اور بھی سب پر ظاھر ھوگئی. اس سے بھی بڑھکر دوسری مثال سنہ ۱۹٤۷ع میں دیکھنے میں آئی، جس کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائے گا.

مہاتما جی کے جیل چلے جانے کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو میل دیکھا گیا تھا اس میں کمی ہونے لگی تھی. اور جو لوگ کانگریس اور خلافت کمیٹی میں تھے ان میں تو کوئی خاص اختلاف ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا، لیکن عوام کے دلوں میں شک شبہ کی آگ سلگنے لگی. میں اوپر بتا چکا ہوں کہ مالابار کے موپلوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں کسطرح کہی جانے لگی تھیں. سبب کچھ بھی ہو. لیکن اس میں شک نہیں کہ موپلوں نے بعض ہندوؤں کے ساتھ زیادتیاں ضرور کی تھیں. لیکن وہ باتیں بہت بڑھا چڑھا کر دوسری جگہوں پر کی گئیں. ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ میں مدد دے کر گاندھی جی نے اور ان کی لیڈری میں کام کرنے والے دوسرے ہندو نیتاؤں نے زبردست غلطی کی. ان لوگوں ھی کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہوئی. اور اس بیداری کا یہ نتیجہ ھے کہ اس طرح سے ہندوؤں کے ساتھ وہ لوگ زیادتی کرنے لگے. جو لوگ زیادہ سمجھداری سے باتیں کرنے کا دعوی کرتے تھے وہ یہ بھی کہنے لگے کہ اسلام کٹڑپن سکھاتا ھے. اور چونکہ ساری خلافت تحریک مذھبی تحریک

تھی اس لئے اس کا ایک ھی نتیجہ ھوسکتا تھا. وہ یہ کہ مسلمانوں میں کٹرپن بڑھے. اسی کا ھی نتیجہ مالابار میں ھندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور صرف ھندو ھونے کی وجہ سے ان کے گھر بار لوٹے جانیکی شکل میں دیکھنے میں آیا. دوسری طرف مسلمانوں کا کہنا تھا کہ مالابار کی باتیں بہت بڑھا چڑھا کر ھندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف جذبہ ابھارنے کے لئے کہی گئی تھیں. اگر کہیں مسلمانوں نے کسی ھندو کے ساتھ زیادتی کی تو اس لئے نہیں کہ وہ ھندو تھا بلکہ اسلئے کہ اس نے موپلوں کے خلاف برٹش گورنمنٹ کی مدد کی. علی برادران کا کہنا تھا کہ کانگریس اور ھندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری نہیں پیدا ھوئی بلکہ اس بیداری کا سبب یہ تھا کہ ان کے مذھبی عقیدوں پر برٹش گورنمنٹ نے اپنے اعتبار سے گہری چوٹ دی تھی. اگر کانگریس یا گاندھی جی انکا ساتھ نہ دیتے تو بھی وہ اس مسئلہ کو لیکر برٹش گورنمنٹ سے ضرور لڑتے، چاھے اس لڑائی کا طریقہ کوئی دوسرا ھی کیوں نہ ھوتا، اور اسکا نتیجہ خواہ کچھ بھی ھوتا. کانگریس اور ھندوؤں نے جو مدد کی تھی اس کے وہ شکرگذار ضرور تھے، لیکن ھندوؤں اور کانگریس کو بھی یہ

نہیں بھولنا چاھئے کہ مسلمانوں کے آجانے سے اُن کی بھی طاقت کتنی بڑھ گئی. اور اب وہ اس قابل ھوئے ھیں کہ برٹش گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے کو تیار ھیں.

سنہ ۱۹۱۹ ع دھلی اور جلیانوالہ باغ میں اور بہت سی جگہوں میں ھندو اور مسلمانوں کے خون ایك ساتھ بہے تھے. دونوں نے مل کر برٹش گورنمنٹ کا مقابلہ کیا تھا. جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد دونوں کا میل جول اتنا بڑھ گیا تھا کہ جس سے یہ معلوم ھوتا تھا کہ اب یہ اتحاد کبھی نہیں ٹوٹے گا. لیکن ایك مقام پر برا واقعہ ھونے سے آھستہ آھستہ اس دودھ اور پانی کے میل میں کھٹائی پڑگئی. اگرچہ اس کا اثر فوراً دیکھنے میں نہیں آیا. لیکن تھوڑے ھی عرصہ کے بعد ظاھر ھونے لگا. اسکی سب سے پہلی اور نمایاں مثال سنہ ۱۹۲۲ ع میں مہاتما جی کے جیل جانے کے پانچ چھہ مہینہ کے اندر ملتان میں دیکھنے میں آئی. وھاں مسلمانوں کی آبادی بہت ھے اور ھندؤں کی کم. مسلمانوں نے محرم میں بہت دھوم سے تعزیہ کا جلوس نکالا. بس ھندوؤں سے لڑائی چھڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ بہت سے بے قصور مارے گئے، بہت سے لوگوں کے

گھر لوٹے اور جلائے گئے. غرض کہ سینکڑوں طرح کی زیادتیاں ان کے ساتھ کی گئیں. مسلمانوں کا یہ کہنا تھا کہ «ہندوؤں نے تعزیہ کی بے حرمتی کی. اس پر ڈھیلے اور پتھر پھینکے. جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ھوا. اس وقت انھوں نے بلوہ اور فساد کیا». ہندوؤں کا کہنا تھا کہ «ان کو اس طرح کے پاگل پن کی کاروائی کرنیکی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ وہ ایسا کرسکتے تھے، کیونکہ ان کی طرف سے لڑائی چھیڑنے کی کوئی تیاری نہیں تھی. شہر اور باھر کے مسلمان بہت بڑی تعداد میں ھتھیاربند ھوکر، جیسے کے تعزئے کے جلوسوں میں ھوا کرتا ھے، جلوس میں شریك تھے. ہندو ایسے بیوقوف اور ناسمجھ نہیں تھے کہ ایسے جلوس کیساتھ وہ چھیڑ چھاڑ کرتے. مسلمان ہندوؤں کو لوٹنے اور پیٹنے کے لئے تیار ھوکر آئے تھے، اس لئے انھوں نے تعزیہ پر پتھر پھینکنے کا صرف ایك بہانہ بنا کر لوٹ مار شروع کردی تھی». کانگریس اور خلافت والوں کا کہنا تھا کہ «اس میں نہ ہندوؤں کا قصور تھا نہ مسلمانوں کا بلکہ برٹش گورنمنٹ ھی ہندو مسلم اتحاد دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اسی کے ملازموں نے یہ جھگڑا کرایا. یہ ھوسکتا ھے کہ ڈھیلے اور پتھر تعزیہ پر،

جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں، پھینکے گئے ہوں، مگر وہ ہندوؤں نے نہیں پھینکے تھے، یہ کام تو گورنمنٹ کے آدمیوں کی طرف سے کیا یا کرایا گیا تھا. انھوں نے مسلمانوں میں اشتعال پیدا کر کے ہندوؤں کو لٹوایا. پٹوایا اور مروایا۔. اس وقت وہاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن تھے. وہ بہت ہوشیار اور چالباز افسر سمجھے جاتے تھے. بہت سے لوگوں کا تو یہی کہنا تھا کہ اس فساد کی جڑ وہی تھے. ان کی ترقی بھی بعد میں بہت ہوئی. وہ تھوڑے ہی دنوں بعد گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم سکریٹری اور بعد میں پنجاب کے گورنر بھی ہو گئے.

جو بھی ہو، اس میں شك نہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی تھی. جب اس کی خبر ملی تو اس وقت حکیم اجمل خان کیساتھ، جو کانگریس کے صدر بھی تھے، ہم سب لوگ، جن میں پنڈت مدن موہن مالوی، سیٹھ جمنا لال بزاز، شری پرکاشم وغیرہ بھی تھے، اور میں بھی تھا، ملتان گئے. وہاں اسٹیشن پر اترتے ہی ہم لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ہندو اور مسلمانوں میں بہت بڑی کشیدگی ہو گئی ہے. اب وہ اسی پر جھگڑنے لگ گئے کہ ہم لوگ کہاں ٹھہرائے جائیں. ہندو سمجھتے

تھے کہ ہم لوگ اگر مسلمانوں کے انتظام میں ٹھہرائے گئے تو صرف مسلمانوں ھی کی بات سن کر ہم اپنی رائے قائم کرلیں گے، اور مسلمانوں کو بے قصور مان لیں گے. اسی طرح مسلمان سمجھتے تھے کہ اگر ھم ھندوؤں کے انتظام میں ٹھہرائے گئے تو ھم ھندوؤں کی بات سن کر مسلمانوں ھی کو قصوروار قرار دیں گے. لیکن ھم لوگ قصور کی جانچ کرکے قصوروں کو متعین کرنے کے لئے ھی وھاں نہیں گئے تھے، بلکہ دکھیوں اور مصیبت زدوں کو تسلی دینے اور آپس کے پھٹے ہوئے دلوں کو پھر سے جوڑنے گئے تھے. ھم نے فیصلہ کیا کہ ھمیں دو جماعتوں میں بانٹ کر ایک کو ھندو ٹھہرائیں اور دوسری کو مسلمان. میں اور حکیم اجمل خان کیساتھ ایک مسلمان نواب کے ھاں ٹھہرایا گیا. دوسرے لوگ مالوی جی کے ساتھ کسی ھندو کے باغ میں ٹھہرے.

ھم سب ساتھ مل کر ان مقاموں کو دیکھنے گئے جن کو مسلمانوں نے لوٹا اور جلایا تھا، ان ھندو مردوں اور عورتوں سے بھی ملاقات کی جن کے گھر کے لوگ مارے گئے تھے. وہ منظر بہت ھی تکلیف دہ تھا. گھر کا جو سامان نہ لوٹا جاسکا اسکو انھوں نے اکٹھا کرکے آگ لگا دی اور جلادیا. جہاں آگ

نہیں لگائی وہاں سب چیزوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا. یہاں تک کہ گیہوں پیسنے کی چکی اور مسالہ پیسنے کی سل اور بانٹ بھی نہیں چھوڑے. ایک جگہ تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ پنجرے کو جس میں طوطا پلا ہوا تھا، طوطے کے ساتھ گھر کے جلتے ہوئے سامان کی آگ میں ڈال دیا تھا. عورتوں نے رو رو کر اپنے دکھڑے سنائے. اس کا اتنا اثر ہوا کہ حکیم اجمل خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے. ہم ہندوؤں کے دل تو پر گہرا اثر پڑ ھی رہا تھا. ڈپٹی کمشنر سے بھی ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی. مالوی جی نے اس بات پر بہت زور دیا کہ قصورواروں کو سخت سزا ملنی چاہئے. یہ بات مجھے کھٹکتی تھی، لیکن وہاں کوئی دوسرا علاج ھی نہیں تھا. پہلے ہم لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ جلسے کئے. دونوں کو حکیم صاحب اور مالوی جی نے سمجھایا. اس کے بعد دونوں کے ملے جلے جلسے ہوئے. جس سے کسی حد تک دونوں میں دشمنی کا جذبہ کم ہوا. ہم لوگوں کے وہاں جانے کا اثر اچھا ہوا. اور وہاں کچھ پر امن فضا قائم کرکے ہم لوگ واپس آئے. مالوی جی نے وہاں بھی ایک بات کہہ دی تھی، وہ یہ کہ ہندوؤں کے متحد نہ ہونے

کی وجه سے هی ان کے ساتھ اس قسم کی زیادتی هوئی. اس لئے ان کو اب متحد هوجانا چاهئے. اس بات کو انهوں نے بڑی خوبی سے کہا، جس سے هندو مسلم دشمنی بڑھنے کا خطرہ پیدا نهیں هوسکتا تها اور نه کوئی یه کهه سکتا که هندوؤں کا اتحاد مسلمانوں سے لڑنے کے لئے یا ان کی مخالفت کے لئے کیا جائے گا.

مسلمانوں میں فضا کچھ سدھر گئی. لیکن یه بات چھپی نه رهی. دوسری جگه کے هندوؤں میں بهی کچھ جوش پیدا هوا، هندوؤں کو متحد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی. تهوڑے هی دنوں بعد «گیا» میں کانگریس هونے والی تهی. کچھ هندوؤں نے هندو سبها کرنے کا خیال کیا. محترم مالوی جی کو صدر بنانے کا ارادہ هوا. مالوی جی نے صدر بننا اس شرط پر منظور کیا که میں بهی سبها میں شریك هوں اور ان کو دعوت دوں. میں نے اس بات کو منظور کرلیا، کیونکه مجھے اس میں کوئی برائی نظر نهیں آئی. بعد میں جب هندو سبها کا کانگریس سے اختلاف هوا تو مالوی جی نے اس بات کو مجھے یاد دلایا که میرے هی کهنے پر انهوں نے «گیا» میں صدر هونا منظور کیا تها. بهرحال جو کچھ هو، سبها «گیا» میں پوری کامیابی سے

ختم ہوئی. سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کا وہاں الگ سنگھٹن قائم کرنا طے پایا.

سوامی شردھانند جی نے مالوہ کے راجپوتوں کو جو مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ان میں اب بھی ہندو دستوروں کی علامتیں موجود تھیں اور ہندوؤں کے رسم و رواج کو بہت سی باتوں میں وہ مانتے تھے، ان کو شدھہ کرکے ہندو بنانے کی کوشش کی. مسلمان خواہ کسی جماعت اور خیال کا کیوں نہ ہو، کسی ہندو کا مسلمان بنانا برا نہیں سمجھتا، لیکن سوامی شردھانند جی کی شدھی تحریک کی وجہ سے ان سے مسلمان بہت بگڑ گئے. یہاں تک کہ ان کے جانی دشمن بھی ہو گئے. کہیں کہیں ہندو مسلمان بلوے بھی ہوتے رہے. نتیجہ یہ ہوا کہ آپس کی دشمنی بڑھنے لگی.

سوامی شردھانند سنہ ۱۹۱۹ع میں، جب دھلی میں «رولٹ قانون» کے خلاف تحریک میں مسلمان بھی شریک تھے، پولیس کی بندوقوں کے سامنے سینے کھول کر کھڑے ہو گئے تھے. اسوقت وہ مسلمانوں میں بہت محبوب ہو گئے تھے. یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان کو جامع مسجد کے اندر کھڑے ہوکر تقریر کرنے کے لئے مجبور کیا تھا. وہی سوامی جی اس شدھی تحریک کی وجہ

سے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ آخر میں دسمبر سنہ ۱۹۲٤ع میں ایک مسلمان کے ھاتھ سے ان کا قتل ہو ھی گیا۔ یہ قتل کئی برسوں کے بعد ھوا۔ لیکن اس کے لئے فضا سنہ ۱۹۲۳ع ھی سے تیار ھونے لگی تھی۔

مہاتماجی نے جیل سے نکلنے کے بعد ایک طرف کانگریسیوں میں کونسل کے سوال پر اختلاف دیکھا اور دوسری طرف یہ دیکھا کہ جو ھندو مسلم اتحاد اتنے لوگوں کی محنت اور ایثار کے بل سے انھوں نے قائم کیا تھا، وہ آپس کی لڑائیوں کے سیلاب میں نیست و نابود ھوگیا۔ اس سال ایک زبردست فساد کوھاٹ میں ھوگیا تھا، جس میں ھندوؤں کے ساتھ بڑی زیادتیاں ھوئی تھیں۔ مہاتماجی کا «علی برادران» پر اٹل بھروسہ تھا، وہ دونوں بھی مہاتماجی کا ویسا ھی احترام کرتے تھے۔ کوھاٹ کے جھگڑے کے متعلق مہاتماجی نے مولانا شوکت علی کے ساتھ جا کر جانچ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن دونوں کا ایک رائے پر قائم نہ ھونے کی وجہ اور اختلاف ھوگیا۔ مہاتما جی بہت ھی بڑے آدمی تھے، کبھی اپنے منہ سے حتی الامکان کسی کی شکایت نہیں کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی انھوں نے کوئی شکایت نہیں

کی. لیکن یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اب تک جیسا ایک دوسرے پر اٹل اور ہمیشہ قائم رہنے والا بھروسہ تھا وہ اب نہیں رہا. لیکن اس بات کو انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا، کام عموماً جیسا پہلے چلتا تھا چلتا رہا.

ان جھگڑوں سے مہاتماجی کچھ اتنے گھبرا گئے تھے کہ انھوں نے یہ سوچا کہ ان کو روکنے کے لئے کوئی بہت بڑا قدم رکھنا ضروری ہوگیا. ابھی چند ماہ قبل وہ زبردست بیماری سے، جس کے لئے ان کے پیٹ میں نشتر دیا گیا تھا، اٹھے تھے، لیکن انھوں نے جان کی پرواہ نہ کرکے اکیس دنوں کا روزہ رکھنے کا ارادہ کرلیا، ان دنوں وہ دھلی میں تھے، وھاں مولانا محمد علی کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے، وھیں انھوں نے روزہ رکھنے کا خیال مستحکم کیا. مولانا محمد علی اور دوسرے بہت سے لوگوں نے اس خیال کے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اپنے ارادے میں اٹل اور قائم رہے، آخر انھوں نے روزہ وھیں شروع کر دیا. مولانا محمد علی اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے. اس خبر کے چھپتے ھی فکر اور پریشانی کی لہر دوڑ گئی. مولانا محمد علی نے سب ھی

جماعتوں اور مذہبوں کے نمایندوں کی ایک کانفرنس طلب کی، اس میں کانگریس کے علاوہ ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، پارسی سبھی جماعتوں کے نمایندے حاضر ہوئے. عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری کلکتہ کے "لارڈ بشپ" بھی کانفرنس میں آئے. کئی دن تک بحث ہوئی. آخر میں جھگڑوں کے جو اسباب ہوا کرتے تھے. مثلاً شدھی، گائے کی قربانی، مسجد کے سامنے باجا بجانا وغیرہ وغیرہ. ان سبھی باتوں پر تجویزیں منظور ہوئیں. مہاتماجی کو اس سے اطمینان ہوا. انھوں نے اکیس دن کے روزے کا جو عہد کیا تھا اسے پورا کرکے ھی روزہ ختم کیا.

میں روزہ شروع ہونے کے ایک دو روز بعد دھلی پہونچ گیا تھا. مہاتماجی، مولانا محمد علی کے گھر ھی میں تھے. دو تین دن کے بعد وہ شہر کے باہر ایک کوٹھی میں لے جاکر رکھے گئے. روزے کے باقی دن انھوں نے وھیں گذارے. میں دوسری جگہ ٹھہرا تھا، لیکن تقریباً سارا دن اور رات کا کچھ حصہ بھی وھیں گذارا کرتا تھا. مہاتماجی کا استقلال، خدا پر بھروسہ اور انکے اپنے مقررہ پروگرام میں مستعدی کی جیسی مثال وھاں دیکھنے میں آئی ویسی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی.

مہاتماجی کا ایک یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ روز چرخہ کاتا کرتے تھے. ان اکیس دن کے روزے میں بھی انھوں نے چرخہ چلانا ایک دن بھی نہیں چھوڑا. روزہ کے کچھ دن گذر جانے کے بعد وہ اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ ان کے لئے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا. پھر چاروں طرف تکیہ لگا کر ان کے سہارے سے وہ بٹھا دئے جاتے، وہ اپنے معمول کے مطابق چرخہ کات لیا کرتے. آخر میں انھوں نے جس دن روزہ ختم کیا وہ دن بھی چرخہ چلانے کے بعد ھی اس کو ختم کیا. پرارتھنا تو مقررہ وقت پر روزانہ صبح و شام ھوا ھی کرتی تھی. محترم مالوی جی کچھ دیر کے لئے روزانہ «شری مد بھگوت گیتا» کی کتھا سنایا کرتے تھے. خدا پر ان کا بڑا اٹل بھروسہ تھا، اس بات کو وہ مانتے تھے کہ خدا کو اگر ان سے کچھ اور کام لینا ھے تو وہ روزے کی میعاد کو حسن و خوبی سے ختم کرا دے گا. ڈاکٹر انصاری ان کو برابر دیکھا کرتے، پیشاب وغیرہ بھی جانچا کرتے. ان کا خیال تھا، اور روزہ شروع ھونے سے پہلے ھی انھوں نے مہاتماجی سے بہت کچھ کہہ کر یہ وعدہ لے لیا تھا کہ اگر ایسا سمجھا گیا کہ روزہ کی وجہ سے ان کی جان خطرہ میں ھے تو

اس حالت میں. چونکہ وہ روزے کی وجہ سے مرنا نہیں چاہتے تھے. روزہ توڑ کر وہ کچھ کھانے بھی لگیں گے. اس وجہ سے ڈاکٹر انصاری اس خیال سے دن میں کئی بار دیکھتے اور امتحان کرتے. پیشاب دیکھنے میں ان کو ڈر ہونے لگا. کہ وہ کٹھن وقت اب نزدیك آرہا ھے. اس بات کی اطلاع انھوں نے مہاتماجی کو دی. دوسرے دن انھوں نے صاف کہہ دیا کہ «اب روزہ رکھنا خطرناك ہوگا آج آپکو غذا لینی ھی چاھئے». مہاتماجی نے ان سے کہا کہ «آپ نے کیا سب باتیں سوچ لی ھیں اور سب کچھ دیکھ لیا ھے؟. کیا پھر بھی آپ کی یہی قطعی رائے ھے؟. لیکن آپ کے فن میں ایك بات کا ذکر نہیں ھوگا، اور وہ پرارتھنا ھے. صرف آج مجھے چھوڑ دیجئے. کل اگر ایسی ھی حالت رھی تو میں اپنے عہد کو پورا کردوں گا اور کھانا کھالوں گا». دوسرے دن جب ڈاکٹر انصاری نے امتحان کرکے دیکھا تو وہ سب علامتیں، جن سے انھوں نے خطرہ محسوس کیا تھا، غائب ھوگئی تھیں. ان کو خود بھی اس کا بڑا اچنبھا ھوا. اس کرامت کا حال انھوں نے اپنے تمام مخلص دوستوں کو بتایا. مہاتماجی نے اس کے بعد کئی بار اکیس دن کے روزے

رکھے۔ لیکن چونکہ یہ وقت پہلا تھا اس لئے لوگوں کو بڑی پریشانی تھی۔ لیکن روزہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اب دہلی کے جلسہ کے بعد فضا بہت سدھری ہوئی معلوم ہوئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ آپس کے جھگڑے اب نہیں ہوں گے۔ اگر کہیں جھگڑے کا سبب دیکھنے میں آیا بھی تو آپس کی بات چیت یا پنچایت سے جھگڑے کا فیصلہ ہوجایا کرے گا۔ لیکن جتنے جوش اور خوش دلی سے دہلی کا اجتماع ختم ہوا تھا وہ قائم نہ رہ سکا۔ ان کامیابیوں کا جتنی شدت سے پرچار ہونا چاہئے تھا وہ بھی نہ ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایسا معلوم ہوا وہ فیصلے صرف مہاتماجی کے روزہ سے پیدا ہوئی پریشانی کی وجہ سے ہوئے تھے، ان فیصلوں میں وہ ایقان اور بھروسہ نہیں تھا جو ان کو ہندو مسلمان کے دل میں مضبوط مقام دلوا سکتا۔ وقتی کامیابی کے کچھ دنوں بعد پھر آپس کے جھگڑے بلوے ازر فساد شروع ہوگئے۔ مہاتماجی نے "بیل گاؤں" کانگریس کے اجلاس سے پہلے اس قسم کے دو سوالوں کا، جو ملک کو فکرمند کر رہے تھے، حل نکال کر "بیل گاؤں" کانگریس کی کامیابی کے لئے فضا تیار کر لی تھی۔

مہاتماجی نے روزے کئی بار رکھے، جو خاص سبب سے ھی ھوئے. روزوں کے متعلق ان کا یقین اٹل تھا. وہ ان کو نفس کی صفائی کا صحیح ریاض مانتے تھے. یہ بھی سمجھتے تھے کہ کسی مسئلہ میں اگر کامیابی نہیں ھوتی تو اس کا سبب کچھ اپنی ھی خامی ھے. جب صفائی نفس سے وہ سبب دور ھو جائے گا اسوقت کام ضرور ھو جائے گا. جو لوگ گہرائی میں پہونچ کر ان کے خیالوں کو نہیں سمجھ پاتے تھے، اور ملک کے اکثر لوگ ایسے ھی تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ مہاتماجی دوسروں پر دباؤ ڈال کر کام پورا کرانے کیلئے روزے رکھتے ھیں. لیکن ان کے روزے کا نہیں بلکہ ان لوگوں پر جو ان کے ساتھ پریم رکھتے تھے، ان کے پریم کا ھی دباؤ پڑتا تھا. ھاں جو مخالف تھے ان پر محبت کا دباؤ پڑ ھی نہیں سکتا تھا. لیکن ایسے لوگ عام رائے سے، جو روزہ کی وجہ سے بیدار ھوا کرتی تھی، ضرور ڈرتے تھے. اور جو عام رائے کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے ان پر کوئی خاص اثر دیکھنے میں نہیں آتا تھا. لیکن مہاتماجی کو یقین تھا کہ اگر کوئی اثر دیکھنے میں بھی نہیں آتا تو بھی دباؤ پڑے بغیر نہیں رہ سکتا. کیونکہ اصل مقصد تو نفس کی

صفائی ہوتا ہے، جو بغیر ہوئے نہیں رہ سکتا. جب کبھی اس سلسلے میں دوسرے پر دباؤ ڈالنے کا ان کو احساس ہوا، جیسا کہ راجکوٹ کا روزہ تھا. جس کے متعلق انھوں نے بہت کچھ لکھا تھا، تو اس روزہ کو محض اس دباؤ کی وجہ سے انھوں نے غلط اور ناکامیاب بتایا، اگرچہ ظاہر طور پر کامیاب سمجھا جاتا تھا.

پندرھواں باب

اس وقت سے تقریباً پانچ سال تک مہاتماجی اپنا وقت خاصکر تعمیری کاموں میں ھی صرف کرتے رھے. سیاست کا کام، یعنی برٹش گورنمنٹ کو کس طرح مجبور کیا جائے تاکہ وہ ھندوستان کو سوراج دے دے، سوراج پارٹی کے ذمہ رھا. اگرچہ دھلی اسمبلی میں سوراج پارٹی کی اکثریت نہیں تھی پھر بھی دوسری جماعت کے لوگوں کے ساتھ مل کر اس نے اپنے پروگرام میں کامیابی حاصل کی. کیونکہ بجٹ کو نامنظور کرکے وائسرائے کو وہ مجبور کرسکی تاکہ وہ اپنے مخصوص اختیاروں سے کام لیں. لیکن سوراج پارٹی کے اندر بھی کچھ اختلاف راے بھی دیکھنے میں آیا. وہ اختلاف رائے اس بات میں تھا کہ کونسلوں کے اندر یکبارگی اور مکمل عدم تعاون کیا جائے، یا جہاں نان کواپریشن کے لئے برٹش گورنمنٹ کا قانون مجبور کرے، وھاں تو عدم تعاون کیا جائے. جہاں حب وطن کے لئے برٹش گورنمنٹ کا قانون موقع دے وھاں تعاون بھی کیا جائے. پنڈت موتی لال جی نہرو اور دیش بندھو داس کی موت کے بعد، جو

سوراج پارٹی کے لیڈر تھے وہ عدم تعاون کے پورے طرفدار تھے. سوراج پارٹی کا جنم بھی اس قسم کے عدم تعاون کیلئے ہوا تھا. اس وقت سے اب تک پارٹی کے لوگ عدم تعاون ھی کی دوھائی دیا کرتے تھے. لیکن کچھ دوسرے لوگ، جن میں مہاراشٹر کے بعض بڑے لوگ بھی تھے. انقلابی عدم تعاون کی موافقت میں آواز اٹھانے لگے. اس وجہ سے آپس میں تلخی بھی ہوگئی. آخر میں سوراج پارٹی اور اس کی صلاح سے کانگریس نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ سوراج پارٹی کے لوگ کونسل سے نکل آئیں. وہ لوگ نکل بھی آئے. تھوڑے دنوں کے بعد پھر چناؤ ہونے والا تھا. اس انتخاب میں سوراج پارٹی نے صرف اپنے ھی نام سے نہیں بلکہ کانگریس کے نام سے بھی حصہ لیا. اس لئے کچھ زیادہ کامیابی بھی ہوگئی. لیکن اس انتخاب میں ھندو مسلم فسادوں کی وجہ سے جو کشیدگی ہوگئی تھی. اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ پنڈت مدن موھن مالوی اور لالہ لاجپت رائے جیسے معزز لوگ کانگریس کی مخالفت مین ھندو سبھا کی طرف سے الکشن لڑے. جو انقلابی عدم تعاون کے طرفدار تھے وہ لوگ بھی کانگریس کے خلاف الکشن لڑے. لیکن

پھر بھی اس وقت کے آئین کے اعتبار سے جو جیت ھوسکتی تھی وہ زیادہ تو کانگریس ھی کو ھوئی. مہاتماجی نے سوراج پارٹی کے لوگوں کو پورا موقع دیا کہ وہ جس طرح چاھیں اپنا پروگرام چلائیں. کانگریس سے بھی وہ لوگ جو کام لے سکتے تھے، اس کا ان کو کافی موقع دیا گیا. نتیجہ اس کا یہ ھوا کہ چار پانچ سال تک پروگرام آزمائش کرکے موتی لال وغیرہ بھی کونسل چھوڑ کر نان کواپریشن ستیہ گرہ کے پروگرام میں پھر آگئے. یہاں تک پہنچنے میں ان کو کئی سال لگ گئے. لیکن اس کی علامتیں سنہ ۱۹۲٤ ع میں دیش بندھو داس کی زندگی کے آخر زمانے میں دیکھنے میں آنے لگیں.

دیش بندھو داس نے سوراج پارٹی جہاں تک اپنے پروگرام کو چلا سکتی تھی چلانے کی کوشش کی. دو صوبوں یعنی مدھیہ پردیش (سی پی) اور بنگال میں یا تو وزارت بنی ھی نہیں، یا بنگال میں بنی بھی تو توڑ دی گئی. مرکزی اسمبلی میں بار بار بجٹ نامنظور کیا گیا. اس درمیان میں گورنمنٹ نے کبھی کبھی اپنی طاقت بھی خوب استعمال کی. سوراج پارٹی اس کو روکنے مین کچھ کامیاب نہ ھوسکی. اس طرح کونسل کے اندر سے عدم

تعاون کی کمزوری ظاہر ہونے لگ گئی تھی. لیکن دیش بندھو داس نے سوچا کہ سوراج پارٹی نے اپنی طاقت دکھلا دی. اگر اس کے بعد وہ سمجھوتہ کرنے کے لئے بھی اپنی آمادگی ظاہر کرے تو شاید برٹش گورنمنٹ بات چیت کرکے راستہ نکالنے کو تیار ہو جائے. اس زمانہ میں انگلینڈ میں لارڈ برکن ہیڈ، جو ایك کنزرویٹو (قدامت پسند)، تیز مزاج اور نڈر سیاست دان سمجھے جاتے تھے، وزیر ہند ہو گئے تھے. دیش بندھو داس کو ان سے بہت امید تھی. دیش بندھو داس کچھ دنوں کے لئے پٹنہ میں ٹھہرے تھے. باتوں ھی باتوں میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کو لارڈ برکن ہیڈ سے بہت امید ھے، لیکن اگر لارڈ برکن ہیڈ نے ان کو نا امید کیا تو پھر ان کے سامنے مہاتماجی کے چرخہ کے سوا دوسرا راستہ نہیں رہ جائیگا. یعنی گاندھی جی کے پروگرام ھی کو انھیں ماننا پڑے گا. اس امید پر کہ لارڈ برکن ہیڈ ان کی باتوں پر دھیان دیں گے انھوں نے ایك بیان دیا. تھوڑے ھی دنوں کے بعد بنگال پراونشل پولیٹکل کانفرنس (بنگال صوبائی سیاسی کانفرنس) کے صدر ہو گئے. اس تقریر سے، جو انھوں نے کی، سمجھوتہ کرنے کی خواھش ظاہر ہوتی

تھی. لارڈ برکن ہیڈ نے کچھ میٹھے لفظوں کے ساتھ ساتھ لیکن صاف ظاہر کردیا کہ وہ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، جب تک سوراج پارٹی نان کواپریشن کا پروگرام چھوڑ نہیں دے گی. دیش بندھو داس کے دل پر اس بات کی چوٹ لگی. ان کی تندرستی کئی مہینے سے گرتی جا رہی تھی. اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد دارجلنگ میں ان کی موت ہوگئی.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، انکی وفات کے بعد موتی لال نہروجی کی لیڈری میں سوراج پارٹی کے زیادہ تر لوگ نان کواپریشن قائم رکھنے کے موافق ہوگئے تھے. کچھ لوگ انقلابی نان کواپریشن کے موافق ہوگئے. سوراج پارٹی میں پھوٹ پڑگئی. جو جذبہ دیش بندھو داس کے زمانہ میں مدھم دیکھنے میں آیا، وہی روز بروز مضبوط ہوتا گیا. سنہ ۱۹۲۸ع کے آخر میں ظاہر ہوگیا کہ اب کونسل سے کام نہیں چلے گا. نان کواپریشن کو سخت شکل میں کوئی طریقہ اختیار کرنا ہی پڑے گا.

ان چار پانچ برسوں میں مہاتماجی، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اپنا وقت خاصکر تعمیری کام ہی میں صرف کرتے رہے. یہاں پر تعمیری کام کی اگر کچھ تفصیل دی جائے تو بہتر ہوگا. مہاتماجی

چرخہ اور کھادی کو تعمیری کام کے پروگرام کا مرکزی نقطہ یا مرکز مانتے تھے۔ سنہ ۱۹۲٤ع سے کھادی بورڈ، جو کوکناڈا کانگریس کے بعد قائم ہوا تھا، اس کا کام چلاتا رہا۔ اسکے لئے کانگریس کے "تلک سوراج فنڈ" سے کافی رقم بھی ملی تھی۔ جب سوراج پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ ہوگیا اس وقت آل انڈیا چرخہ سنگھ کا قیام آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ کیا گیا۔ سمجھوتے کی شرطوں میں تھا کہ اس طرح کے کام گاندھی جی کے ذمہ رہیں گے اور سوراج پارٹی کے لوگ حتی الامکان مدد کیا کریں گے۔ اسلئے چرخہ سنگھ نے کانگریس کے ذریعہ جنم لیا، لیکن اپنے کام میں ایک آزاد ادارہ رہا۔ جو کچھ کانگریس کا روپیہ یا دھن کھدر بورڈ کو ملا تھا، سب چرخہ سنگھ کو دیا گیا۔ گاندھی جی کا بہت سا وقت چرخہ سنگھ اور اس کے ماتحت صوبوں کے چرخہ سنگھوں کی تنظیم میں لگ گیا۔ اس کام کو بڑھانے کے لئے اگر زیادہ روپوں کی ضرورت ہوئی تو مہاتماجی دورہ کر کے روپے جمع کرتے۔ وہ خود چرخہ سنگھ کے صدر تھے۔ اسکی تمام باتوں کی دیکھ بھال کرنا اور اسکو صحیح راستہ دکھانا ان کا خاص کام رہا۔ ان دنوں چرخہ سنگھ

کا اصول تھا کہ چرخہ بہتر بنایا جائے، جس میں اور بھی اچھی اور زیادہ ترقی ہو اور بنائی کا کام بھی بڑھے. اس لئے اسکے متعلق بہت سے مضامین مہاتماجی لکھتے رہے. اپنی تقریروں میں بھی بہت باتیں بتاتے رہے. جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی جگہوں میں چرخہ کا کام منظم شکل میں چلنے لگا. تمام جگہوں پر ایسے اچھے کارکن ملے جنہوں نے اس تنظیم میں بہت مدد پہونچائی.

چرخہ کی ترقی کئی طرح سے دیکھنے میں آئی. اچھے سے اچھا باریک سوت بننے لگا. موٹے اور باریک سوت دونوں قسم کے کپڑے بہت زیادہ تیار ہونے لگے. اچھے سے اچھے نمونہ کی کھادی بنی جانے لگی، جو مل کے ہر طرح کے بنے ہوئے کپڑے سے مقابلہ کرسکتی تھی. کھادی کا رواج بڑھانے کے لئے کپڑے کی رنگائی اور چھپائی بھی ہونے لگی. ہر ایک کھادی بھنڈار اور صوبائی شاخ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی کھادی تیار کرائے. ساتھ ہی اپنے صوبہ میں یا باہر، جہاں کہیں بھی ہوسکے، بیچ کر کام بڑھائے. اس کے سوا یہ بھی کوشش تھی کہ کھادی قیمت میں بھی مل کے کپڑے کا

مقابلہ کرسکے. اس لئے کھادی کے دام گھٹانے یا کم از کم خرچہ میں اسے تیار کرکے بیچنے کی تدبیر تمام مرکز اور بھنڈار کرتے تھے. باریک کھادی مہنگی پڑتی، مل کے مہین کپڑے کے مقابلہ میں اس کی قیمت زیادہ ہوتی. لیکن موٹے کپڑے میں اتنا زیادہ فرق نہیں تھا. لوگ زیادہ تر مہین کپڑے ھی پسند کرتے. لیکن وہ کم تیار ہوتا. بکری بڑھانے کے لئے اور پرچار کے خیال سے لوگ زیادہ مہین کپڑے ھی پسند کرتے. لیکن وہ کم تیار ہوتا تھا. بکری بڑھانے اور پرچار کے خیال سے جگہ جگہ نمایش کی جاتی، جس میں ہر قسم کی کھادی دکھائی اور بیچی جاتی. نمایش بڑے پیمانے پر کی جاتی، اس میں کھادی بننے کے طریقے بھی دکھائے جاتے. کام کرنیوالے کاریگر کپاس تولنے سے شروع کرکے اوٹائی. دھنائی. کتائی، بنائی، رنگائی، چھپائی وغیرہ تك تمام قسمیں دکھاتے. ان کاموں کے لئے جو نئی نئی مشینیں جس صوبے میں تیار ہوتیں وہ دکھائی جاتیں. سابرمتی کا آشرم تو اس تحقیقات میں لگا رہتا کہ کون سی مشین ایجاد کی جائے، اور کس طرح سوت اتنا مضبوط اور برابر کاتا جائے کہ اس کو آسانی سے بنا جاسکے. ان سب کے لئے وہ آشرم تجربہ گاہ بن گیا تھا. دوسری جگہوں میں

بھی صوبہ واری شاخیں اپنے اپنے میدان میں تحقیقات اور تجربہ کا کام کرتی رہیں۔ اچھے سے اچھے بہت سی قسم کے چرخے نکلے، جن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ کھادی کا رواج بڑھے۔ اس رواج کے ساتھ ساتھ سوت کی مضبوطی ستھرا پن اور باریکی پر بھی زیادہ دھیان دیا جانے لگا۔

کپاس کی کھیتی کے علاوہ ریشمی کھادی کا بھی کافی رواج ہوا۔ جہاں کہیں ریشم کا کام پہلے سے کچھ ہوتا تھا وہاں بہت بڑھگیا۔ کیونکہ ریشمی کپڑے کی بکری کا، چرخہ سنگھ ایک اچھا ذریعہ ہوگیا۔ بدیشی ریشمی کپڑا بہت چالو تھا۔ اب ریشمی کھادی خوبصورتی اور قیمت میں بدیشی ریشمی کپڑے کا اچھی طرح سے مقابلہ کرنے لگی۔ چرخہ سنگھ کا اصول کپاس کی کھادی کو زیادہ مدد دینا تھا۔ کیونکہ اس کا جتنا پرچار ہوسکتا تھا اتنا ریشمی کپڑے کا نہیں۔ ایک تو سب لوگ ریشمی کپڑا لے نہیں سکتے تھے، اور اگر لینا چاھتے تو اتنا پیدا نہیں ھوسکتا تھا کہ سب کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا۔ دوسرے یہ ڈر بھی تھا کہ اگر زیادہ دھیان اس طرف دیا گیا تو کپاس کی کھادی غائب ہو جائے گی، اور اس میں جتنی ترقی ھونی چاھئے وہ دھیان بٹ

جانے کی وجہ سے نہیں ہو سکے گی. پھر بھی چونکہ ریشمی کھادی سے بھی غریبوں کی ویسی ھی مدد ہوتی جیسی کپاس کی کھادی سے، اس لئے بہت سی شاخوں نے ریشمی کھادی کی طرف بھی دھیان دیا. اور کافی و اچھی کھادی بھی تیار ہونے لگی. اس سے موٹی کھادی کی بکری میں بھی مدد پہونچی، کیونکہ اکثر گاھکوں کو جب خوبصورت اور اچھے ریشمی اور کپاس کے باریک کپڑے دئے جاتے تو اس کے ساتھ کچھ موٹے کپڑے بھی دئے جاتے.

اسی طرح سے اونی کھادی بھی بنی جانے لگی. اس کے لئے خاص انتظام کشمیر میں کیا گیا، جہاں ابھی تک یہ فن مٹا نہیں ھے. شمالی ھند میں سردی کے دنوں میں اونی کپڑا ضروری ہو جاتا ھے. چرخہ سنگھ نے کھادی پہننے والوں کے لئے اونی کھادی تیار کرا کے اس کو اپنے بھنڈاروں میں بیچنا شروع کر دیا. اس طرح کی کھادی میں خاصی ترقی ہوئی اور اس کی بکری بھی بڑھ گئی. دوسری قسم کی کھادی کے سوا مل کے بنے ہوئے کپڑے کے ساتھ، اپنی خوبی اور قیمت میں، اونی کھادی بھی بہت حد تک مقابلہ کرتی تھی، اس لئے اسکی مانگ ہمیشہ قائم

رهتی. جس طرح کپاس کی کھادی کی بکری بڑھانے کے لئے خاص تدبیر کرنی پڑتی اس طرح اونی کھادی کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہوتی.

کھادی کے علاوہ مہاتماجی اچھوت پن دور کرنے پر بھی زور دے رہے تھے. اس کے متعلق بھی کانگریسی لوگ پرچار کیا کرتے. ہریجن بستیوں میں جانا، ان کے کام میں مدد دینی، نجی طریقہ سے چھوت چھات نہ ماننے اور اسکے ساتھ ھی اس بات کی بھی تدبیر کرنی کہ ان کے لئے جن مندروں میں جانا منع تھا وہ ان کے لئے کھلوانا. یہ باتیں سبھی جگہ ہو رھی تھیں، لیکن اس کام میں اتنا زور نہیں آیا تھا اور نہ اتنا رواج ہوا تھا جتنا کچھ دنوں کے بعد ہوا. لیکن اس کے لئے بھی فضا تیار ہو رھی تھی. مہاتماجی جو کام خود نہیں کرتے تھے وہ کسی سے اسکو کرنے کیلئے بھی نہیں کہتے تھے. وہ ایك لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر اس کو سابرمتی آشرم میں رکھے تھے، وھاں جو بڑھی اور پلی. جب تك اس کی شادی نہیں ھوئی وہ مہاتماجی اور «با» کے ساتھ ھی رھی. مہاتماجی کے چار لڑکے تھے اور لڑکی ایك بھی نہیں تھی، اس لئے وہ اچھوت لڑکی ھی ان کی لڑکی بن گئی.

یہ اچھوت پن معلوم نہیں کب سے ہندو سماج میں آ گیا تھا. الگ الگ مقاموں میں اس کی الگ الگ شکل ہو گئی تھی. اسکی ایک شکل تو یہ ھے جو بہت کچھ آج بھی موجود ھے. لیکن اب آہستہ آہستہ زور کم پڑتا جا رہا ھے، اس کی یہ سب سے کمزور شکل کہی جاسکتی ھے. یا اس میں ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کے ساتھ کھانے پینے کا بیوہار نہیں کرتے. یعنی ان کے ساتھ بیٹھکر کھانا نہیں کھاتے اور آپس میں شادی بیاہ بھی نہیں کرتے. اس کی بھی بہت شاخیں در شاخیں ہو گئیں ھیں. صرف برھمن. کھتری. شودر. ویش یہی چار قسمیں نہیں ھیں بلکہ ان میں سے ھر ایک کی بہت سی قسمیں بن گئی ھیں. کچھ تو دیس کے وجہ سے اور کچھ دوسری وجوھات کی بنا پر اتنی بہت سی قسموں کا دوسری قسموں سے کھانے پینے کا تعلق نہیں ہوتا. ایک قسم کے اندر بھی بہت سی شاخیں ہو گئی ھیں. ایک ذات کا دوسری ذات کے ساتھ تو کوئی تعلق ہوتا ھی نہیں. شودروں کے ساتھ تو دوسری تین ذاتوں کا کوئی تعلق ہو سکتا ھی نہیں. اسی طرح شودروں میں بھی بہت سی ذاتیں ہو گئی ھیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا. کچھ ذاتوں کیساتھ

تعلق تو ہوسکتا ہے لیکن ان کے ساتھ جسم کا چھو جانا منع نہیں ہے. بعض کا چھوا ہوا پانی استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن پکائی ہوئی چیز نہیں. پکائے ہوئے اناج میں بھی کچی پکی رسوئی کا فرق مانا جاتا ہے. لیکن ان چاروں ذاتوں کے علاوہ ایک پانچویں ذات بھی ہے، جس کا جسم اگر چھو جائے تو جسم کو پاک کرنے کے لئے غسل وغیرہ کا قانون ہے.. اس طرح کا اچھوت پن اتنی دور تک چلا گیا ہے کہ اچھوت سے کسی لکڑی یا رسی کے ذریعہ سے بھی چھو جانا برا مانا جاتا ہے. کہیں کہیں، خاصکر دکن میں تو دیکھنا بھی چھو جانے کے برابر ہوتا ہے. وہاں اچھوت لوگوں کا بعض راستوں سے چلنا بھی منع ہے. مندروں کے اندر تو ان کا جانا ناممکن ہے.

مہاتماجی نے اس قسم کے برے اچھوت پن کو ہی دور کرنے کی تدبیر کی. کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ ہو جائے تو ذاتوں کے درمیان کھانا پینا اور شادی بیاہ پر جو پابندی ہے وہ خود آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی، وہ غیر ملکوں میں بہت رہ آئے تھے اس لئے کھانے پینے میں کسی قسم کی چھوت چھات نہ ماننا ان کی فطرت ہوگئی. لیکن یہ بات اس ملک کے لوگوں،

خاصکر گاؤں والوں کے لئے نئی چیز تھی. جیسا میں اوپر بتا آیا ہوں، ان کے ماحول میں رہنے والے لوگ اس بندھن کو بھی ڈھیلا کر ھی دیتے تھے. چمپارن میں ھم لوگ، جو اس وقت تک اپنی ذات ھی کے اندر کھانا پینا کیا کرتے تھے، اس بندھن کو ھٹا کر سب ایک دوسرے کیساتھ کھانے لگے. یہ کھانا پینا صرف اونچی ذات والے لوگوں کے ساتھ ھی نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ بھی شروع ھو گیا تھا جن کا چھوا ھوا پانی ھم نہیں پی سکتے تھے. خوبی یہ تھی کہ ھم نے یہ کام کچھ چھپا کر نہیں کیا تھا بلکہ کھلے بندوں کیا تھا. ھم لوگ وھاں چاروں طرف کے گاؤں سے آئے ھوئے کسانوں سے گھرے رہتے اور انکی موجودگی میں کھانا پینا کرتے تھے. ان میں سے کچھ کو ھم سب کا ایک ساتھ کھانا شاید پسند نہ آتا ھو. لیکن کسی نے اسکی اعلانیہ مخالفت نہیں کی اور نہ اس پر اعتراض ھی ھمارے سننے میں آیا. لوگوں نے شاید یہ مان لیا کہ یہ سادھوؤں کی ایک جماعت ھے جس میں سب لوگ ایک ساتھ بیٹھکر کھا لیتے ھیں.

«گیا» کانگریس میں جو والنٹیر کام کرنے آئے تھے ان میں سے زیادہ تر گاؤں کے ھی لوگ تھے. وہ اپنے ساتھ کھانے پینے

کے سبھی بندھنوں کو لائے تھے۔ وہ ایسا انتظام چاہتے تھے جس میں ان کو اپنی ذات کے طریقوں کو نہ توڑنا پڑے۔ اسلئے شروع میں ان کے لئے برھمن کھانے پکانے والوں کا انتظام کرنا پڑا۔ ان رضا کاروں کی تعداد بہت تھی، اسلئے ان لوگوں کے لئے اتنے کھانا پکانے والے کھانا تو پکا سکتے تھے لیکن سب کو پروس (کھلا) نہیں سکتے تھے۔ ایک دو بار کھانے کے بعد ھی چند رضا کاروں نے دیکھ لیا کہ اس سے کام نہیں چلیگا۔ انھوں نے آپس ھی میں رسوئی پروسنی شروع کردی۔ ایک دو دن صرف برھمنوں نے پروسا (کھلایا) تھا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو دوسری ذات کے لوگ بھی کھلانے (پروسنے) لگے۔ دو ھی تین دن کے اندر سب بندھن ٹوٹ گئے، سب کے سب ایک دوسرے کا چھوا ھوا «دال بھات» کھانے لگے۔ اس کے بعد جہاں کہیں کانگریس والوں کی سبھا ھوتی، بہار میں ذات پات کا فرق کرکے کھانے کا انتظام نہیں ھوتا تھا۔ سب ایک ساتھ کھاتے تھے۔

جب مہاتماجی نے اچھوت پن دور کرنے کی تحریک اٹھائی تو کانگریس کے جلسوں میں، ایک ساتھ سب کا بیٹھنا تو ھوتا ھی تھا، ایک ساتھ سب کا کھانا بھی ھونے لگا۔ تھوڑے ھی دنوں

میں کانگریس کے لوگوں میں کھانے پینے کا فرق بھی دور ھوگیا. اس سے یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ اچھوت پن دور ھوگیا ھے. ابھی تک وہ پوری طرح گیا نہیں ھے. اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں ھی میں اس کا بندھن ڈھیلا پڑنے لگ گیا تھا، پھر آھستہ آھستہ زیادہ سے زیادہ ڈھیلا ھوتا گیا.

مہاتماجی نے ایك ذات کا دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ بیاہ کے قانون میں بھی تبدیلی کردی. خود تو پیدائشی ویش تھے، لیکن ان کے صاحبزادے شری دیو داس گاندھی کی شادی اونچی ذات کے برھمن شری راجگوپال اچاری کی صاحبزادی لکشمی کے ساتھ ھوئی. اس طرح کی اور بھی بہت سی شادیاں ھوئیں. کچھ دنوں کے بعد تو انھوں نے ھریجنوں کے ساتھ بھی بیاہ شادی کرنے پر زور دینا شروع کیا. اپنے آخری دنوں میں تو انھوں نے اپنا ایك اصول سا بنا لیا تھا کہ اسی شادی کی تقریب میں شریك ھوسکیں گے جس میں ایك طرف اونچی ذات اور دوسری طرف ھریجن ھوں. یوں تو وہ شادی کی تقریبوں میں شاید ھی کہیں آتے جاتے تھے، لیکن آشرم کے رھنے والوں یا انکے رشتہ داروں میں کسی کا جب بیاہ ھوا کرتا تو اس میں شریك ھوا کرتے

تھے. ان بیاھوں میں صرف ذات پات کا بندھن ھی نہیں ٹوٹتا بلکہ بیاہ کے طریقے اور ریت بھی بہت بدل دی جاتی.

ھمارے سماج کی شادیوں میں بہت دھوم دھام ھوا کرتی ھے اور پیسے بھی بہت خرچ ھوتے ھیں. بیاہ کے طریقے میں بہت زیادہ سنسکرت کے منتر ھی استعمال میں لائے جاتے ھیں، جن کے مطلب کو دولہا اور دلہن سمجھتے ھی نہیں، بغیر سمجھے وہ پنڈت کے کہنے پر ان کو دھرا دیتے ھیں. مہاتماجی نے منتروں کا مطلب مادری زبان میں بتا دینے کا طریقہ جاری کیا اور منتروں کے بھی غیر ضروری حصوں کو چھوڑ کر ان کو بہت مختصر کر دیا. برات، جلوس کھانا وغیرہ سب کچھ اٹھا دیا. سارا کام چند منٹوں کے اندر ھی ختم کر دیا جاتا، جس میں خرچ نہ ھونے کے برابر ھوتا. اگرچہ آج بھی شادیوں میں پرانا طریقہ بہت کافی جاری ھے، لیکن پھر بھی اس میں شك نہیں کہ تمام جگہوں پر کسی نہ کسی شکل میں سدھار ھونے لگا ھے. اس طرح ذات اور سماج کی حالت میں بھی مہاتماجی نے تغیر پیدا کر دیا. اس کا اثر بہت دور تک پہنچا ھے، لیکن پھر بھی کافی دور تك نہیں گیا.

مہاتماجی کا خیال بیواؤں کے بیاہ کے متعلق ظاھر نہیں ھوا تھا، کیونکہ اس کا کبھی شاید موقع ھی نہیں آیا تھا. ایك واقعہ بہار کے سفر میں پیش آیا، جہاں ان کے خیالات ظاھر ھو گئے. شہر

آرہ کے نزدیک جینیوں کا ایک بیوہ آشرم ہے، جہاں جینی بیوائیں رہتی ہیں۔ وہاں ان کی تعلیم وغیرہ کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ مہاتماجی جہاں کہیں جاتے تھے ان کو سبھی لوگ پبلک اداروں میں لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ سب اداروں کو تو وہ نہیں دیکھ سکتے تھے، لیکن اس ادارے میں وہ گئے۔ وہاں دس گیارہ سال کی ایک بیوہ بچی سلام کرنے آئی۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا، کیا یہ بھی بیوہ ہے؟ جب ان سے کہا گیا کہ یہ بھی بیوہ ہے اور اس کو اسی حالت میں اپنی ساری زندگی گزارنی پڑے گی، تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صرف اس کے بعد انہوں نے صاف صاف لکھا کہ بیواؤں کو زبردستی بیوہ رکھنا ٹھیک نہیں، جو شادی کرنا چاہیں ان کی شادی ہونے دینی چاہئے۔ کچھ دنوں کے بعد تو انہوں نے اور بھی زیادہ زور دیا اور کہا کہ کوئی رنڈوا اگر شادی کرنا چاہے تو اس کو بیوہ ہی کے ساتھ کرنی چاہئے۔ اگرچہ اب بھی زیادہ تر بیواؤں کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اب عقد بیوہ اتنا برا نہیں مانا جاتا جتنا اسکے پہلے سماج مانا کرتی تھی۔

مہاتماجی نے بہار میں جا کر پردہ سسٹم کو خوفناک شکل میں دیکھا۔ گجرات اور دکھن میں پردہ بہت کم ہے۔ میرا خیال ہے

که بہار میں جتنا سخت پردہ ھے اتنا شاید کسی دوسرے صوبہ میں نہیں ھے۔ چمپارن میں جب «با» پہونچیں اور کچھ دنوں کے بعد پاٹھ شالاؤں کے کھلنے پر گجرات اور مہاراشٹر کی کچھ عورتیں بھی آئیں، جو پھر پھر کر کام کرنے لگیں خاصکر عورتوں میں، اسی سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ «گیا» کانگریس کے وقت عورتوں کے لئے خاص جگہ بنائی گئی تھی، جہاں پردہ میں رہ کر وہ سبلوگوں کو دیکھ اور سب تقریروں کو سن سکتی تھیں۔ باہر کے نمایندوں کے ساتھ بہت سی عورتیں آئی تھیں۔ پہلے دن تو شہر اور باہر کی سب عورتیں پردہ کے اندر ھی بیٹھیں۔ ان عورتوں کے لئے جو پردہ کے باہر بیٹھنا چاھتی تھیں ایك خاص جگہ مقرر کر دی گئی، وھاں بہت تھوڑی عورتیں پہلے دن بیٹھیں، جن میں بیشتر دکھن سے آئی ھوئی تھیں۔ لیکن آھستہ کچھ پردے والی عورتیں بھی ھمت کرکے وھاں آ کر بیٹھ گئیں۔ دوسرے تیسرے دن تو یہ ھوا کہ پردہ والی جگہ بالکل خالی ھوگئی اور کھلی جگہ بالکل بھر گئی۔

ھم نے دیکھا کہ ھمارے یہاں کی عورتیں ان لوگوں ھی سے پردہ رکھتی ھیں جنکو وہ پہچانتی ھیں یا جو ان کے گھر والوں کو جانتے ھیں، یا جن کے متعلق ان کو یہ خدشہ رھتا ھے کہ شاید یہ انہیں

پہچان لیں. اسی وجہ سے میلے یا گنگا اشنان کے وقت تقریباً سبھی گھروں کی عورتیں جاتی ھیں، کیونکہ وھاں بھیڑ میں کسی کو جاننے پہچاننے کا موقع کم ملتا ھے. اس اصول کی بناء پر پہلے دن «گیا» میں سبکی سب پردہ میں بیٹھیں، لیکن جب وہ جان گئیں کہ بھیڑ کافی ھے اور پہچانے جانے کا گمان کم ھے تو بے دھڑك کھلی جگہوں میں آ کر بیٹھ گئیں.

مہاتماجی جہاں کہیں جاتے وھاں عورتوں کا جلسہ الگ کیا جاتا. کیونکہ پبلك جلسہ میں وہ آنا نہیں چاھتی تھیں یا علاحدہ جلسہ میں مہاتماجی کا درشن ان کو آسانی سے ھوسکتا تھا. ان سے عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں، اس لئے چاھے وہ کانگریس کے کام سے یا چرخہ سنگھ کے لئے چندہ جمع کرنے جاتے، وھاں عورتوں کا جلسہ ھوتا، عورتیں اپنے گہنے اتار اتار کر دیتیں. اسطرح سے بہت سا زیور جمع ھوجاتا، جو بعد میں بیچ دیا جاتا. بہار میں کچھ دنوں کے بعد بابو برجکشور پرشاد کی صدارت میں ایك بہت بڑا جلسہ ھوا. جسکا مقصد پردہ توڑنا تھا. وہ انجمن کچھ دنوں تك کام کرتی رھی. اب تو کوئی بھی جلسہ ھو اس میں عورتیں کی تعداد کافی ھوتی ھے. اگرچہ ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا ھے کہ گجرات، مہاراشٹر یا دکھن کے صوبوں کی طرح بہار میں بھی پردہ اٹھ گیا

ھے ۔ پھر بھی بہت کچھ کم ضرور ھو گیا ھے ۔ اگر کوئی عورت ہمت کر کے پردہ کے باہر آجاتی ھے تو برا نہیں مانا جاتا۔

سابرمتی آشرم میں جو عورتیں آئی تھیں ان کو ھر طرح کی آزادی تھی، ویسی ھی جیسی کہ مردوں کو ، آشرم میں کسی بات پر رائے لی جاتی تو وہ عورتیں بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ رائے دیتیں جیسے کہ مرد ۔ وہ کام بھی ایسے ھی کرتیں جیسے مرد ۔ ان دنوں خاصکر چرخہ کا کام ہوتا تھا، اس میں وہ پورا حصہ لیتیں۔ اس طرح عورتوں میں مہاتماجی نے ایك عجیب بیداری پیدا کردی۔ اسکے بعد جب کہیں ستیہ گرہ کا موقع آیا، عورتوں نے اس میں پوری بے خوفی سے ویسا ھی حصہ لیا جیسا کہ مردوں نے لیا۔ «باردولی» کی ستیہ گرہ میں عورتوں نے بہت بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی منتظمی طاقت کا بھی ثبوت دیا، اس ملك میں صبر و تحمل عورتوں کا مذھبی فریضہ سا بن گیا ھے، اسلئے ستیہ گرہ کی مصیبتوں کو سہ لینا انکے لئے مردوں سے بھی زیادہ قدرتی تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ع میں جب مہاتماجی نے کل ھند ستیہ گرہ شروع کی اسوقت انھوں نے خاصکر شراب بندی کا کام عورتوں کے ذمہ کیا۔ یہ کام مشکل تھا اور خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں نشہ بازوں سے مقابلہ ھوتا۔ جس میں بہت سے لوگ بد اطوار ھوتے ھیں، یعنی ھوش و حواس تو شاید ھی کسی

میں ہوتے ہوں. اسلئے یہ کہنا مشکل ھے کہ وہ کب اور کیا کر بیٹھے. لیکن اس کام کو بہت ھی بے کالی سے بہت سی عورتوں نے کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شراب کی دکانیں بند ہوگئیں، گاھکوں کی کمی سے بیشتر دوکانداروں کی بکری بھی کم ہوگئی، کچھ شرابیوں نے تو شراب پینی بھی چھوڑ دی. لیکن یہ کہنا مشکل ھے کہ کتنے لوگ ایسے ہونگے جو اس طرح سدھر گئے ہونگے.

سنہ ۱۹۳۰ع کا ذکر ھے کہ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ میں بھی عورتوں کو بہت جگہوں پر مدد دینی پڑی. اسوقت یہ کوشش تھی کہ بدیشی کپڑے کی بکری بند ہوجائے اور اسکا آنا بھی بند ہو جائے. جو بدیشی کپڑا ملک میں موجود تھا، اگر اسکی بکری رک جائے تو بیوپاری غیر ملک سے کپڑا نہیں منگائیں گے. لیکن اسکی فروخت اگر جاری رھی تو باھر سے اسکا آنا بھی نہیں رکے گا. اسلئے یہ سوچا گیا کہ بدیشی کپڑا جس قدر بھی دوکانوں میں ھے وہ گانٹھوں میں بندھوا کر رکھوا دیا جائے. کچھ تاجر تو خوشی سے راضی ہوگئے اور انھوں نے خود اپنے مال کو گانٹھوں میں بندھوا کر کانگریس کی مہر لگوا دی. یہ سوچا گیا تھا کہ جب یہ کام پورا ہوجائے گا اور کپڑے کی بکری رک جائے گی اسوقت ان گانٹھوں کو کسی دوسرے ملک میں بھیج کر کپڑا بیچ دیا جائے گا

تا کہ بیوپاریوں کا بھی نقصان نہ ہو۔

بہار میں عورتوں نے بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر پہرہ دینے کا کام کیا۔ جس دوکان پر بدیشی کپڑا ہوتا اسکے سامنے دو ایک عورتیں جا کر کھڑی ہو جاتیں، اگر کوئی گاھک آتا تو انہیں دیکھتے ہی واپس چلا جاتا۔ دوکاندار بھی بہت شرمندہ ہوتے اور ان عورتوں کو خاطر مدارات کے ساتھ بٹھاتے، ان کے ساتھ اچھی طرح سے اچھا سلوک کرتے۔ چند روز کے اندر ھی بہار کے سارے کپڑے کی منڈیوں میں بدیشی کپڑے کی گانٹھیں بندھ گئیں اور ان پر کانگریس کی مہر بھی لگ گئی۔ یہ زیادہ تر عورتوں ھی کے وجہ سے ہوا۔ جو دوکانوں پر پہرہ دیتیں، ان میں ایسی بھی تھیں جو پردہ سے باہر کبھی نہیں نکلیں تھیں اور جنہوں نے اس قسم کا کام کبھی نہیں کیا تھا۔ ان سے کہہ دیا جاتا کہ اگر کوئی خریدار آئے تو اس کے سامنے ھاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جانا اور کہنا کہ "آپ بدیشی کپڑے نہ خریدیں اور آزادی حاصل کرنے میں مدد کریں۔ مہاتماجی کا حکم مانیں"۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ بہت سے گاھک ان کو کھڑی دیکھ کر ھی واپس لوٹ جاتے۔ کچھ لوگ کہنے پر واپس جاتے اور تھوڑے ایسے بھی ہوتے جو کہنے کے بعد بھی ضد کرتے۔ دوکانداروں کی بھی مدد شامل تھی۔ لیکن انہوں نے بھی یہ دیکھ لیا

کہ جب تک عورتیں کھڑی رہینگی اسوقت تک دوکان کھولے رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ھے. کیونکہ بکری ہوتی نہیں صرف بدنامی ھی ہوتی ھے.

ایک دن کا ذکر ھے کہ ایک خاتون ایک دوکان پر پہرہ دینے لگیں. وہ اپنے گھر سے کبھی باہر نہیں نکلی تھیں، اسلئے ان کو معلوم ھی نہیں تھا کہ دوکان سے انکا گھر کس طرف اور کس محلہ میں ھے. جو عورتیں پہرہ دینے میں شریک ہونا چاھتیں ان کو کانگریسی کارکن ان کے گھر سے پیدل یا سواری پر دوکان تک پہنچا دیتے. پھر شام کے بعد جب کام ختم ہوتا تو ان کے گھر واپس پہنچا دیتے. اس روز غلطی سے اس لڑکی کو وہ گھر پہنچانا بھول گئے. لڑکی بیچاری وھیں کھڑی رھی. اتفاق سے ایک مہربان اپنی بیوی کو واپس لیجانے کے لئے اپنی موٹر کار پر جارھے تھے. ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ لڑکی اب تک کیوں کھڑی ھے. انہوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اسے گھر پہنچانے کے لئے ابھی تک کوئی نہیں آیا. وہ سمجھ گئے کہ یہ غلطی سے ہوا. اس لئے انہوں نے اس لڑکی کو اپنی گاڑی پر بٹھلا لیا. لیکن یہ مشکل پیش آئی کہ وہ اپنے گھر کا پتہ نہیں بتا سکتی تھی، اسے پہونچاتے تو کہاں پہونچاتے. جس سڑک پر لے جاتے تھے تو وہ کہتی اس طرف اس کا گھر ھے. لیکن جس مکان کے سامنے وہ رک جاتے تھے وہ کہتی تھی کہ یہ مکان میرا

نہیں ھے . بہار میں رواج ھے کہ بیویاں اپنے خاوندوں کا نام نہیں لیتی ھیں. اسلئے وہ اپنے خاوند کا نام بھی نہیں بتا سکتی تھی ، بڑی مشکل سے اپنے خاوند کا نام اس نے کاغذ پر لکھ کردیا. اس وقت انھوں نے تلاش کرکے اسے اس کے گھر پہونچایا .

اس طرح بڑے بڑے گھروں کی عورتیں اس کام میں لگیں. اسلئے یہ کام بہت تیزی کے ساتھ پورا ھوا. خریداری رکتے ھی باھر سے کپڑے کی آمد بند ھوگئی. اس سال کپڑے کی درآمد کے لئے ھندوستان اور باھر کے دوکانداروں میں جو معاھدے ھوا کرتے تھے وہ نہیں ھوئے. اس کا اثر ھندوستان ھی پر نہیں بلکہ دوسرے ملکوں پر بھی جن میں سب سے بڑا انگلستان تھا کافی پڑا .

سنہ ۱۹۲٤ع سے سنہ ۱۹۲۸ع تک کا زمانہ ایك طرح بہت اھم تھا. کیونکہ اس درمیان میں مہاتماجی نے اپنی پوری طاقت تعمیری پروگرام کے چلانے میں صرف کردی. سیاسی میدان سے ایك طرح سے الگ رھے. سوراج پارٹی ھی کانگریس کی طرف سے سیاسی کام کرتی رھی. مہاتماجی کانگریس کے جلسوں میں اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں جاتے تھے. جہاں مناسب سمجھتے وھاں اپنی رائے بھی دیدیا کرتے تھے، لیکن آخری فیصلہ سوراج پارٹی ھی پر چھوڑ دیا کرتے تھے. پنڈت موتی لال جی سارے بڑے،

اہم معاملات پر مہاتما جی کی رائے ضرور لیا کرتے تھے۔ اس طرح جو تلخی کونسل میں داخلہ کے متعلق پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔ کیونکہ دونوں طرف لوگ صاف دلی سے کام کر رہے تھے۔

سنہ ۱۹۲۶ع میں اسمبلی میں چناؤ ہوا۔ اسکے بعد سوراج پارٹی چناؤ میں بہت زیادہ کامیاب ہونے کی وجہ سے کچھ اور زیادہ کام کرسکی۔ لیکن آپس میں پھوٹ بھی پیدا ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۰ع کے دستور میں ایک دفعہ تھی، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دس برس تک دستور کے اعتبار سے کام ہونے کے بعد پارلیمنٹ ایک کمیشن مقرر کریگی۔ جو اس بات کی جانچ کرے گا کہ دستور کس طرح کام میں لایا جائے اور آگے کے لئے کیا آئینی اصلاحات کی جاسکتی تھیں۔ مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی کی ایک بڑی تجویز یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کو دس سال تک نہ ٹال کر اور ایک کمیشن نہ مقرر کرکے اپنے نمائندوں اور ہندوستان کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس کرنی چاہئے، جو آئینی اصلاحات کے متعلق سمجھوتے کی شکل میں فیصلہ کرے۔ سنہ ۱۹۲۷ع میں جب مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں کانگریس ہوئی تو اس نے ایک کمیٹی بنائی۔ جس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ دوسرے مکتب خیال کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک دستور تیار کرے۔ اس کمیٹی نے آئندہ چل کر

پنڈت موتی لال جی کی صدارت میں دوسری جماعت کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایك دستور کا خاکہ تیار کیا. وهی « نہرو کمیٹی رپورٹ» کے نام سے مشہور هوا . ادهر برٹش گورنمنٹ نے بھی اعلان کردیا کہ اس نے سنه ۱۹۲۰ ع کے دستور کے اعتبار سے ایك کمیشن زیر صدارت « سر جونس سائمن » مقرر کردیا هے. اس کمیشن میں ایك هندوستانی نہیں تھا. اس لئے هندوستان کے لوگوں کے دلوں میں، خواہ وہ کسی جماعت سے متعلق تھے، بہت رنج اور غصه پیدا هوا. سب نے برٹش گورنمنٹ کی اس کاروائی کی صرف مذمت هی نہیں کی بلکه سب کے سب یه بھی سوچنے لگے که اس کے مقابله میں کچھ کرنا چاهئے. اعتدال پسند اور لیبرل پارٹی کے لوگوں نے کانگریس سے الگ هوکر سنه ۱۹۲۰ ع کے دستور کے مطابق وزارتوں میں حصه لیا تھا. چناؤ میں کانگریس کے حصه نه لینے کی وجه سے ان کیلئے سنه ۱۹۲۰ع کے چناؤ میں راسته صاف تھا. سنه ۱۹۲۳ ع میں بھی ایك طرح سے انہیں کھلا میدان مل گیا تھا. ان میں سے بڑے بڑے لوگ، جیسے بنگال میں شری سریندر ناتھ بنرجی، صوبۂ متحدہ میں چنتامن وغیرہ وزارتوں میں شریك هوئے تھے. لیکن آخر میں ان کو بھی تجربه کچھ اچھا نہیں هوا. شروع میں جب نان کواپریشن کا زور تھا اس وقت اعتدال پسند

لوگوں کی کافی خاطرداری ہوئی تھی . لیکن جب تعاون کمزور ہوگیا اسوقت پھرانکی بھی پوچھ کم ہوگئی تھی . یہانتک که شری چنتامن کو استعفاء دیکر ہٹ جانا پڑا . اس لئے اس جماعت کے لوگ بھی پہلے سے ھی کچھ غیر مطمئن تھے . جب سائمن کمیشن کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کیا گیا ، اور جب اس میں ایك بھی ہندوستانی کا نام نہیں پایا گیا تو غیر اطمینانی اور بھی بڑھ گئی . سنه ۱۹۲۸ ع میں ایك طرف تو نہرو کمیٹی دستور بنانے میں لگ گئی اور اس کام میں اس کو سبھی جماعت کے لوگوں کی طرف سے امداد ملی ، اور دوسری طرف یه سوچا جانے لگا که ہندوستان کے ساتھ جو یه بے انصافی اور اسکی بے عزتی سائمن کمیشن کے تقرر کی شکل میں کی گئی ھے اس کا کسطرح سے مقابله کیا جائے . بہت سے مقاموں پر جلسے ہوئے ، جس میں کانگریس ، لیبرل پارٹی ، خلافت کمیٹی اور دوسرے سبھی خیال کے لوگ شریك ہوئے . سب نے مل کر اس کمیشن کے تقرر کی مذمت کی . مجھے یاد ھے که جب پٹنه میں جلسه ہوا تو اس میں بہت دنوں کے بعد کانگریس کے لوگ سر علی امام جیسے دوسری جماعتوں کے لوگ بھی شریك ہوئے تھے . اس میں به اتفاق رائے مذمت کے ریزولیوشن پاس کئے گئے تھے . ہم لوگوں کو اس بات سے بڑی خوشی حاصل ہوئی تھی که اب تك

جو لوگ ہم سے الگ تھے، پھر ایک ساتھ مل کر برٹش گورنمنٹ کا مقابلہ کریں گے۔ ہم یہ جانتے تھے کہ نان کواپریشن اور ستیہ گرہ کے پروگرام کو وہ لوگ نہیں مانیں گے، لیکن یہ ظاہر تھا کہ اگر ہم لوگ ان سے آگے بڑھکر کچھ اپنی طرف سے کریں گے تو وہ اسکی مخالفت نہیں کریں گے۔ اس طرح ایک نئی فضا پیدا ہوگئی۔

مہاتماجی جس چیز کی توقع کر رہے تھے وہ نزدیک آتی دکھائی دی۔ ۱۹۲۸ توقع اور تیاری کا سال رہا۔ توقع اس بات کی کہ دیکھیں ہم سب مل کر اس مقابلہ کیلئے کیا پروگرام بنا سکتے ہیں، اور تیاری اس بات کی کہ ہم سب مل کر اپنی طرف سے ایک دستور کرلیں جس کو منظور کرنے کے لئے کمیشن کو مجبور کیا جاسکے۔ دستور کی تیاری میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندو مسلم جھگڑوں اور دوسری بہت سی ذاتوں میں اعتماد اور بھروسہ پیدا کرنے کے لئے۔ دستور میں کیا کیا باتیں رکھی جائیں جس سے وہ مطمئن ہوسکیں۔ نہرو کمیٹی اس کوشش میں بہت کامیاب ہوئی۔ کچھ باتیں ایسی بھی کہی گئی تھیں جن پر سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ پھر بھی امید کی جاتی تھی کہ جب کمیٹی کی رپورٹ سب جماعتوں کے نمائندوں کی کانفرنس میں پیش کی جائیگی تو ان معاملات پر کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائیگا۔ ملک میں نئی بیداری ہوچکی تھی۔ اس کی سب سے بڑی علامت

باردولی ستیہ گرہ کی شکل میں ظاہر ہوئی. اوپر کہا جاچکا ھے کہ سنہ ۱۹۲۱ع کے آخر اور سنہ ۱۹۲۲ع کے شروع میں مہاتماجی نے باردولی ھی کو سوراج کے لئے ستیہ گرہ کی اجازت دی تھی اور خود اس ستیہ گرہ کی لیڈری کرنے کو تیار تھے. یہاں تک کہ وائسرائے کو خط بھی لکھے. لیکن «چوری چورا» کے حادثہ کی وجہ سے اسے روك دینا پڑا. سنہ ۱۹۲۸ع میں فصل خراب ھوجانے اور مالگزاری کی معافی نہ ملنے کی وجہ سے «باردولی» تعلقہ کے لوگوں میں اختلاف ھوگیا. جب گورنمنٹ نے ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا تو وھاں کے لوگوں نے ارادہ کیاکہ ستیہ گرہ کی جائے اور مالگزاری نہ دی جائے. سردار ولبھ بھائی نے بڑی مضبوطی اور ھوشیاری کے ساتھ ستیہ گرہ کی لیڈری کی. گورنمنٹ کی طرف سے جتنا زور لگایا جاسکتا تھا لگایا گیا. لیکن وہ کچھ نہ کرسکی اور آخر میں اسے سمجھوتہ کرنا پڑا. اس کامیابی کی وجہ سے سارے ملك میں جوش کی لہر امنڈ آئی. اب سب لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ھونے لگا کہ اگر پوری کوشش کی جائے تو سارے ملك میں «باردولی» جیسی ستیہ گرہ چل سکتی ھے اور کامیابی بھی ھوسکتی ھے.

اب تك ستیہ گرہ خیال ھی میں رھا کرتی تھی، اتنے بڑے پیمانے پر اس کا استعمال نہیں ھوا تھا. یوں تو کھیڑا، بورسد اور ناگپور

میں چھوٹی موٹی ستیہ گرہ پوری طرح کامیاب ہوچکی تھی ۔ لیکن وھاں مقصد دوسرا تھا جن لوگوں کو ان میں حصہ لینا پڑا تھا ان کی تعداد بھی کم تھی ۔ لیکن «باردولی» میں ایك پورے تعلقہ کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا اور سب کو بہت تکلیف سہنی پڑی ۔ آس پاس کے لوگ بھی ، جن میں ریاست بڑدو کے گاؤں تھے ۔ ان لوگوں کی مدد کرتے رھے ۔ یوں تو سارے ملك کی نظریں «باردولی» کی طرف لگی ہوئی تھیں ۔ اس لئے اس کامیابی نے ثابت کر دیا کہ اگر جنتا اپنی طرف سے ثابت قدم رھے اور کہیں بلوہ فساد نہ کرے تو برٹش گورنمنٹ کو ھار ماننی ھی پڑے گی ۔ کسی باھر والے نے کہا تھا کہ مہاتماجی نے اپنے لوگوں کے ھاتھوں سے ھتھیار چھین کر برٹش گورنمنٹ کا بھی ھتھیار چھین لیا ، یعنی اپنے لوگوں کو اھنسا کا پابند کر کے برٹش گورنمنٹ کے تشدد آمیز ھتھیار کو بھی بیکار کردیا ۔ بات سچی تھی ۔ اگر ھم اس چیز کو پوری طرح سمجھ جاتے تو صرف سوراج ھی ھم کو نہ جلد مل گیا ھوتا ، بلکہ ھم میں اور بھی اتنی طاقت پیدا ھوگئی ھوتی کہ ھم ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کیلئے ھمیشہ تیار رھتے ۔ لیکن وہ ادھورا رہ گیا ۔ ھم نے تو سوراج حاصل کر لیا لیکن اسکی حفاظت کے لئے ھمیں آج اپنی فوج پر بھروسہ کرنا پڑ رھا ھے ۔

سولھواں باب

سنہ ۱۹۲۸ ع میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا. پنڈت موتی لال نہرو صدر تھے. کانگریس کے ساتھ ساتھ ایک آل پارٹی کانفرنس بھی ہوئی. اسکے سامنے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پیش کی گئی. اس کی ضرورت اسلئے اس وقت اور زیادہ ہوگئی تھی کہ «سائمن کمیشن» ہندستان پہونچگیا تھا. اس لئے یہ ضروری تھا کہ ہم یہ دکھا سکیں کہ ہندستان کے سبھی لوگ ایک رائے ہوگئے ہیں، اور ان کے مطالبہ کو برٹش گورنمنٹ کو منظور کرنا ہی چاہئے. دو باتوں میں اختلاف تھا. ایک یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کو چاہئے کہ وہ ہندستان کو مرتبہ نوآبادی (ڈومینین اسٹیٹس) دیدے. اس کے متعلق کانگریس میں بھی دو رائیں تھیں. کچھ لوگوں کا جن میں شری سرینواس آئینگر، پنڈت جواہر لال نہرو، شری سوبھاش چندر بوس وغیرہ تھے، خیال تھا کہ ہم کو پوری آزادی کی بات چیت کرنی چاہئے. برٹش سامراج سے مرتبہ نوآبادی (ڈومینین اسٹیٹس) کے متعلق گفتگو نہیں کرنی چاہئے.

44a

دوسرے لوگ (ڈومینین اسٹیٹس) سے مطمئن ہوجاتے اگر برٹش گورنمنٹ اسے مان لیتی. دوسری بات ایسی تھی جس کے متعلق اختلاف رائے دوسرے فرقوں کے ساتھ تھا. خاص کر ھندو اور مسلمانوں کا اختلاف. اس کانفرنس میں اچھوت طبقہ کا کوئی خاص مقام دیکھنے میں نہیں آیا. اور نہ ان کی طرف سے کوئی خاص مانگ پیش کی گئی. کانگریسیوں اور سبھی دوسرے ھندوؤں کا خیال تھا کہ اچھوت لوگ ھندو ھی ھیں. ان کے لئے کسی خاص ادھکار (حق) کی ضرورت نہیں ھے. ھاں سکھ اپنی طرف سے ضرور خاص اختیاروں کے دعویدار تھے.

کانفرنس میں مرتبہ نوآبادی (ڈومینین اسٹیٹس) کے متعلق کوئی بڑا اختلاف نہیں ھوا. اگرچہ وھاں بھی کامل آزادی کے حامیوں نے یہ بات اٹھائی. لیکن یہ بات کانفرنس میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کے نذر ھوگئی. زیادہ تر فرقہ وارانہ جھگڑوں ھی کی وجہ سے کانفرنس ناکام ھوئی. اب زیادہ تر لوگ کانگریس سے جھگڑا طے کرنے کے طرفدار تھے. مسلمانوں کی مانگ بھی کچھ ایسی نہیں تھی کہ اگر وہ مان

لی جاتی تو دیش کا بہت بڑا نقصان ہوتا. اس وقت شاید یہ کسی نے نہیں سمجھا تھا کہ اس کے نہ ماننے کا نتیجہ ملک کے بٹوارے کی صورت میں ہوگا، جو ہوا. اگر اس وقت مہاتماجی کی باتیں لوگوں نے مان لی ہوتیں تو ملک کی تاریخ شاید دوسری ہوتی. لیکن ہم لوگوں نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ برٹش کی فریب کاری اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ہم میں پھوٹ ڈال کر لڑاتی رہے گی. ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ اگر قرین انصاف ہے تو برٹش گورنمنٹ کو اسے ماننا ہی پڑے گا. یعنی ہم لوگوں کو برٹش گورنمنٹ پر بھروسہ تھا. ہم یہ امید کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان وہ انصاف کریں گے.

مسلمان ایک طرح سے کانفرنس کے بعد ہی ایک حد تک کانگریس سے الگ ہوکر اپنی تنظیم کرنے لگے. ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جن میں مسٹر جناح بھی تھے جو کچھ عرصہ تک اس کوشش میں رہے کہ کوئی راستہ نکالا جائے. لیکن کچھ دنوں کے بعد سب لوگوں نے ایک رائے ہوکر آل پارٹی مسلم کانفرنس قائم کردی.

کانگریس کے اندر مرتبہ نوآبادی کے لئے جو اختلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے بارے میں بھی مہاتما جی نے بہت کوشش کی کہ کوئی سمجھوتہ ہوجائے. لیکن آخر میں یہ طے پایا کہ اگر ایک سال کے اندر برٹش گورنمنٹ مرتبہ نوآبادی دے دے گی تو ہم اسے منظور کرلیں گے، لیکن اگر اس نے اس مانگ کو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ ع تک منظور نہ کیا تو کانگریس اپنا عقیدہ بدل دے گی جو اس وقت تک حصول سوراج تھا. لفظ سوراج ایسا تھا کہ جس سے دونوں مطلب نکل سکتے تھے یعنی مرتبہ نوآبادی اور کامل آزادی. کیونکہ مرتبۂ نوآبادی میں بھی اپنے کاروبار میں ہر ایک نو آبادی آزاد ہی سمجھی جاتی تھی، اور اس کا مطلب کامل آزادی بھی ہوسکتا تھا. اس لئے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ سنہ ۱۹۲۹ ع میں اگر ہندستان نوآبادی نہ بنا تو کانگریس اپنے عقیدے اور مقصد کامل آزادی کا اعلان کر دے گی پھر اسکے بعد مرتبہ نوآبادی اگر ملے گا بھی تو اسے وہ منظور نہیں کرے گی.

مہاتما جی کا ایک یہ اصول تھا کہ کبھی وہ ایک بات کو

بڑھا کر نہیں کہتے تھے، بلکہ جو کچھ کہتے اسکا ہر
ایک لفظ نپا تلا ہوتا اور بڑا مطلب رکھتا تھا خاص کر
تجویزوں میں وہ کسی لفظ کو بھی محض زبان کی زیبائش
کیلئے استعمال نہیں کرتے تھے. اسلئے جب انہوں نے یہ
کہا کہ ایک سال کے اندر اگر مرتبۂ نو آبادی نہ مل جائے
تو وہ کامل آزادی کا اعلان کریں گے انہوں نے سوچ
لیا تھا کہ وہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع تک یا تو مرتبۂ
نوآبادی لےکر رهیں گے نہیں تو کامل آزادی کا اعلان کر
هی دینگے. سب لوگوں نے اس سمجھوتے کو مان لیا. یہ
سمجھا گیا کہ یہ اتفاق رائے سے منظور ہوگا لیکن ایسا
نہیں ہوا. پنڈت جواهرلال نہرو اور شری سری‌نواس آئنگر
تو اس سمجھوتے پر قائم رہے لیکن شری سوبھاش‌چندر
بوس نے کانگریس کے اجلاس میں اسکی مخالفت کی.
اس طرح وہ تجویز اختلاف کے ساتھہ پاس ہوئی.
مہاتما جی اپنی بات پر قائم رہے. جب ۳۱ ڈسمبر سنہ
۱۹۲۹ع آیا اور هندستان کو مرتبۂ نوآبادی نہ ملا تو
کانگریس کے عقیدے کو بدل کر کامل سوراج والی تجویز

انہوں نے لاہور کانگریس میں پیش کی اور وہاں منظور بھی ہوگئی.

سنہ ۱۹۲۹ع کا سال تیاری کا سال رہا. گاندھی جی نے پھر سے کانگریس کی لیڈری پوری طرح اپنے ہاتھہ میں لے لی، کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ کانگریس صرف اپنا عقیدہ بدل کرھی مطمئن نہیں رہے گی بلکہ اسکے حصول کے لئیے اسے قدم بھی اٹھانا ھی پڑے گا اب دیش کو اسکے لئے تیار ہوجانا چاھئے. مہاتماجی کی تیاری تو تعمیری کام ھی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اسلئے انہوں نے تعمیری کام پر پھر زور دیا. خاصکر کھادی پر جسکے اندر بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور اسکی جگہ کھادی کا پرچار بہت بڑا جز تھا. انہوں نے ایکبار بہت سی جگہوں کا دورہ کیا جگہ جگہ بدیشی کپڑوں کی ہولی جلوائی. صوبہ «برھما» سے ان کو دعوت آئی تھی اسلئے وہ وھاں جا رہے تھے راستے میں کلکتہ کے مقام پر ان کو ٹہرنا پڑا تھا. وھاں بھی ایک پبلک میدان میں بدیشی کپڑوں کی ہولی کی گئی. اس کے لئے ان پر مقدمہ چلایا گیا. وھاں کے وکیل اور

بیرسٹروں کا خیال تھا کہ مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ اس میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا گیا. مہاتما جی نے یہ پہلے سے ہی کہہ رکھا تھا کہ ہم لوگ ابھی ستیہ گرہ کرنا نہیں چاہتے. اسلئے انہوں نے اپنے خیال میں جان بوجھکر کسی قانونی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی. بہر حال مقدمہ پیش ہوا اور اسمیں بیرسٹروں نے پیروی کی، آخر میں مہاتماجی پر ایك روپیہ جرمانہ ہوا جس کو کسی نے داخل کر دیا. مہاتماجی برھما جا کر واپس آ گئے. اور اب سارے دیش میں اس بات کی امید کی جانے لگی کہ دیکھیں اس سال کے آخر تك کیا ہوتا ھے.

دیش میں اس نئی بیداری کا بڑا سبب « سائمن کمیشن » کا تقرر تھا. جب « سائمن کمیشن » ہندستان پہنچا تو سب جماعت کے لوگوں نے مل کر اس کا بائیکاٹ کیا. کانگریس اور کانگریس کے باہر کی سبھی جماعت کے لوگوں نے سوائے چند لوگوں کے اس کے سامنے جانے اور کچھ کہنے سے انکار کردیا. کانگریس کے لوگوں نے اس سے زیادہ یہ کیا کہ جہاں کمیشن پہنچتا وہاں اس کے خلاف بڑا مظاہرہ ہوتا

کالے جھنڈے کے ساتھ یہ کہا جاتا کہ "سائمن واپس جاؤ"۔ پولیس بھی اپنی طرف سے چپ نہیں رہتی تھی۔ مظاہرہ کرنیوالے پر بہت مقامات میں لاٹھیاں بھی چلاتیں، مارپیٹ کر کے تتر بتر کردیتی۔ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں پڑیں جس کا نتیجہ کچھ دنوں کے بعد یہ ہوا کہ وہ سورگ باش ہو گئے۔ صوبہ متحدہ میں بھی پنڈت جواہرلال نہرو وغیرہ کے لاٹھیاں لگیں، اس طرح بہت سے مقامات پر جہاں کمیشن گیا بہت سے لوگوں کو مار پیٹ سہنا پڑی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا، کہ بائیکاٹ زبردست اور کامیاب ہوتا گیا۔ صرف وہی لوگ جو اس زمانہ میں وزارت میں شریک تھے کمیشن سے جو کچھ کہنا سننا چاھتے تھے کہہ سکے۔ آزادی کے خیال کا کوئی بھی آدمی جس کی بات ماننے کے لئے جنتا تیار تھی کمیشن کے سامنے نہیں گیا۔ مہاتماجی نے کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید کی تھی۔

بہار میں کوئی واقعہ نہیں ھوا۔ اس کا کارن یہ تھا کہ وہاں کا انسپکٹر جنرل پولیس بہت ہوشیار تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اور جگہوں کی طرح مارپیٹ کرنے سے صرف بدنامی ھی

ہوگی، اور کوئی فائدہ نہیں ہوگا. کمیشن کے پہنچنے سے
ایک دن پہلے ہی اس سے میری ملاقات ہوئی تھی. میں
تو یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ مجھ سے بھی اسکی ملاقات ہوگی
لیکن اتفاق سے ڈاکٹر سچدانند سنہا کے گھر پر جہاں وہ
پہلے سے میرا انتظار کر رہا تھا میں چلا گیا تھا. اس نے
کہا اور جگہوں پر جیسا ہوا ہے، ویسا پٹنہ میں وہ نہیں
ہونے دینا چاہتا. میرے کہنے پر اس نے مان لیا کہ استقبال
کرنے والوں اور بائیکاٹ کرنے والوں کی آپس میں لڑائی نہ
ہونے دینے کا ایک طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ دونوں الگ
الگ رکھے جائیں. میں نے کہا اگرچہ یہ دسمبر کا مہینہ
ہے، اور سردی خوب پڑ رہی ہے، ارر جس گاڑی سے
کمیشن پٹنہ میں پہنچے گا، وہ بہت سویرے پہنچنے والی
ہے لیکن کم سے کم بیس ہزار آدمی بائیکاٹ کیلئے اسٹیشن
پر پہنچ ہی گئے. مگر شاید وہ سمجھتا تھا کہ اتنے آدمی
نہیں آئیں گے اس لئے اس نے یہ مان لیا کہ سڑک کے ایک
طرف قریب ہی جو نیا پلیٹ فارم کمیشن ہی کے لئے بنایا
گیا تھا، ادھر ہی استقبال کرنے والے رہیں گے. دوسری

طرف بائیکاٹ کرنے والے۔ ہم تو جانتے تھے کہ استقبال کرنیوالے بہت کم ہونگے اور بائیکاٹ کرنے والے بہت زیادہ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک طرف سو دو سو آدمی اور دوسری طرف تیس چالیس ہزار۔ انسپکٹر جنرل سے پھر وہیں پر میری ملاقات ہوئی۔ سب باتیں پر امن طریقہ سے ہوجانے پر اس نے مجھے مبارکباد دی۔ اور مجھ سے کہا کہ میں نے اس سے جو بیس ہزار آدمیوں کا وعدہ کیا تھا وہ میں نے پورا کیا کیونکہ اس سے کہیں زیادہ لوگ وہاں پر پہنچے تھے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ سنہ ۱۹۲۹ ع کا سال تیاری کا سال تھا۔ برٹش گورنمنٹ بھی بالکل چپ نہیں رہی۔ لارڈ ارون جو وائسرائے تھے انگلستان گئے۔ وہاں سے لوٹ کر انہوں نے اعلان کیا کہ آئینی اصلاحات کے متعلق برٹش گورنمنٹ کا جو اصول رہا ھے، اس میں مرتبہ نوآبادی موجود ھے۔ لیکن یہ بات صاف نہیں تھی کہ اسی سال کے اندر ھندوستان کو نوآبادی کی حیثیت مل جائیگی۔ اعلان کا مطلب اپنی اپنی سمجھ کے موافق کئی

طرح سے لوگ لگانے لگے۔ مہاتماجی نے سوچا کہ اس طرح اپنا مطلب لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لارڈ ارون ہی سے پوچھ لینا چاہئے۔ کہ وہ اعلان ہمکو کہاں تک لیجاتا ہے۔ ادھر کانگریس کی تاریخ بھی نزدیک آنے لگی۔ مہاتما جی، پنڈت نہرو اور مسٹر جینا کیسا تھ لارڈ ارون سے ملے۔ وائسرائے کی ان سے جو باتیں ہوئیں اس سے ظاہر ہو گیا کہ مرتبۂ نوآبادی فوراً دے دینے کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہی ہو سکیگا۔ اس عرصہ میں کانفرنس وغیرہ کے ذریعہ لوگ مصروف رکھے جائیں گے۔ مہاتماجی نے ارادہ کرلیا کہ کلکتہ کے فیصلہ کے موافق کامل آزادی کو اپنا عقیدہ بنانے کے سوا کانگریس کے لئے اب کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا ہے۔

سترھواں باب

میں اسی سال نومبر کے مہینہ میں « برھما » گیا۔ اور تقریباً دس بارہ روز وھاں رھا۔ میرے جانے کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ میرے دوست جن کے مقدمہ میں میں انگلستان گیا تھا، جن کی بہت بڑی زمینداری « برھما » میں تھی، جس کیلئے وہ مقدمہ چلا تھا ان دنوں « برھما » ھی میں تھے۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ میں ایک بار وھاں آؤں۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ وھاں دو تین جگھوں پر جن میں ایک یہ زمینداری بھی تھی، بہاری کسان بڑی تعداد میں بس گئے۔ جن میں سے کچھ نے اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجی تھیں اور مجھ پر زور دیا تھا کہ میں خود وھاں جا کر سب باتوں کو دیکھ سن لینے کے بعد اگر ھو سکے تو ان کی مدد کروں۔

وھاں بہاری کسانوں کے جانے کا ایک خاص سبب یہ ھوا تھا کہ جب انگریزوں نے اتری « برھما » کو انیسویں صدی کے آخر چوتھائی میں جیت کر اپنا راج قائم کیا، تو انھوں

نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ وہاں جو زمین بالکل غیرآباد پڑی ہے. وہ ہندوستانی کسانوں کو لے جا کر آباد کرائی جائے. زمین بہت تھی. شاید یہ خیال تھا کہ « برھما » کے لوگوں میں ایک اچھی تعداد میں اگر ہندوستانی بسیں گے تو برھما پر قابو رکھنا شاید کچھ آسان ہو جائے. اس لئے ہندوستان میں انھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان میں زمین کی کمی محسوس ہو رہی ہے، اور برھما میں بہت سی زمین یونہیں پڑی ہوئی ہے، اگر یہاں کے زمیندار یا دوسرے دھنی لوگ وہاں زمین لیکر اور یہاں سے ہندوستانیوں کو لیجا کر زمین آباد کرائیں، تو ان کو کافی منافع ہوگا. اور جو وہاں جا کر بسیں گے، انہیں بھی بہت اچھی اور کافی زمین مل سکے گی، اور اسمیں گورنمنٹ بھی ہر طرح سے مدد کرے گی. اس اعلان پر ہندوستان کے کچھ لوگ وہاں گئے، گورنمنٹ نے ان لوگوں کو زمینیں دیں. کچھ تو وہاں نہیں ٹک سکے اور واپس چلے گئے. مگر کچھ لوگ رہ گئے، ان میں ایک انگریز نیل والا بھی تھا، جس کا نام « ملن » تھا. اس نے وہاں چوبیس ہزار

ایکـڑ زمین لی. ضلع شاہ آباد (بہار) کی طرف سے کسانوں کو لے جا کر اس نے وہاں بسایا تھا. کئی لاکھ سالانہ کی آمدنی اس زمینداری سے اسکو ہوئی. اسی طرح سے میرے دوست رائے بہادر ہرہر پرشاد کے باپ رائے بہادر جے پرکاش لال نے بھی ١٤ ہزار ایکڑ زمین لی جسکو ان کے مرنے کے بعد رائے بہادر ہر ہر پرشاد نے آباد کرایا تھا. جس وقت زمین لی گئی تھی اس وقت وہاں گھنا جنگل تھا، جس میں ہاتھی شیر وغیرہ جنگلی جانور رہا کرتے تھے. بڑی مشکل اور ہمت سے آہستہ آہستہ زمین آباد ہو پائی تھی. جس وقت میں گیا تھا اس وقت آس پاس کہیں جنگل کا نشان تک نہ تھا. وہاں کے رہنے والے گھر بار رہن سہن اور بولی میں سب شاہ آباد ہی کے معلوم ہوتے تھے. وہاں جانے پر ان گاؤں کو دیکھنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کے بعد یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ہم برہما میں ہیں.

مسٹر ملن کی زمینداری میں کسانوں کو کچھ شکایت نہ تھی. انہوں نے مجھے بلایا تھا کہ میں ان کے معاملات

طے کرادوں ۔ میں ان دونوں وجہوں سے وہاں گیا اور پہلے پہل « برھما » کو دیکھنے کا موقعہ بھی ملا ۔ کسانوں کی طرف سے میں نے « مان » کے منیجر سے باتیں کیں ۔ ساری شکایتیں تو دور نہیں ہوئیں لیکن ان کو کچھ آسانیاں ضرور ملیں ۔

برھما کے لوگ بہت مذھبی ھوتے ھیں ۔ وھاں بدھ بھکاریوں کی جنکو « پھونگی » کہتے ھیں بڑی عزت ھے ، ان کی ایک بہت بڑی ٹولی « گیا » کانگریس کے وقت « اون اتما » کی لیڈری میں ھندستان آئی تھی ۔ برھما میں جو قومی بیداری ھوئی تھی اس میں پھندیوں کا بڑا ھاتھ تھا ۔ وھاں ایک بہت « بڑا پھونگی » برٹش گورنمنٹ کے خلاف روزہ رکھ کر مرگیا تھا ۔ اسکا جنازہ وھاں کے دستور کے موافق لوگوں کے درشنوں کیلئے محفوظ رکھا گیا تھا ۔ میں نے بھی اس کا درشن کیا تھا ۔

میرے اوپر دو باتوں کا بڑا اثر تھا ۔ ایک تو یہ کہ برھما کے ساتھ ھمارا بہت پرانا اور گہرا تعلق ھے ۔ میں ٹھیک طور سے نہیں کہہ سکتا کہ « برھما » میں بدھ مذھب کا پرچار

کب اور کیسے ہوا، اور کس نے کیا. لیکن آج بھی وہ دھرم وہاں کے لوگوں میں بہت سختی سے جاری ھے. زندہ اور بیدار ھے. جس کی علامتیں صرف بڑے بڑے سنہرے بدھ مندروں ھی میں نہیں بلکہ پھونگیوں کی زندگی انکا کردار اور برھمیوں کی رھن سہن میں قدم قدم پر ملتی ھیں. چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم زیادہ تر ان پھونگیوں کے ھاتھوں ھی میں ھے. ایك بہت ھی معمولی منظر ھے کہ کمسن جوانوں کی ایك بڑی جماعت جلوس کی طرح روزانہ دیکھی جاسکتی ھے. یہ پھونگیوں کے نئے چیلے ہوتے ھیں جو وقت پڑ پھونگی ھونگے اور جو بچپن ھی سے اس زندگی کیلئے تیاری کر رھے ھیں. دوسرا اثر یہ پڑا کہ میں نے یہ دیکھا کہ ھندوستان نے اگرچہ کبھی دوسرے دیس پر اپنی سیاسی سیادت جمانے کیلئے حملہ نہیں کیا، پھر بھی اس کا مذھبی اور بنیادی اصول دنیا کے بہت بڑے حصہ پر قائم ھوگیا، جو آج بھی قائم ھے. وہ اقتدار تلوار اور ھتھیاروں کے ذریعہ قائم نہیں کیا گیا تھا. بلکہ مذھب نیکی، خوش اخلاقی، پریم و محبت اور خوش چلنی کی بنیاد پر قائم ھوا

تھا. یہی سبب ہے کہ دوسرے طریقہ کے سامراج نہ معلوم کتنے ہوئے اور ٹوٹ پھوٹ گئے. پھر بھی یہ سامراج آجتک قائم ہے. برھما کے لوگ آج بھی ھندوستان کے ان مقاموں کو جنکا مہاتما بدھہ کی زندگی سے تعلق ہے مقدس مقام مانتے ھیں. ایسے مقاموں میں بدھہ گیا، سارناتھ، کسیا، لومبھنی، وغیرہ بہت بڑے ھیں. ان مقاموں کے ھر ایك عقیدتمند خادم کے طریقے صرف برھما ھی میں نہیں ھیں، بلکہ ان سبھی ملکوں میں ھیں جہاں بدھہ مذھب آج تك رائج ہے، آج بھی وھاں جاری ھیں.

جب میں مدراس کانگریس کے بعد دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع اور جنوری سنہ ۱۹۲۸ع میں چند دنوں کیلئے لنکا گیا تھا، تو یہی خیالات وھاں بھی میرے دل میں پیدا ھوئے. انہیں احساسات نے میرے دل میں یہ خیال ڈالا تھا. ھمارا یہ فرض ہے کہ بدھہ گیا اور بدھوں کے دوسرے مقدس مقامات کا انتظام ھم ایسا کردیں کہ ساری دنیا کے بدھہ مطمئن ھوجائیں. اور انتظام بھی ان استھانوں کے مرتبہ کے قابل ھو. یہ تاریخ کے حیرت انگیز کارناموں کا ایك عجیب نمونہ

ہے کہ آج اپنے پیدائشی مقام میں بدھہ مذہب نہیں پایا جاتا. بہار اور یوپی (صوبہ متحدہ) میں جہاں مہاتما بدھہ نے جنم لیا، عبادتیں کیں. گیان اور دھیان سیکھا، ریاض و مجاہدہ کیا، وہاں شاید ھی انگلیوں پر گننے کے قابل چند «بدھہ مت» کے لوگ مل سکیں گے. لیکن بدھہ مذہب کے پیرو کڑوروں کی تعداد میں آج دوسرے دیسوں میں ملتے ھیں. ایك طرف تبت، ترکستان، منگولیا، چین، کوریا، جاپان، اور دوسری طرف سیلون، برھما، سیام، ھندچین؛ اور ھندوستانی جزیروں میں آج بھی بدھہ مذہب وہاں کے رھنے والوں کی زندگی کا سہارا بنا ھوا ہے. میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیوں اور کیسے ھوا. اس ملك میں مورخوں کا یہ کام ہے کہ وہ اس بات کی تلاش کریں کہ بدھہ مذہب ھندستان میں کیسے فنا ھوگیا.

یہ نہیں مانا جاسکتا کہ ھندوؤں نے بدھہ مذہب کو مادی طاقت سے دبا دیا ہے. اس کا ناقابل تردید ثبوت یہ ھے کہ ھندو مذہب نے برابر اپنی رواداری کو صرف دکھایا ھی نہیں بلکہ اپنے اصولوں میں اسے اونچا مقام بھی دیا.

هندو مذهب نے مہاتما بدهه کو بهی اپنے اوتاروں میں مان لیا هے. اس سے ظاهر هے که هندوؤں نے بدهه مذهب کو زبردستی نهیں دبایا اور نه فنا کیا. بدهه مذهب کے اصول بیشتر قدیم مروجه «سناتن دهرم» کے اصول هیں. انمیں جو کچهه نئی باتیں تهیں. یا زندگی اور رهن سهن میں ان کے ذریعه سے جو بهی تبدیلیاں هوئی تهیں ان سبکو هندوؤں نے اپنا لیا. وقت پر هندو دهرم اور بدهه مت کا فرق دور هو گیا. آخر میں هندو دهرم هی ره گیا. اسکی تصدیق حال کی کچهه مذهبی تحریکوں کی تاریخ سے بهی هوتی هے.

برهمو سماج هندو دهرم هی کی ایک شاخ سمجهی جاتی هے لیکن موجوده هندو دهرم اور اسمیں کافی فرق تها. وقت پر وه فرق بهی کم هوتا گیا. اب کچهه دنوں میں وه فرق یکبارگی فنا هو جائیگا. اسی طرح نه جانے کتنی شاخیں سناتن دهرم سے نکلیں اور فنا هوگئیں. بدهه مذهب غیر ملکوں میں پهنچگیا اسلئے وهاں وه ره گیا. اس وجه سے وه غیر ملکوں میں تو پایا جاتا هے لیکن اپنی جنم بهوم میں نهیں. لنکا، تبت، چین وغیره میں، کب اور کس طرح کس کے

ذریعه سے پرچار هوا۔ اس کا بہت کچھ پتـه مورخوں کو لـگ چکا هے۔ وہ ایك عجیب کہانی هے جسے همارے ملك کے لوگوں کو جاننا چاهئے۔ یه کام عالموں کا هے که اسے هماری تاریخ کی کتابوں میں مناسب اور موزوں جگه دیں تاکه سبھی لوگ اس سے واقف هوجائیں۔

جین دهرم کا پرچار بھی تقریباً اسی وقت هوا جس وقت بودهه دهرم کا هوا تها۔ جہاں تك میں جانتا هوں جین دهرم کے بعـد جین دهرم کے بانی مهابیر کی پیدائش بودهه کی پیدائش سے کچھ پہلے هی هوئی تهی۔ لیکن دونوں ایك هی زمانه میں تهے۔ دونوں نے اهنسا کو دهرم کا بڑا جز بتایا تها۔ دونوں نے اپنی زندگی میں هی تمام ملك میں پهر کر اپنے مذهب کا پرچار کیا تها۔ دونوں کا صرف زمانه هی ایك نہیں تها۔ بلکه کام کا میدان بھی ایك تها یعنی هندوستان کا وهی حصه جسے آج بہار کہتے هیں۔ اور یوپی کا پوربی حصه۔ بدهه مذهب وقت پر غیر ملکوں میں بھی گیا۔ اشوك اعظم کے زمانے میں هی وہ هـندوستان کے بھی بہت سے حصوں میں پهیل گیا تها۔ لیکن جین مذهب بہار سے نکل کر

ہندوستان کے اندر ھی پھیلا. بہار سے پوربی دکھن کا راستہ لیکر دوردراز دکھن تک گیا. پھر وھاں سے اتر کی طرف بڑھکر پچھم تک چلا گیا. یہ ایک تعجب خیز واقعہ ہے کہ اپنے جنم استھان میں دونوں مذھب فنا ھوگئے. بودھہ تو یکبارگی لیکن جینی بھی جتنے آج دوسرے صوبوں میں پائے جاتے ھیں اتنے بہار میں نہیں. اور جو ھیں بھی وہ اس زمانہ کے نہیں ھیں جب جین دھرم کی بنیاد پڑی تھی. وہ پرانے جینیوں کی نسل سے شاید ھی ھوں. دوسری جگہ سے آکر بہار میں بس گئے ھیں. لیکن جس طرح سے "بدھہ مت" کے مقدس مقام وغیرہ بہار میں ھیں اسی طرح جینیوں کے بھی ھیں. جن میں "پاواپوری"، راجگڈھہ پساشر بہ باتھ وغیرہ بڑے مقامات ھیں.

ایک اور عجیب بات یہ ھے کہ دونوں دھرموں کے بانیوں نے اھنسا کو اگرچہ اعلی دھرم مانا ھے. پھر بھی اھنسا کا مطلب الگ الگ لیا. آج شاید ھی کوئی بودھہ ھو جو گوشت نہ کھاتا ھو. انہوں نے کسی جانور کو خود مارنا تو گناہ سمجھا لیکن اگر کوئی دوسرا مارے تو گوشت کھانا برا

نہیں سمجھتے. برخلاف اس کے جینیوں نے اس «اھنسا» کو
اتنی دور تک پہنچایا کہ مچھر اور موذی جانوروں تک کو
مارنے کو بھی وہ پاپ سمجھنے لگے. ان کے رشی منی تشدد
سے بچنے کے لئے کئی طریقوں سے تکلیف اٹھاتے ھیں.
معمولی گھر والے بھی کھانے پینے کے متعلق بہت سختی سے
اصولوں کی پابندی کرتے ھیں جس میں کسی جاندار کی جان
انجان طور بھی نہ جائے. لیکن چاھے جس طور سے
ھو دونوں دھرموں میں اس بنیادی اصول کی عملی شکل میں
اتنا فرق ضرور ھوگیا ھے. آج اھنسا کے اصول کو تو
دونوں ھی مانتے ھیں. لیکن آج کی دنیا کو اس اھنسا کی
ضرورت ھے جس کو مہاتماجی نے ھر طریقہ سے اپنی زندگی
کا جز بنانے کی کوشش کی وھی آج کل کی تکلیفوں سے
نجات حاصل تدبیر ھے.

اٹھارھواں باب

لاهور کانگریس نے کانگریس کے عقیدے کو بدل کر کامل آزادی کو حاصل کرنا اپنا عقیده بنا لیا. اور یه بهی طے کیا که اس کے لئے ستیه گره کی جائے. میں اسوقت بہت بیمار تها اس لئے کانگریس میں نہیں جاسکا. کانگریس کے بعد جب میں اچها هوگیا اور تهوڑی بہت طاقت بهی آ گئی اسوقت ۲۶ جنوری کو سب سے پہلے کامل آزادی کا دن منائے جانے کے جلسه میں اپنے گاؤں « جیرادئی » سے آ کر جہاں میں آرام کر رها تها شریك هوا. اس کے بعد هی سے ستیه گره کی تیاری اور بهی زور سے هونے لگی. سابرمتی میں ورکنگ کمیٹی (مجلس عامله) کا جلسه هوا. اس میں میں شریك هوا. مهاتما جی نے کہا که « نمك کے قانون کو توڑ کر ستیه گره کی جائے ». نمك پر ٹیکس لگا هوا تها جس سے هند سرکار کو کڑوروں روپیه کی سالانه آمدنی هوتی تهی. کوئی آدمی بغیر گورنمنٹ کے حکم کے اور ٹیکس ادا کیئے نه تو نمك بنا سکتا تها اور نه بیچ سکتا تها. یه ایك ایسا

ٹیکس تھا جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا تھا. غریب سے غریب آدمی کو بھی چاھے وہ دو وقت کے بعد بھی کچھ کھائے ھر ایک لقمہ پر ٹیکس دینا ھی پڑتا تھا. کیونکہ بغیر نمک کے وہ ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتا تھا.

هندستان تین طرف سمندر سے گھرا ھوا ھے. سمندر کے کنارے بغیر کسی محنت کے بٹور لینے سے مفت ھی میں نمک مل سکتا تھا. لیکن غریب سے غریب آدمی بھی بغیر ٹیکس دئے اس نمک کو بھی جسے قدرت مفت دیتی تھی نہ اٹھا سکتا تھا اور نہ کھا سکتا تھا. اس کا نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ھندوستانی لوگ نمک بھی کم کھاتے، اس کا اثر یہاں کے لوگوں کی تندرستی پر ضرور برا پڑتا ھوگا. کیونکہ نمک ایک بہت زیادہ ضروری غذائی چیز ھے. مہاتماجی نے سوچا تھا کہ ستیہ گرہ سے ھم غریب سے غریب آدمیوں کو بھی دکھلا دیں گے کہ یہ ظالمانہ ٹیکس اٹھا دینے کی کوشش انہیں لوگوں کے لئے کی جا رھی ھے. اسمیں کسی دوسرے کا کچھ بھی نقصان نہ تھا. صرف گورنمنٹ کو ھی ٹیکس کا نقصان ھوتا. جب مہاتماجی نے یہ تجویز

ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کی تو ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ لوگونمیں یہ بات کہاں تک جوش پیدا کرسکے گی، خاصکر ایسی جگہ کے لوگوں میں جو سمندر کے کناروں سے دور رہتے ہیں. اور جہاں کے لوگوں کو دوکانوں ھی سے نمک خرید کر کھانا پڑتا ھے ان بیچاروں کو اسکا بھی پتہ نہیں تھا کہ جو نمک وہ خرید رھے ھیں اسکے داموں میں ٹیکس کا بھی جز ھے. اور وہ بھی نمک کے اصلی دام سے کہیں زیادہ ھے. وہ اگر نمک کا قانون توڑنا چاھیں گے تو کیسے توڑیں گے؟ کیونکہ ان کے یہاں نہ تو سمندر کے کنارے کا نمک ھی ھے جسے وہ اٹھا لیں اور نہ سمندر کا پانی جسکو ابال کر نمک بنالیں. اس لئے قانون کے توڑنے میں بھی بڑی دشواری دکھائی دی. لیکن مہاتماجی اس پر اڑے رھے. آخر میں طے ہوا کہ نمک کا قانون توڑا جانا چاھئے.

بہار کے کئی ضلعوں میں مٹی سے شورہ اور نمک اس سے پہلے بنایا جاتا تھا. میں نے اپنے گاؤں ھی میں دیکھا تھا کہ ایک ذات کے لوگ جو اپنے پیشہ ھی کی وجہ سے «لونیا»

کہلاتے هیں مٹی سے شورہ بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح اور
بھی بہت سی جگہیں ایسی هیں جہاں مٹی سے نمك بن سکتا ھے۔
کہیں تو اس قسم کی جھیلیں بھی هیں جنکا پانی نمکین ھے
اور جس سے نمك بن سکتا ھے۔ یہ سوچا گیا کہ سمندر کے
کنارے کے لوگ نمك بٹور کر نمك کا قانون توڑ سکیں گے،
لیکن دوسری جگھوں میں کچھ لوگ مٹی سے ھی نمك
بنا کر قانون کو توڑیں گے اور کچھ لوگ غیر قانونی نمك کا
بیوپار کرکے اسکو توڑیں گے۔ مضمونوں اور اخباروں سے
مٹی سے نمك بنانے کا طریقہ بھی لوگوں کو بتایا گیا۔
مجھے اس کے متعلق بہت شبہ تھا کہ بہار کے لوگوں میں
ھم نمك کے قانون توڑنے کا آیا بہت جوش پیدا کر سکیں گے یا
نہیں۔ مہاتماجی سے یہ بات میں نے کہی اور ان کو بتایا بھی
کہ ایك دوسرا قانون ھے جو سبھی گاؤں میں جاری ھے۔
اور جسکی وجہ سے لوگوں میں بڑی بے چینی بھی ھے۔

بہار کے ھر گاؤں میں ایك یا دو یا اس سے بھی زیادہ
چوکیدار رکھے جاتے ھیں، جنکا یہ کام ھوتا ھے کہ گاؤں

کی چوکیداری کریں تاکہ چوری، ڈکیتی نہ ہونے پائے. اور اگر کسی قسم کا کوئی حادثہ ہو جائے تو وہ پولیس افسروں کو اسکی خبر کردیں، فوتی، پیدائش کی رپورٹ تھانہ میں پہنچائیں. ہر ایک قسم کی خبر گورنمنٹ کو دیتے رہیں اور گورنمنٹ کا حکم بھی گاؤں کے لوگوں تک پہنچاتے رہیں. گورنمنٹ کا کوئی دوسرا نوکر بہار کے گاؤں میں نہیں رہتا ہے. کیونکہ وہاں دوامی بندوبست (پرمننٹ سٹلمنٹ) کی وجہ سے گورنمنٹ کو جنتا سے زمین کی مال گزاری وصول نہیں کرنی پڑتی تھی. زمیندار خود وصول کرکے مقررہ رقم گورنمنٹ کو پہنچا دیا کرتا ہے. اس لئے ایک طرح سے گورنمنٹ کا نمائندہ گاؤں میں چوکیداری کرتا ہے. اسکو جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ گاؤں کے لوگوں سے ہی ایک خاص ٹیکس کے ذریعہ سے جسے چوکیداری ٹیکس کہتے ہیں وصول کیا جاتا ہے. یہ ٹیکس گاؤں کے تقریباً سب لوگوں کو دینا پڑتا ہے. اور حیثیت کے مطابق چھ آنہ سے لیکر بارہ روپے سالانہ تک

ہوتا ہے. گاؤں کے لوگوں میں اس سے بڑی بے چینی ہے کیونکہ یہ بڑی سختی سے وصول کیا جاتا ہے. صرف یہی نہیں، ٹیکس لگانے میں بھی بڑی زیادتی ہوا کرتی تھی. کیونکہ غریبوں پر زیادہ لاد دیا جاتا ہے. بڑے لوگ مالدار ہونے پر بھی کم دیتے ہیں.

میں نے مہاتماجی سے کہا کہ یہ ٹیکس براہ راست ہر آدمی کو دینا پڑتا ہے اسلئے وہ اسے جانتا ہے. اور اس سے وہ بیچین بھی ہے لیکن لوگوں کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ نمک کا ٹیکس کب ان سے لیا گیا. کیونکہ ٹیکس نمک بنانے والے ہی دے دیتے ہیں، نمک کے خریدار کو الگ سے نہیں دینا پڑتا ہے. اسکو تو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ دام میں سے کتنا ٹیکس کی شکل میں دیا اور کتنی نمک کی اصلی قیمت دی ہے اس لئے نمک کے قانون سے اتنی بے چینی دیکھنے میں نہیں آتی. لوگوں کو اس کے توڑنے میں اتنا جوش نہیں ہوگا. میں نے مہاتماجی سے اس لئے یہ اجازت چاہی تھی کہ بہار میں چوکیداری ٹیکس نہ دینے کی اجازت دے دی جائے، تاکہ وہاں ہم لوگ ستیہ گرہ کو یہی شکل دے دیں. انہوں

نے ہم سے کہا « ایسا مت کرو کیونکہ اگر ایسا کروگے تو جلد ہار جاؤگے اور گورنمنٹ تم کو دبا دے گی» لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں پوری طرح نہ آئی پھر بھی میں ایسی باتوں میں ان کے تجربہ کا ضرور قائل تھا. میں نے مان لیا کہ نمک کے قانون کے خلاف ہم جہاں تک ہو سکے ستیہ گرہ کی کوشش کریں گے. میرے دل میں یہ ڈر تھا کہ اس میں ہم زیادہ کامیاب نہیں ہونگے. پھر بھی میں اتنا تو جانتا تھا کہ بہار کے بہت سے ضلعوں میں نمک کا قانون توڑنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی. کیونکہ وہاں مٹی سے نمک بنانے والے سبھی گاؤں میں تھے. اور وہ کام دوسرے لوگ بھی بآسانی کرسکتے تھے. ہم نے بہار لوٹ کر نمک بنانے ہی کا کام شروع کرایا. دوسری جگہوں کی طرح اسمیں تعجب خیز کامیابی ہوئی.

مہاتماجی نے یہ ارادہ کیا وہ خود بھی نمک کا قانون توڑینگے. اس کیلئے وہ احمدآباد کے سابرمتی آشرم سے «ڈانڈی» تک پیدل ہی جائیں گے. جو سمندر کے کنارے ہے. ان کے جانے کی تاریخ مقرر ہوگئی. ڈانڈی پہونچ کر ٦ اپریل کو

نمک اکٹھا کرنے کا ارادہ کیا. سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کافی دور ہے. وہاں تک پیدل پہونچنے میں تین ہفتوں سے زیادہ لگتے ہیں. درمیان کے پڑاؤ مقرر ہو گئے مہاتماجی ۸۰ آدمیوں کے ساتھ آشرم سے ڈانڈی کے لئے روانہ ہو گئے. چلتے وقت انہوں نے اعلان کردیا کہ «اب وہ تو سوراج لیکر ھی آشرم میں لوٹیں گے. نہیں تو ان کی میت لوگ سمندر میں بہتی پائیں گے» انہوں نے یہ بھی اعلان کردیا کہ «سب جگہ لوگ تیاریاں کریں لیکن جبتک وہ خود ستیہ گرہ نہ کریں اور دوسروں کو ستیہ گرہ کرنے کا حکم نہ دیدیں اس وقت تک کوئی ستیہ گرہ نہ کرے، مہاتماجی کا یہ سفر جیسے ھی شروع ھوا سارے دیس میں بڑا جوش پیدا ہوگیا. انکے ساتھ ۸۰ ستیہ گرھی تھے، لیکن انکے پیچھے پیچھے ہزارھا آدمیوں کی بھیڑ چلتی تھی. بھیڑ کچھ دور تک جاتی اور جب دوسرے گاؤں کے لوگ آجاتے تو پچھلے گاؤنکے لوگ واپس ہوجاتے، اس طرح روزانہ بھیڑ ساتھ میں رہتی. سارے ملک میں روز بروز جوش بڑھتا ھی گیا. یہ جوش صرف وھیں نہیں تھا جہاں مہاتماجی سفر کررھے تھے بلکہ یہ سارے ملک میں

دیکھنے میں آیا۔ سبھی جگہوں پر لوگ ستیہ گرہ کی تیاری اور نہایت بے چینی کے ساتھ مہاتماجی کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے جواہرلال جی کو جو اس سال کانگریس کے صدر ہوئے تھے دعوت دی۔ اور ان کے ساتھ بہار کے کئی ضلعوں کا دورہ کیا۔

انیسواں باب

اس جگہ ستیہ گرہ کی تاریخ نہیں دی جاسکتی، لیکن اس کی کچھ ایسی باتیں جو خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں دی جاسکتی ہیں۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مہاتما جی نے ڈانڈی جاترا کے موقع پر نکلتے وقت کہا تھا کہ ‹‹ یا تو میں سوراج لے کر ہی آشرم میں لوٹوں گا یا میں ختم ہوجاؤں گا ›› انہوں نے اپنے اس قول کو پورا کیا کیونکہ وہ پھر سابرمتی آشرم میں نہیں لوٹے اس ستیہ گرہ کے ختم ہونے کے بعد وہ وردھا چلے گئے۔ اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہاں سے تھوڑی ہی دور جا کر ایک گاؤں میں رہنے لگے جس کا نام اب ‹‹ سیوا گرام ›› ہے۔ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جس میں ہر لفظ کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اور جس کے مطابق وہ عمل کے لئے تیار نہ ہوتے۔ اتنا بڑا آشرم کہ جس کے بنانے میں انہوں نے تقریباً پندرہ برس لگائے تھے، اور جس کی عمارتوں میں لاکھوں روپے انہوں نے خرچ کئے تھے، اور مختلف قسم کے تعمیری کاموں کا مرکز

بنا ہوا تھا، جہاں سچے ستیہ گرہی تیار ہوگئے تھے، جہاں کی زندگی اور رہن سہن سارے ملک کے خادموں کے لئے ایک مثال اور ہدایت تھی. جس کو انہوں نے اسی محبت سے پالا پوسا تھا، جس طرح ماں لاڈ پیار سے بچوں کو پالتی ہے. اس کو ہمیشہ کے لئے انہوں نے چھوڑ دیا. اس سے مطلب یہ نہیں کہ آشرم ٹوٹ گیا. یا جو کام وہاں ہورہا تھا ختم ہوگیا. بلکہ اس کا صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ مہاتماجی وہاں خود نہیں گئے. جو لوگ وہاں رہ گئے تھے وہی وہاں کے کاموں کو چلاتے رہے. بعد میں وہ ہریجن خدمت کے کام میں لگا دیا گیا. آج بھی وہ اسی کام میں مصروف ہے. «مہاتماجی» سنت تلسی داس جی کی اس چوپائی کو یاد رکھتے تھے اور اس کے مطابق عمل کیا کرتے تھے:

«رگھوکل»[1] کا طریقہ ہے سدا سے
نہ جائے بات چاہے جان جائے (مترجم)

اس کی دوسری روشن مثال کچھ دنوں بعد دیکھنے میں

۱ — مہاراج رام چندر جی کے ایک مورث اعلی کا نام «رگھو» تھا، اسلئے یہ خاندان «رگھو کل» کہلایا. کل بمعنی خاندان۔ یہ اس «چوپائی» کا شعر ہی میں ترجمہ ہے جو اصل کتاب میں ہے.

آتی ھے۔ جب ۱۹۳۲ میں انہوں نے بردوا جیل میں ھریجنوں کے لئے الگ انتخاب کے مسئلہ کی مخالفت کی تھی۔ جب وہ ۱۹۳۱ع میں گول میز کانفرنس میں گئے تھے تو وھاں ھندو مسلم مسئلہ حل نہ کرسکے۔ انہوں نے وھیں دیکھ لیا تھا کہ ھریجنوں کی طرف سے بھی علحدہ انتخاب کے میدان کی مانگ ھے۔ اس وقت انہوں نے ایک تقریر میں ایک یہ بات کہدی تھی کہ علحدہ انتخاب کا حق دیکر اگر ھریجنوں کو دوسرے ھندوؤں سے ھمیشہ کے لئے اچھوت رکھا گیا تو وہ اس کی مخالفت اپنی جان دیکر بھی کریں گے۔ وزیر اعظم میکڈانل نے ھریجنوں کے لئے الگ چناؤ کا حق اپنے فیصلے میں منظور کرلیا۔ اس وقت مہاتما جی جیل میں تھے۔ انہوں نے جیل ھی سے گورنمنٹ کے ساتھ خط وکتابت شروع کی۔ اپنی اس بات کو بھی یاد دلایا اور کہا کہ اگر گورنمنٹ اس فیصلہ کو رد نہیں کرے گی تو ان کو اپنے عہد کے مطابق اپنی جان ھی کی بازی لگا دینی پڑے گی۔ جب گورنمنٹ نے ان کی بات اس وقت نہین سنی، تو انہوں نے روزہ رکھا اور اعلان کیا کہ کہ جب تک وہ فیصلہ نہیں بدلا جائے گا تب تک ایک دانہ

بھی نہیں کھائیں گے۔ خوش قسمتی سے فیصلہ میں یہ شرط تھی کہ اگر سب فریق جن کا کسی خاص مسئلہ سے تعلق ہو مل کر ایک رائے سے اس میں تبدیلی کرانا چاہیں تو وہ کی جا سکتی ھے۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ھریجنوں اور دوسرے ھندوؤں کے درمیان یہ سمجھوتہ ھوگیا کہ حق انتخاب علحدہ نہیں ھوگا۔ لیکن ھریجنوں کے لئے مختلف اداروں میں تعداد کے اعتبار سے ان کی جگہیں محفوظ کردی جائیں گی۔ شری میکڈانل کے فیصلہ میں ان کو جتنی جگہیں ملی تھیں اس سے کہیں زیادہ جگہیں ھریجنوں کو مل گئیں۔ لیکن چناؤ کا طریقہ دوسرا کردیا گیا، علحدہ حق انتخاب منسوخ کردیا گیا۔ سمجھوتہ ھوتے ھی برٹش گورنمنٹ نے اسے مان لیا اور اپنے فیصلے کو سمجھوتے کے مطابق بدل دیا۔ جس وقت مہاتماجی نے وہ بات گول میز کانفرنس میں کہی تھی اس وقت کسی نے یہ مطلب نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس کو حرف بحرف پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ جب گورنمنٹ نے انکے لکھے ھوئے خطوط شائع کردئے جس میں انہوں نے اس بات کی طرف دھیان دیتے ھوئے روزہ کے ذریعہ سے پورا کرنے

کے لئے اپنے ارادے کا اعلان کیا تھا، تو سارے ملک میں کھلبلی مچ گئی، جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ مندرجہ بالا سمجھوتہ ھوکر برٹش گورنمنٹ کے فیصلہ میں ترمیم ھوگئی۔

جب مہاتماجی "ڈانڈی" جاترہ کے لئے تیار ھو رہے تھے تو کچھ لوگوں کا خیال ھوا کہ جاترہ شروع کرنے کے وقت سارے ملک کے لئے ایک سندیس دیں۔ جو گراموفون کے لئے ریکارڈ کرلیا جائے اور وھی سارے ملک میں لوگوں کو سنایا جائے۔ امید کی جاتی تھی کہ اس طرح یہ تاریخی پیغام مہاتماجی کے لفظوں میں ھی بلکہ ان کی اپنی آراز میں بھی گاؤں گاؤں پہنچا دیا جائے۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مہاتماجی کو گورنمنٹ کب تک آزاد رہنے دے گی۔ یہ سوچ لیا گیا تھا کہ اس حالت میں ان کا پیغام انکی اپنی ھی آواز میں ان کے جیل جانے کے بعد عوام کو پہنچتا رہے گا، جو ستیہ گرہ کے لئے ضروری اور جوشیلا جذبہ پیدا کرنے والا ثابت ھوگا۔ اس وقت میں بھی سابرمتی میں تھا۔ لوگوں نے کہا کہ میں ھی اس تجویز کو مہاتماجی کے سامنے پیش کروں۔ اس کا جواب جو کچھ مہاتماجی نے دیا اس سے انکے اٹل بھروسے اور انکی

صداقت کا ثبوت ملتا ھے۔ انھوں نے کہا "اگر میرے پیام میں سچائی ھے تو میں جیل کے اندر رھوں یا باھر اسے لوگ سن ھی لیں گے۔ لیکن اگر اس میں سچائی نہیں ھے تو تم اگر ھزار کوششیں بھی کروگے تو گراموفون کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی طرح یہ ستیہ گرہ شروع کی جا رھی ھے۔ اگر سچ مچ ستیہ گرہ ھے اور ھم اسے پوری سچائی اور اھنسا پر چل کر پورا کرتے ھیں تو وہ ضرور کامیاب ھوگی۔ چاھے لوگ میرے الفاظ سنیں یا نہ سنیں میری اپنی آواز ان کے کانوں تک پہنچے یا نہ پہنچے، اس لئے ایسے ریکارڈ کی نہ تو کوئی ایسی ضرورت ھے اور نہ اس سے کوئی فائدہ ھی ھوگا"۔ اس کے بعد پھر کسی کی ھمت نہ ھوئی کہ وہ کچھ زیادہ اصرار کرے۔

جب ستیہ گرہ شروع ھوئی اور اچھے اچھے لوگ جیل جانے لگے تو صرف جنتا ھی پر اس کا اثر نہیں ھوا بلکہ گورنمنٹ ملازموں پر بھی اثر پڑتا ھوا دکھائی دیا۔ خاص کر ان لوگوں پر جن پر اس تحریک کے دبانے کا بوجھ ڈالا گیا تھا۔ ایسا سبھی جگھوں پر دیکھا گیا۔ میں اس موقعہ پر بہار

کے کچھ واقعات بیاں کر دینا چاھتا ھوں جن کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ھے۔ یہ چمپارن کا ذکر ھے کہ سب سے بڑے کارکنوں میں سے ایک «وپن بہاری ورما» تقریباً آدھے ضلع کا دورہ کر کے ستیہ گرہ کریں گے۔ جیسا مہاتماجی نے «ساورمتی» سے ڈانڈی تک سفر کرنے کے بعد نمک کے قانون کو توڑا تھا، «وپن باپو» بھی پیدل ھی کچھ رضاکاروں کے ساتھ نکلے، درمیان میں چار پانچ میل کے بعد ٹھہر جاتے تھے۔ اس طرح جہاں ستیہ گرہ کرنے کا ارادہ تھا وھاں کئی دنوں میں پہنچے۔ راستہ میں جنتا نے بڑی آؤبھگت کی جہاں ٹھہرنا ھوتا وھاں پہلے سے لوگ تیاریاں کر لیتے تھے۔ اس سے بڑی بیداری پیدا ھوئی اور جوش بڑھا۔ ستیہ گرہ کے مقام پر نمک بنانے کے لئے لوگوں نے مٹی اور پانی پہلے ھی سے رکھ لیا تھا۔ پولیس پہلے ھی سے گرفتار کرنیکے لئے تیار تھی۔ تھوڑی دور پر ایک باغیچہ میں مجسٹریٹ کا خیمہ بھی لگا ھوا تھا جہاں وہ پہلے ھی سے مقدمہ سننے اور سزا دینے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب کہ صوبہ میں باضابطہ ستیہ گرہ ھونے والی تھی۔ دوسری جگہوں میں

بھی لوگوں نے اسی طرح ستیہ گرہ کرنے کا انتظام کیا تھا.

میں خود چمپارن چلا گیا. کیونکہ مہاتما جی کا اس مقام سے کافی تعلق رہ چکا تھا. میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ نمک بنانے کی تقریب ختم ہو چکی تھی. قانون توڑنے والے گرفتار ہو کر مجسٹریٹ کے پاس پہنچ چکے تھے. مجسٹریٹ مقدمہ سننے جا رہا تھا، مجسٹریٹ کا چہرہ اترا ہوا اور اداس تھا گردن لٹکائے میز پر ہی اس کی آنکھ لگی تھی. جب تک ہم لوگ وہاں رہے اس نے ایک بات بھی نہیں کی اور سر بھی نہیں اٹھایا، جو کچھ لکھتا پڑھتا نیچے ہی سر کئے ہوئے لکھتا تھا. اسی حالت میں اس نے سب کام پورا کیا اور چھ ماہ کی سزا کا حکم سنا دیا. دیکھنے سے لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں بڑی چوٹ لگ رہی ہے، لیکن اس کے لئے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا. اس لئے مجبوراً اپنا کام کرنا ہی تھا. مجسٹریٹ کی ایسی حالت ہونے کی ایک خاص وجہ بھی تھی.

۱۹۲۱ ع میں عدم تعاون بہت زور سے چل رہا تھا. طالب علموں کو کالج چھوڑ کر نکل کر آنے کے لئے کہا گیا تھا.

اس وقت یہ مجسٹریٹ اپنے کالج کے ایک طالب علم تھے۔ پڑھنے میں بہت تیز تھے اور ان کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اسوقت وہ بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ جس کا امتحان دو تین ماہ کے بعد ہی ہونے والا تھا۔ جب کالج کے دوسرے طالبعلم کالج چھوڑ کر نکلے تو یہ بھی انکے ساتھ نکل آئے۔ جو قومی کالج ہم نے کھولا تھا اسمیں آکر داخل ہوگئے۔ لیکن یہ خبر پاتے ہی ان کے گھر کے لوگ انہیں زبردستی پکڑ لے گئے۔ قومی کالج سے جاتے وقت بھی میں نے انکے چہرے پر وہی اداسی اور پریشانی دیکھی تھی جو آج نو برس کے بعد ان کے مجسٹریٹی چہرے پر دیکھنے میں آئی۔ ہاں قومی کالج سے چلے جانے کے بعد امتحان پاس کرکے مجسٹریٹ ہوگئے۔ آج انکی آنکھیں اور بھی اوپر نہیں اٹھتی تھیں کیونکہ میں وہاں موجود تھا۔

سزا ہونے پر "وپن بابو" موتی ہاری دیر میں پہنچائے گئے وہاں جیل پر بڑی بھیڑ ہوگئی تھی۔ جیل کے ملازم کچھ گھبرا رہے تھے کہ کہیں بلوہ فساد نہ ہوجائے۔ لیکن کچھ ہوا نہیں۔ جب میں وہاں سے پٹنہ لوٹا تو سنا کہ کچھ نوجوان

نے نمك بنانے کا اعلان کردیا ھے. بانکی پور سے پٹنہ سٹی کے لئے جلوس بنا کر روانہ ھوئے تھے. لیکن راستہ میں ایك جگہ پولیس نے انکو روك دیا، لڑکوں نے واپس جانے سے انکار کردیا. لیکن پولیس نے ان کو گرفتار نہیں کیا بلکہ لڑکے سڑك پر قطار باندھے سڑك پر بیٹھے ھوئے تھے. میں رات کو کشتی سے اتر کر سیدھا سلطان گنج کے تھانہ پر گیا جہاں لڑکوں کے پڑے رھنے کی خبر تھی. میں نے جاکر دیکھا کہ بیچ سڑك لڑکے سو رھے ھیں، پولیس کے سپاھی سڑك روکے کھڑے ھیں، محلہ کے لوگوں نے لڑکوں کو کھانا کھلایا تھا. اور ان کے لئے سڑك پر بستر بھی بچھادئے اس لئے وہ سب کے سب وھیں سورھے تھے. میں نے دیکھ لیا تھا کہ اب رات میں کچھ ھونے والا نہیں، اسلئے صبح پھر آنے کے خیال سے صداقت آشرم چلا گیا.

دوسرے دن بہت سویرے جب پہنچا تو دیکھا کہ لڑکے تو وھاں کھڑے ھی ھیں، پولیس بھی انکے مقابلہ میں کھڑی ھے ایك طرف لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جارھی ھے، دوسری طرف پولیس کے سپاھیوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی، جن میں کچھ

سوار اور بندوق والے سپاھی بھی تھے۔ ہم لوگ یہی سوچ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ھے۔ کہ اتنے میں انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ بھی پہنچ گئے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں بھی پہنچ گیا ہوں اور مجمع کو سنبھالنے میں لگا ہوا ہوں تو انہوں نے مجھے تھانہ کے اندر بلا کر کہا کہ ان لڑکوں کو واپس جانے کے لئے کہدیجئے نہیں تو ہم کو سخت کارروائی کرنی پڑے گی۔ میں نے کہا کہ اگر لڑکوں نے کچھ قصور کیا ھے تو آپ گرفتار کرسکتے ھیں، سزا دینی چاھیں تو وہ بھی دے سکتے ھیں۔ لیکن میں ان سے واپس جانے کے لئے نہیں کہہ سکتا۔ اسپر انہوں نے یہ کہا کہ اتنی بڑی بھیڑ یہاں اکٹھا ہوگئی ھے کہ اگر کوئی فساد ہوا تو اسکی ذمہ داری آپ کے سر رہے گی۔ میں نے جواب دیا کہ ذمہ تو میں لیتا ہوں لیکن یہ بھی کہہ دینا چاھتا ہوں کہ لوگوں کی طرف سے کوئی فساد نہیں ہوگا۔ اگر آپ ان لڑکوں کو راستہ دے دیتے ھیں تو پورا مجمع خود ھی چھٹ جائیگا۔ بہرحال وہ ایسا کب کرنے والے تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں اگر گولی چل گئی تو کوئی نہ کوئی سنگین واقعہ

ہوسکتا ھے، اس لئے بہتر یہی ھے کہ کانگریس کے اور ساتھیوں سے مشورہ کرلوں. چنانچہ جب میں نے یہ کہا کہ میں اپنے ساتھیوں سے اس مسئلہ میں مشورہ کرلینا مناسب سمجھتا ہوں، اسوقت انہوں نے دیکھا کہ میں کچھ نرم پڑ رہا ہوں. اس پر وہ کچھ اور تیز ہوکر بولے کہ آپ کو آدھا گھنٹہ کا وقت دیتا ہوں، اپنی گھڑی میری گھڑی سے ملا لیجئے. مجھکو یہ برا لگا اور میں نے وھیں کہدیا کہ اگر آدھ گھنٹے کے اندر اسکا جواب نہ دیدوں تو آپ سمجھ لیں کہ میں ان کے ہٹانے سے انکار کررھا ہوں، پھر آپ جو جی چاھیں کریں. یہ کہکر میں وھاں سے آشرم کے لئے روانہ ہوگیا.

صداقت آشرم جاکر اور آپس میں مشورہ کرکے ہم سب نے یہ ارادہ کرلیا کہ ان ستیہ گرھیوں کو وھاں سے نہ ہٹانا چاھئے. یہ سب کچھ آدھ گھنٹہ کا وقت پورا ہونے سے پہلے ھی ہوگیا تھا. ہم نے ٹیلیفون سے کہہ دیا کہ ہم ستیہ گرھیوں کو واپس نہیں ہٹائیں گے آپ جو چاھیں کریں. میں یہ کہہ کر فوراً آشرم سے سلطان گنج کے لئے روانہ ہوگیا. اور میں یہ سوچتا جارھا تھا کہ ممکن ھے وھاں سنگین واقعہ ہوگیا ہو یا

گولی وغیرہ بھی چل گئی ہو تو کوئی اچنبھا نہیں. میں جا ہی رہا تھا کہ راستہ میں اسی مجسٹریٹ کو موٹر میں آتے ہوئے دیکھا اور اس نے بھی مجھے دیکھ لیا مجھے دیکھکر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا. میں سمجھ گیا کہ کوئی سنگین واقعہ نہیں ہوا. جب میں وہاں پہنچا تو میں نے سنا کہ اس نے پہلے تو لڑکوں پر سواروں کو گھوڑے دوڑانے کا حکم دیا. جب گھوڑے دوڑتے ہوئے دکھائی دئے تو لڑکے بے خوف ہوکر ساری سڑك گھیر کر لیٹ گئے. گھوڑے نزدیك آکر رکے اور پھر واپس چلے گئے. ایك دو بار جب ایسا کیا اور لڑکے نہ ڈرے بلکہ گھوڑوں کو آتے دیکھ کر سڑك پر لیٹ جاتے تو آخر میں انہوں نے لڑکوں کو زمین سے اٹھواکر موٹرلاری میں ڈلوایا اور جیل‌خانے بھیج دیا. بس ان کے ھٹتے ھی ساری بھیڑ بھی ھٹ گئی. لوگ ادھر ادھر چلے جا رہے تھے کہ میں وہاں پر پہنچا، مجھ سے یہ سب باتیں کہی گئیں. ہم لوگ بھی یہی چاھتے تھے کہ ستیہ‌گرھی گرفتار کئے جاکر جیل‌خانے بھیج دئے جائیں یا اور جو کچھ گورنمنٹ کرنا چاھے، لیکن ہم کو جو کچھ کرنا تھا اسکو ستیہ‌گرھی نہ چھوڑے. ہم لوگ

پھر جمع ہوکر آئندہ کا پروگرام بنانے کیلئے آشرم میں بیٹھے.
اس کے بعد سے ستیہ گرہی مسلسل چار بار جلوس نکال کر روزانہ جانے لگے. ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بروقت اطلاع دے دی گئی تاکہ پولیس کو چوبیس گھنٹہ تک ستیہ گرہیوں کا انتظار نہ کرنا پڑے. وہ ٹھیک وقت پر آئے اور جہاں چاھے ستیہ گرہیوں کو گرفتار کرے یا جو کچھ کرنا چاھے کرے. ٹھیک وقت پر جب ستیہ گرہی جاتے تو پبلک کی بہت بھیڑ ہوجاتی. ہم لوگوں کے دلمیں یہی ڈر رہتا کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں کچھ فساد ہوجائے. کیونکہ جو بھیڑ جمع ہوتی اس کو منتشر کرنے کیلئے پولیس کے افسر ڈنڈے دکھا کر چابکوں سے پیٹا کرتے. ہم لوگ بھی اسوقت تک وہاں پہنچ جاتے جس میں امن قائم رہے. پولیس کے سوار بلوچی مسلمان تھے جو بہت پہلے ہی سے بہار سرکار کے ذریعہ بہار میں لا کر رکھے گئے تھے. دو انگریز افسر ان کے ساتھ گھوڑوں پر وہاں موجود رہتے. گھوڑے دوڑا کر ڈنڈے اور چابک مارنے کا کام زیادہ تر دونوں انگریز ہی کرتے. اگر کسی کو گرفتار کرنا ہوتا تو دوسرے سوار اسے گرفتار کرکے معمولی پولیس کے

حوالہ کر دیتے۔ جو اسے وہاں سے تھانہ یا جیل میں لے جاتے۔ پروفیسر عبد الباری اور میں دوسرے کانگریسیوں کے ساتھ پہنچ جایا کرتے۔

ایک روز پروفیسر عبد الباری کے خوب ڈنڈے لگے۔ میرے قریب سے بھی گھوڑے دوڑائے گئے لیکن میرے اوپر ڈنڈے کا وار نہیں کیا گیا۔ معلوم نہیں، اتفاق تھا یا جان بوجھکر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ پروفیسر عبد الباری کے بہت چوٹ لگی مگر وہ گرے نہیں، وہ بہت مضبوط تھے ان کے داڑھی بھی تھی اور شکل سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان ہیں۔ ان سے قریب ہوکر ایک بلوچی سوار جا رہا تھا۔ اس نے ان سے آہستہ سے پوچھا "مولوی تم یہاں کیسے آگئے" پروفیسر عبد الباری نے جواب دیا کہ اللہ نے تمہارے ہی لئے مجھے بھیج دیا اس پر وہ سہم گیا اور اس کے بعد اس نے کچھ نہ کیا اور آہستہ ان کو ایک طرف جہاں دوسرے لوگ پڑے تھے پہنچا کر اپنا گھوڑا دوڑا لے گیا۔

یہ سلسلہ روزانہ چلتا رہا۔ ستیہ گرہی گرفتار ہوتے یا نہ

ہوتے لیکن جو بھیڑ جمتی اس پر وار ضرور ہوتا. کچھ لوگ گھائل بھی ہوتے. بھیڑ روز بروز بڑھتی ہی جاتی. مسٹر حسن امام بیرسٹر اور مشہور لیڈر تھے. کلکتہ ھائی کورٹ کی ججی کرچکے تھے. کانگریس کے پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے. لیکن ستیہ‌گرہ میں وہ شریک نہیں ہوئے اس لئے پبلک ان سے ناراض بھی تھی. جس جگہ یہ مار پیٹ ہوا کرتی تھی وھاں سے ان کا مکان بہت دور تھا جسکی ان کو خبر بھی نہ تھی. ایک دن سویرے ان کی بیگم شہر سے لوٹ رھی ھیں. انہوں نے دیکھا کہ کس طرح لوگوں پر ڈنڈے برسائے جا رہے ھیں. کئی نوجوان کے سروں سے خون بہتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا. واپس جاکر سارا قصہ انہوں نے حسن امام سے بیان کیا اور کہا کہ کس طرح نہتے لوگ پیٹے جاتے ھیں اور پھر بھی پر امن رہتے ھیں اور مار کھاکر چلے جاتے ھیں. اس کا اثر مسٹر حسن امام کے دل پر بہت ہوا. انہوں نے ٹیلیفون کر کے مجھے بلایا اور سب حال بھی مجھ سے سنا. وہ بہت جذباتی آدمی تھے اس لئے وہ بہت غصہ اور جوش میں آگئے. مجھ

سے انہوں نے صاف صاف کہا کہ وہ مدد کرینگے. میں بہت خوش ہوا اور ان کو یقین دلایا کہ جہاں تك ہوسکے گا جنتا کی طرف سے کوئی بدامنی نہ ہونے پائے گی.

یہ سلسلہ کئی دن تك چلتا رہا. اس وقت تك «گڈفرائی ڈے» اور ایسٹر آ گیا. معلوم نہیں کیسے میرے دل میں خیال آیا کہ ہماری ستیہ گرہ ایك مذہبی تحریك ہے، اس کی وجہ سے کسی کو اپنی مذہبی پابندی میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑنی چاہئے. کیونکہ جتنے افسر تھے وہ انگریز اور عیسائی تھے اور سوار سب کے سب مسلمان. اس لئے میں نے سوچا کہ جمعہ کو مسلمانوں کی نماز جمعہ ہوتی ہے اور «گڈ فرائی ڈے» اور «ایسٹر» کے دوشنبہ کو عیسائی گرجا جاتے ہیں، اسلئے ان دونوں کا وقت بچا دینا چاہئے. میں نے ایك خط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھ دیا کہ جمعہ کے دن دوپہر کو جس وقت مسلمان نماز پڑھتے ہیں ستیہ‌گرہیوں کا جتھا نہیں جائے گا تاکہ مسلمان سوار اگر چاہیں تو نماز ادا کرسکیں، اور کرسچین افسروں کے لئے بھی جو وقت گرجا جانے کا ہے اس وقت جتھا نہیں بھیجا جائے گا تاکہ وہ اپنا مذہبی فریضہ ادا کرسکیں

ان وقتوں کو چھوڑ کر دوسرے اوقات پر جتھا برابر جایا کرے گا.

یہ خط جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ملا تو اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر کہا کہ وہ مجھ سے ملنا چاھتا ھے. اس کے لئے اس نے وقت بھی بتلایا. میں اس کے گھر پر گیا. جاتے ھی اس نے مجھ سے پوچھا کہ جو بات آپ نے لکھی ھے کیا سچے دل سے لکھی ھے؟ میں نے کہا ھاں میں نے تو سچے ھی دل سے لکھی ھے. اس پر اس نے کہا کہ میں انگریز اور عیسائی ھوں لیکن میں ان انگریزوں میں نہیں ھوں جو برابر تلوار چمکایا کرتے ھیں. میں چاھتا ھوں کہ کوئی ایسا راستہ نکلے کہ گورنمنٹ کا حکم قائم رھے اور جھگڑا بھی ختم ھو جائے. اتنا کہہ کر اس نے یہ کہا کہ «جس سڑك سے جتھے جایا کرتے ھیں اس راستہ کو چھوڑ کر اگر دوسرے راستے، جسے نیچے کی سڑك کہتے ھیں، جائیں تو ھم اسے جانے دیں گے». میں نے کہا «ایسا نہیں ھوسکتا، جتھے کو تو جانا ھی ھے اور اسی راستے سے جانا ھے جب تك اسے روکا جائے گا وہ جایا ھی کرے گا، لیکن اگر وہ

نہ روکا جائے تو یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ جاتا ہی رہے گا.
اور اگر جایا بھی کرے گا تو وہ بھیڑ جو جمع ہوتی ہے نہیں
ہوا کریگی. کیونکہ وہ بھیڑ جتھے کے لئے نہیں بلکہ پولیس
کی کارروائی دیکھنے کے لئے جمع ہو جایا کرتی ہے.

اسی طرح کی باتیں ہوئیں. آخر میں کچھ طے نہیں ہوا اور
میں چلا آیا. دوسرے روز جب جتھا گیا تو جو مار پیٹ
بھیڑ کی ہوا کرتی تھی وہ نہیں ہوئی، صرف ستیہ گرہی گرفتار
کئے جا کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے گئے. اس کے بعد
مجمع خود بخود چلا گیا. میں یہ دیکھنے کے لئے کہ ان
ستیہ گرہوں کو کیا سزا ملتی ہے کچہری میں گیا. میں ابھی
وہیں تھا کہ دوسرے جتھے کے جانے کا وقت آ گیا. وہاں
خبر ملی کہ اگرچہ پولیس سڑک پر کھڑی تھی لیکن پھر بھی
جب جتھا وہاں پہنچا تو اسے روکا نہیں بلکہ نکل جانے دیا.
مجسٹریٹ نے مقدمہ میں ان کو اس وقت تک کے لئے قید کی
سزا دی جب وہ خود اپنا کام ختم کرکے اجلاس سے نہ
اٹھے. حکم سنا کر وہ فوراً اٹھ گیا. اس کے ساتھ ہی
ستیہ گرہی بھی وہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے. اس کے بعد

ایک بار اور جتھا گیا لیکن پولیس نے اسکو نہ روکا۔ دوسرے روز روکنے کے لئے پولیس آئی بھی نہیں، ستیہ‌گرہ کی وہ شکل یہیں ختم ہوگئی۔ میں نے دیکھا پرامن ستیہ‌گرہ کا اثر ایک طرف جنتا پر پڑتا ھے اور دوسری طرف گورنمنٹ کی طرف سے جتنی زیادہ مار پیٹ ہوتی ھے اتنا ھی لوگوں کا جوش بڑھتا ھے۔ اس سے مار پیٹ کا ڈر کم ھوتا جاتا ھے۔ شروع میں بھیڑ پر جب ڈنڈے چلائے جاتے تو لوگ ادھر ادھر بھاگتے لیکن آھستہ آھستہ یہ بھگدڑ بھی بند ھوگئی۔ لوگ ڈنڈے کھا لیتے لیکن اپنی جگہ سے نہ ھٹتے۔ ادھر پولیس پر بھی اثر پڑے بغیر نہ رھتا۔ میں سمجھتا ھوں جو خط میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھا اس کا اسپر اتنا اثر ھوا کہ اس نے اس بات کو منہ سے کہے بغیر ستیہ‌گرہ کی جیت مان لی اور جلوس جانے دیا۔

اس طرح کے واقعات کی خبریں چاروں طرف سے آتیں کہ جہاں جہاں نمک بنتا ھے وھاں پولیس کے لوگ پہنچتے ھیں اور نمک بنانے کے لئے جو ھانڈی اور برتن اکٹھا کئے جاتے ھیں ان کو وہ توڑ دیتے ھیں۔ کہیں کہیں مجمع کو پیٹتے بھی

ھیں لیکن بنانے والوں کو بہت کم گرفتار کرتے ھیں. نہ معلوم کیوں میں نہیں گرفتار کیا گیا. میں سبھی ضلعوں کا تیزی کے ساتھ چکر لگا رھا تھا. جب میں کسی ضلع میں پہنچتا تو وھاں ایك موٹر لیکر ایك کونے سے دوسرے تك دو دن یا زیادہ سے زیادہ تین دن میں دوڑ جاتا. راستہ میں جہاں جہاں نمك بنتا تھا، وھاں پہنچکر ان جگہوں کا بھی معائنہ کرلیتا اور ان لوگوں کو جوش دلا دیتا. اور دن بھر میں چھوٹی موٹی دس بارہ سبھائیں بھی کرلیتا. جوش اتنا تھا کہ سبھی لوگ اپنے اپنے گاؤوں میں مجھے لے جانا چاھتے تھے تاکہ میں دیکھ سکوں کہ ان کے یہاں بھی نمك بنایا جاتا ھے. سبھا میں جو نمك بنتا اسے میں کھلی جگہ پر نیلام کرتا، اس طرح تحریك کے خرچ کے لئے کچھ روپے بھی جمع کرلیتا. کیونکہ نمك کی ایك ایك پڑیا لوگ ۱۰ ۱۰ اور ۲۰ ۲۰ روپے میں لے لیتے. یہ سب ھوتے ھوئے بھی، جہاں تك مجھے یاد ھے، سارے صوبہ میں کہیں بھی جنتا کی طرف سے کوئی فساد یا بلوہ نہیں ھوا.

بیسواں باب

مہاتماجی کے عہد کو لوگ کتنی مضبوطی سے مانتے اور عزت کرتے تھے، اس کی ایک بہت روشن مثال بہپور (بھاگلپور) میں ملی. بہپور کا علاقہ گنگا کے کنارے ھے. گنگا کی دھار ادھر ادھر بدلتی رھتی ھے. جیسا کہ سبھی کناروں میں ھوا کرتا ھے. اسکی وجہ سے زمین کے نشان ھٹ جایا کرتے ھیں، اسی وجہ سے لوگ آپس میں اکثر یہ جھگڑا کرتے ھیں کہ کون زمین کس کی ھے. بہپور کے علاقہ میں ایک انگریز نے بہت سی زمین لے رکھی تھی. وھاں کے لوگوں سے زمین کے متعلق ایک بڑا جھگڑا چل رھا تھا. زمین کی حفاظت کے لئے اس نے گورکھوں کو تعینات کیا تھا. لوگوں سے یہ بات برداشت نہیں ھوئی، ایک دن سب لوگوں نے جمع ھو کر ان گورکھوں کو جو وھاں تعینات تھے مار ڈالا اور انکی لاشوں کو گنگا میں بہا دیا، یا ان کو اس طرح غائب کر دیا کہ کچھ پتہ ھی نہ چلا. اسی «بہپور» میں ستیہ گرہ چھڑ گئی.

سنہ ۱۹۲۹ع میں جب میں اس علاقہ میں دورہ کرنے گیا

اس وقت میں نے لوگوں میں بڑا جوش پایا. میں سمجھتا تھا کہ جب ستیہ گرہ چلے گی تو وهاں کے لوگ پورے جوش کے ساتھ اس میں شریك ہونگے. یہ اثر میرے دل پر ایك خاص وجہ سے ہوا تھا. جب میں اس علاقہ میں دورہ کر رہا تھا تو اس جگہ جلسہ کے لئے ایك یا دو بجے دن کا وقت دیا گیا تھا. میں وهاں سے کچھ دور دوسرے گاؤں میں چلا گیا تھا. مجھے امید تھی کہ میں وهاں سے ٹھیك وقت پر واپس آجاؤں گا. جس وقت میں واپس ہو رہا تھا تو اچانك بڑے زور کی بارش آ گئی، ہوا بھی چلنے لگی. میرے پہونچنے میں دو تین گھنٹہ کی دیر ہوگئی. جب میں وهاں بھیگتا ہوا پہونچا تو میں نے دیکھا، ایك بہت بڑا مجمع وهاں کھڑا ہے. میں نے سنا کہ وہ لوگ کئی گھنٹہ سے بارش میں میرا انتظار کر رہے ہیں. اس وقت بھی پانی برس رہا تھا. میں نے بارش ہی میں کھڑے ہو کر تقریر کی. جو کچھ کہنا تھا کہا. اسی بات سے میں نے سمجھ لیا کہ اس علاقہ میں ہمت و استقلال دونوں ہیں.

کچھ مہینوں کے بعد جب ستیہ گرہ شروع ہوئی اس وقت

وہاں بھی لوگوں نے ستیہ‌گرہ شروع کی. نمک کا قانون توڑنے کے ساتھ ساتھ شراب بندی اور نشہ والی چیزوں کے بائیکاٹ کا کام بھی ہو رہا تھا. وہاں گانجے کی ایک دوکان تھی. وہاں سے تھوڑی ھی دور پر ہم لوگوں کا آشرم اور وہاں سے تھوڑی دور پر ایک اسٹیشن اور ایک چھوٹا سا بازار اور نزدیک ھی ایک بنگلہ بھی تھا، اور وہاں سے تھوڑی ھی دور پر ایک تھانہ. والنٹیروں نے گانجے کی دوکان پر پہرہ لگایا. پولیس کو خبر لگی، اس نے آکر پہرہ والوں کو مارا پیٹا، جوش بڑھ گیا اور پہرہ زیادہ سختی سے ہونے لگا. ضلع کے افسروں کو خبر ہوئی. وہاں سے کچھ اور زیادہ پولیس کے آدمی آئے. ایک دن انہوں نے جا کر آشرم کے والنٹیروں اور کارکنوں کو وہاں سے زبردستی نکال دیا. جو کھادی اور سامان تھا اسکو لوٹا اور تتر بتر کر دیا. گانجا بیچنے والا یہ ھنگامہ دیکھ کر وہاں سے بھاگ گیا. اس طرح سے گانجے کی دوکان بند ہو گئی.

پولیس نے آشرم پر قبضہ کر کے وہاں اپنا اڈا جما لیا. ستیہ‌گرہی اب آشرم کو واپس لینے کے لئے ستیہ‌گرہ کرنے لگے. ستیہ‌گرہ کی شکل یہ ہو گئی کہ کچھ لوگ صرف جھنڈا ھی

هاتھ میں لیکر آشرم کی طرف جاتے. پولیس ان کو وهاں جانے سے روکتی. روزانه ایك جتھا جاتا. پولیس یا تو اس جتھے کی مار پیٹ کرتی یا سبکو گرفتار کر لیتی. جب گاؤں میں خبر پہنچی تو ستیه گره کے وقت پر مجمع وهاں بھی جمع هو جاتا. جب یه بھیڑ بڑھنے لگی تو پولیس لاٹھیوں سے مار مار کر بھیڑ کو منتشر کر دیتی. کبھی کبھی ستیه گرهیوں کو بھی پیٹتی. اور کبھی انھیں گرفتار کر کے آشرم میں هی رکھ دیتی. پھر جب بھیڑ چلی جاتی تو انھیں نکال کر تھانے یا جیل خانے بھیج دیتی. یه سلسله چلتا رها. بھیڑ روزانه بڑھتی رهی، یہاں تك که بیس بیس پچیس پچیس هزار آدمی دور دور سے آتے اور لاٹھیاں کھا کر چلے جاتے. پولیس کی تعداد کچھ زیاده نه تھی. جیسے زبردست لڑاکا لاٹھی چلانے والے اس علاقه کے لوگ هوتے هیں. ویسے لوگ اگر چاهتے تو باتوں هی باتوں میں پولیس والوں کا صفایا کر دیتے. لیکن کسی نے کبھی اپنی زبان سے بھی ان کو چوٹ نہیں دی، لاٹھی چلانے کی تو بات کیا تھی.

میں ایك روز وهاں گیا. وه مقام گنگا کے اتر بھاگلپور سے تھوڑی هی دور پر هے. بہپور اسٹیشن ایك برانچ لائن گنگا کے

کنارے تک جاتی ہے، جہاں سے اسٹیمر (جہاز) پر گنگا پار کر کے آدمی بھاگلپور پہنچ جاتا ہے. میں بھاگلپور ہی وہاں سے گیا، اس لئے بھاگلپور کے بھی کچھ لوگ ایسے ساتھ ہو گئے تھے جو ستیہ گرہ میں شریک ہونے والے تو نہ تھے، وہاں کا حال سنکر متاثر بہت ہوئے تھے. پٹنہ سے بھی کچھ لوگ ساتھ گئے تھے.

وہاں ہم لوگوں کے جانے کی خبر پہلے ہی پہنچ گئی تھی، اس لئے وہاں اس روز بھیڑ اور زیادہ ہو گئی تھی. پولیس سپرنٹنڈنٹ سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا. وقت پر ستیہ گرہیوں کا ایک چھوٹا سا جتھا نکلا، اس وقت سڑک کے دونوں طرف مجمع کھڑا تھا. کچھ دور ایک جلسہ ہوا جہاں میں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی. پولیس وہاں بھی موجود تھی مگر جلسہ میں کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوئی. جب ستیہ گرہی آشرم کے پھاٹک کے پاس پہنچے تو وہ گرفتار کر کے آشرم کے اندر ہی لے جائے گئے. ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ آج اور کوئی خاص بات نہیں ہوگی، لیکن فوراً ہی پولیس سپرنٹنڈنٹ پندرہ لاٹھی والے سپاہیوں کے ساتھ نکلا اور اس نے حکم دیا

که «مارو». پولیس والے بے دھڑک مجمع پر لاٹھیاں چلانے لگے. کیونکہ مجمع سڑک کے دونوں طرف بہت دور تک پھیلا ہوا تھا. وہ لوگ دونوں طرف لاٹھیاں برساتے ہوئے آگے بڑھتے گئے. مجمع میں سے کسی نے نہ ہاتھ اٹھایا نہ بھگدڑی مچی. ہم لوگ کچھ دور تھے. کئی جگہوں پر آدمی پھیلے ہوئے تھے. سپرنٹنڈنٹ سپاہیوں کیساتھ پیٹتا پٹواتا وہاں بھی پہنچا جہاں میں کھڑا تھا. لاٹھیاں تو بے دھڑک چل ھی رہی تھیں، مجھ پر بھی لاٹھیاں پڑیں اور کچھ چوٹ بھی آئی. لیکن ایک دوسرے والنٹیر نے میرے اوپر لاٹھیوں کو نہ آنے دیا اور مجھ کو ڈھك لیا، اس لئے زیادہ چوٹ اسی کے آئی. پروفیسر عبد الباری تھوڑی ھی دور پر تھے. ان کو زیادہ چوٹ آئی، وہ چوٹ کھا کر گر پڑے اور ان کے خون بہنے لگا. یہ سارا معاملہ تھوڑی ھی دیر میں ختم ہوگیا. سپرنٹنڈنٹ اور سپاھی سارے مجمع میں لوگوں پر لاٹھیاں برساتے ایك طرف سے نکلے اور پھر آشرم میں چلے گئے.

میں نے سمجھ لیا کہ آج کا کام ختم ہو گیا. کیونکہ ایسا ھی روزانہ ھوا کرتا تھا. لوگ اپنی اپنی جگہوں کو روانہ ھو گئے.

ہم لوگ جو بھاگلپور سے آئے تھے وہیں ٹھہرے رہے. ایک ڈاکٹر وہاں رہتے تھے. بھیڑ کے ہٹ جانے کے بعد وہ ہم لوگوں میں سے زخمیون کی مرہم پٹی کرنے لگے. ہم لوگ گھاس پر بیٹھے تھے اور گھاؤ دھوئے جا رہے تھے کہ اتنے میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر کچھ سپاہیوں کے ساتھ اسطرف آئے. ہم نے سمجھا شاید پھر ایک بار حملہ ہوگا. لیکن وہ لوگ کچھ دور پر هی ٹھہر گئے. پھر ہم لوگوں میں سے ایک آدمی گرفتار کر کے لے گئے. ہم لوگ گاڑی کا انتظار کر رہے تھے. اسی وقت کچھ لوگ جو ابھی گئے نہیں تھے ہمارے پاس آئے. وہ گاؤں کے رهنے والے تھے اور بہت هی دکھی تھے. وہ مجھے گھیر کر بیٹھ گئے، بہت هی پیچ و تاب میں کہنے لگے ،یہاں ہم لوگوں میں آپ اور دوسرے نیتا اس طرح ہم لوگوں کے جیتے جی ہماری آنکھوں کے سامنے پیٹے گئے اور ہم لوگ کچھ نہ کر سکے. اتنی پولیس کی کیال مجال تھی کہ ہم لوگوں پر هاتھ اٹھاتی، آپ لوگوں کی تو بات هی الگ هے. لیکن ہم کیا کریں گاندھی جی نے ہم لوگوں کے هاتھوں کو باندھ دیا هے اسلئے ہم کچھ نہیں کرسکتے، نہیں تو اتنی پولیس

کو پیس کر ہم چٹنی کر دیتے، چاھے اسکا نتیجہ کچھ ہوتا۔»
یہ کہکر سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے. میں نے ان کو بہت سمجھایا اور کہا، آپ لوگوں کی بہادری تو شانتی رکھنے ھی میں ھے، اسی سے آخر میں ھماری جیت ہوگی.

ہم لوگ جس گاڑی سے روانہ ہوئے اس سے کچھ پولیس کے سپاھی بھی بھاگلپور چلے، اسکا مطلب اسوقت ہم نہ سمجھے. دوسرے دن صبح ہم گنگا اشنان کرنے گئے. وھاں پولیس کے کچھ ھندو سپاھی بھی اشنان کرنے آئے تھے. انہوں نے پہلے دن کا حال سناتے ہوئے ہم سے کہا کہ «سپاھیوں میں دو پارٹیاں ھو گئی تھیں، جب سپرنٹنڈنٹ نے سب لوگوں پر لاٹھی چلانے کا حکم دیا اور خاص کر آپ جیسے لوگوں پر، تو ہم لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی. اسلئے ہم میں سے کچھ نے صرف لاٹھی گھمائی اور ایسا دکھایا کہ ہم لاٹھیاں چلا رھے ھیں، لیکن کسی کو ہم لوگوں کی لاٹھیاں نہ لگیں. البتہ کچھ سپاھی ایسے تھے جنہوں نے خوب پیٹا. آپ لوگوں کے جب لاٹھی لگی اور عبد الباری صاحب بہت چوٹ کھا کر بیہوش ہو گئے اور گر پڑے، اس وقت ہم لوگوں سے یہ بات برداشت

نہ ہو سکی. ہم لوگوں نے ان سپاہیوں سے کہہ دیا کہ اگر تم لوگوں نے اسکے بعد لاٹھیاں چلائیں تو ٹھیک نہ ہوگا. لیکن وہ بھلا کیوں مانتے؟ انہوں نے پھر گرے ہوئے باری صاحب پر لاٹھیاں چلا ہی دیں. اس وقت ہم لوگوں نے اس لاٹھی کو اوپر ہی اوپر لاٹھی پر لے لیا اور ان سپاہیوں کو اپنی لاٹھی سے مارا. سپرنٹنڈنٹ تو آگے آگے چلتا تھا اور ہم لوگ اسکے پیچھے پیچھے اسی طرح لاٹھیاں چلاتے ہوئے چلے جا رہے تھے. اسلئے وہ خود تو نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کس کے لاٹھی لگی اور کس کو مارا گیا. ہم لوگوں نے اس طرح باری صاحب کی جان بچالی اور ان سپاہیوں کو بھی پیٹا، اس وجہ سے ہم لوگوں کو ڈر ہوگیا تھا کہ وہ سپاہی ہم لوگوں کے خلاف شکایت کریں گے. چنانچہ مار پیٹ ختم ہوتے ہی ہم نے پہلے ہی صاحب سے نالش کردی کہ ان سپاہیوں کو لاٹھی چلانی نہیں آتی، یہ لوگ اس طرح لاٹھی چلاتے ہیں کہ مجمع کو چھوڑ کر آپس ہی میں چوٹ کھا جاتے ہیں. اس پر ان سپاہیوں نے بھی کہا کہ یہ سب غلط بات ہے. ان لوگوں نے ہم کو ہی مارا ہے، ہم کو لاٹھیاں چلانے سے بھی

روکا اور خود تو انہوں نے کچھ کیا ھی نہیں. صاحب نے یہ سنکر اور تو کچھ نہیں کیا، البتہ ہم لوگوں کو رات ھی بھاگلپور واپس کر دیا. ہم لوگ اسی گاڑی سے آئے ھیں جس سے آپ لوگ رات کو آئے.»

ہم نے دیکھا کہ پولیس کے سپاهیوں کو بھی ستیہ گرھیوں کے ساتھ ھمدردی ھے. وہ جہاں تك سختی کرنے میں اپنے کو مجبور سمجھتے تھے وھیں تك سختی کرتے تھے اور نوکری چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھے، لیکن ستیہ گرھیوں کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کرنا چاھتے تھے. یہ بات افسروں میں نہیں تھی، اگرچہ ان میں بھی کچھ اچھے تھے. اس قسم کا مجھے وھیں ایك اور سکھ دینے والا تجربہ ھوا.

میں نے اوپر ذکر کیا ھے کہ ہم لوگ بیٹھ کر مرھم پٹی کرا رھے تھے تو ایك پولیس کے انسپکٹر بھی سپرنٹنڈنٹ اور سپاهیوں کیساتھ آئے تھے اور ہم لوگوں میں سے ایك کو گرفتار کر کے لے گئے تھے. میں نے اس وقت تك ان کو پہچانا نہیں تھا، بعد میں پوچھنے پر ان کا نام معلوم ھوا. مجھے یاد آگیا کہ میرے اسکول میں اسی نام کے ایك میرے

ہم سبق بھی تھے جو پولیس میں کام کرتے ھیں. میں نے بھاگلپور سے بہپور ایک آدمی کو اسلئے بھیجا کہ وہ جا کر اس کھادی، سوت وغیرہ کو جس کو پولیس نے لے لیا ھے واپس لے آئے، کیونکہ چرخہ سنگھ کے خلاف کوئی حکم نہیں تھا. وہ جاکر ان سے ملا. باتیں کرتے کرتے اس نے یہ ذکر بھی چھیڑ دیا کہ میں نے بات چیت میں یہ کہا تھا کہ اسی کے نام کے ایک آدمی اسکول میں میرے ساتھی تھے جو پولیس میں ھیں. لیکن آپ کو کل شام کے وقت وھاں پہچان نہ سکے. یہ سنتے ھی پولیس انسپکٹر گھبرا گیا اور اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے. اس نے بات بدلنی چاھی اور کہا کہ «آپ یہ سب باتیں نہ کہئے. کھادی کی بات چیت کیجئے» لیکن چرخہ سنگھ کا وہ آدمی بہت ھی ھوشیار بولنے والا تھا. اس نے پھر کھادی کی بات چیت کر کے میرا نام لے لیا. اس وقت اس نے دیکھا کہ انسپکٹر پھر بیچین ھو گیا.

یہ باتیں اسنے آکر مجھ سے کہیں. میں سمجھ گیا کہ نوکری کی وجہ سے بہت سے لوگ دیکھنے میں ھمارے مخالف معلوم ھوتے ھیں لیکن انمیں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں ستیہ گرھیوں

کے بارے میں اعتقاد اور محبت ہے. ہم نے دیکھا کہ مہاتماجی کی اہنسا کس طرح مخالفوں کے دلوں میں اثر کرتی ہے.

وہاں کے مجسٹریٹ ضلع ایك ہندوستانی مہربان تھے. انکے بڑے بھائی عدم تعاون میں ہم لوگوں کیساتھ بہت کام کر چکے تھے اور وہ جیل بھی گئے تھے. وہاں وہ بہت سخت بیمار پڑے. جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو گورنمنٹ نے انہیں چھوڑ دیا. لیکن جیل سے نکلتے ہی ان کا انتقال ہو گیا، اسلئے ان کے سارے کنبہ کیساتھ میرا بہت گہرا تعلق ہو گیا تھا. مجسٹریٹ ضلع تو نوکری میں تھے، ان سے کوئی ملاقات نہیں تھی. جب میں بہپور سے بھاگلپور لوٹا تو انہوں نے ایك دوست کے ذریعہ میرے پاس پیغام بھیجا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بہت مشتاق ہیں، لیکن نوکری کیوجہ سے ان کی جو حالت ہے اسمیں علانیہ ملنا مناسب نہیں ہے. اگر اس دوست کیساتھ ان کے گھر آ جاؤں تو وہ بہت ممنون ہوں گے. میں سن چکا تھا، اگرچہ وہ ضلع مجسٹریٹ تھے لیکن پھر بھی ان کی کچھ چلتی نہیں تھی. بھاگلپور ڈویژن کا کمشنر بھاگلپور ہی میں رہا کرتا تھا. وہ اور سپرٹنڈنٹ پولیس

مل کر ستیہ گرہ کے سیلاب کو روك رہے تھے.

میں اس دوست کے ساتھ رات کو مجسٹریٹ کے گھر گیا. جوں ھی میں وھاں پہونچا وہ میرا پیر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ "آپ میرے بڑے بھائی کے مانند ھیں، کیونکہ آپ ان کے ساتھی ھیں، آپ دونوں کا گہرا دوستانہ تھا. میں جانتا ھوں یہاں میں مجسٹریٹ ضلع ھوں اور اس لئے یہ سمجھا جاتا ھے کہ یہاں جو کچھ ھوا ھے میرے ھی حکم سے ھوا. میرے مجسٹریٹ رہتے ھوئے یہاں آپ اور دوسرے نیتا اسطرح لاٹھیوں سے پیٹے گئے. لیکن یہ سب میرے حکم کے خلاف ھوا اس میں میرا کوئی ھاتھ نہیں ھے".

میں انکو کچھ اطمینان دلا کر واپس چلا آیا.

بھاگلپور کپڑے کے بیوپار کا بہت بڑا مرکز ھے. ان دنوں بہار بھر میں بدیشی کپڑے کی سب سے بڑی منڈی وھیں تھی. بہپور کے مندرجہ بالا واقعہ کا ایك نتیجہ یہ ھوا کہ سارے شہر اور بیوپاریوں میں بہت جوش پھیل گیا. ایك دو دن کے اندر ھی سب نے بدیشی کپڑے کی فروخت بند کر دینے کا وعدہ کیا. چنانچہ جو کپڑا ان کے پاس تھا

انہوں نے سبکو بند کر کے کانگریس کی مہر لگوادی اور کہا بھی کہ جب تک کانگریس کا پھر حکم نہ ہوگا ہم یہ کپڑے نہ بیچیں گے. وہاں بھی کچھ عورتیں تیار ہوئی تھیں اور انہوں نے کہا کہ ہم بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر پہرہ دینگے. لیکن اسکی زیادہ ضرورت پیش نہیں آئی، ساری گانٹھیں مذکورہ بالا واقعہ کی وجہ سے فوراً بندھ گئیں اور اسپر مہریں لگ گئیں. بھپور کے لوگوں کا جوش عارضی نہیں تھا. چنانچہ جب تک ستیہ گرہ جاری رہی اور گاندھی - ارون سمجھوتہ کے مطابق ستیہ گرہ بند نہ ہوئی اسوقت تک ستیہ گرہیوں کا جتھا روزانہ جاتا ہی رہا. کچھ دنوں کے بعد پولیس نے مجمع پر لاٹھی چلانی بند کردی، اسلئے مجمع بھی کم ہوتا گیا. لیکن جو ستیہ گرہی جاتے ان کے ساتھ بہت سختی ہوتی. مار پیٹ کے علاوہ ان کو طرح طرحکی تکلیفیں دی جاتیں. ایک لڑکے کے کان میں سائکل کا پمپ لگا کر اتنے زور سے ہوا دی گئی. کہ اسکے کان کا پردہ پھٹ گیا، چنانچہ وہ آجتک اس کا نتیجہ بھگت رہا ہے. لیکن لوگ اور ستیہ گرہی برابر نڈر ہوکر اپنا کام کرتے ہی رہے.

اکیسواں باب

ستیہ گرہ شروع ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر چکے. لیکن ابھی تک نہ تو میں گرفتار ہوا اور نہ پنڈت موتی لال نہرو گرفتار ہوئے. اگرچہ ہم دونوں ھی ستیہ گرہ کا کام بہت زوروں سے چلا رہے تھے. پنڈت جی الہ آباد میں بیٹھکر سارے ملک کی دیکھ بھال کر رہے تھے. ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک بھی کبھی کبھی ہوا کرتی اور میں وھاں جایا کرتا. لیکن زیادہ وقت اپنے صوبہ کے ضلعوں ھی میں دورہ کرنے میں لگاتا تھا. تعجب ہوتا تھا کہ میں کیوں نہیں گرفتار کیا جاتا! کچھ دنوں تک تو صوبہ کی حکومت کا حکم تھا کہ میں گرفتار نہ کیا جاؤں. اسلئے ضلع کے حاکم مجھے گرفتار نہیں کرتے تھے. میں اکیلا چکر لگایا کرتا تھا. کچھ دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ جو ممانعت میری گرفتاری کے بارے میں ہوئی تھی، وہ اٹھا لی گئی، اگر مجسٹریٹ ضلع چاھے تو مجھے گرفتار کر سکتا ھے. گرفتاری کے حکموں کی خبر مجھے پولیس افسر ھی دیا کرتے تھے. جس نے ممانعت اٹھا دینے کی خبر

دی اس نے یہ بھی کہا کہ میں اکیلا سفر نہ کیا کروں، ایک آدمی ضرور ساتھ رکھا کروں، تا کہ گرفتار ہونے پر وہ سبکو خبر دے سکے. میں لاپروائی سے اپنا کام کرتا ھی گیا. اس کے بعد خبر ملی کہ صوبائی حکومت کا حکم ضلع مجسٹریٹ کو پہونچگیا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں. یہ خبر تو ملی مگر میں کئی ضلعونمیں پھر کر آ گیا. کہیں گرفتاری نہیں ہوئی. میں نے اس کا یہ سبب سنا کہ حکام ضلع سمجھتے تھے کہ میری گرفتاری سے بہت ھنگامہ ہو جائیگا، اور یہ بلا کوئی مجسٹریٹ ضلع اپنے سر لینا نہیں چاھتا تھا، اور ایسا کرنے کا ان کو پورا موقع بھی نہیں ملتا تھا. کیونکہ میں اتنی تیزی سے ایک ضلع سے دوسرے ضلع نکل جاتا کہ وہ سوچتے ھی رھتے اور میں دوسرے ضلع میں چلا جاتا.

آخر میں میں اپنے ھی ضلع «سارن» جہاں کا میں رھنے والا تھا، پہونچا. وھاں سخت حکم گیا کہ مجھے ضرور پکڑ لیا جائے. کیونکہ اسی ضلع کا رھنے والا ھوں، اسلئے یہ اسی ضلع کے مجسٹریٹ کی خاص ذمہ داری ھے. وھاں کی پولیس تو اس تاک میں تھی لیکن دو دن تک مجھے پکڑ نہ سکی.

میں کچھ چھپکر نہیں جاتا تھا، اور نہ کہیں اپنے بچانیکی تدبیر کرتا تھا. لیکن میرا کوئی پروگرام مقرر نہیں ہوتا تھا اور نہ یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ میں کہاں جاؤنگا. دو دن کے سفر کے بعد مجھے «چھپرا» میں رات کو ٹہرنا تھا. وہاں میرے بھائی صاحب کیساتھ گھر کے سب لوگ رہتے تھے. راتکو تقریباً دس گیارہ بجے تک پولیس والے میرا انتظار کرتے رہے. لیکن جب میں نہیں ملا، تو وہ سمجھے کہ میں کسی دوسری جگہ چلا گیا. اس کا پتہ لگانے کیلئے وہ اور دوسری جگہوں پر گئے. کئی گاؤنمیں پھرتے پھرتے مجھے دیر ہو گئی تھی، اس وجہ سے میں رات کے گیارہ بجے کے بعد پہونچا. دوسرے دن مجھے جدھر جانا تھا، ادھر ھی پولیس والے جاکر میرا انتظار کرنے لگے. میں رات بھر چھپرا میں رہ کر سویرے جہاں مجھے جانا تھا، وہاں کیلئے روانہ ہو گیا. ابھی شہر کے اندر ھی تھا کہ راستہ میں پولیس والے مل گئے اور میں گرفتار ہو گیا. انہوں نے اتنا اخلاق کیا کہ مجھے میرے گھر پر لیگئے، وہاں سب سے ملا کر انہوں نے مجھے «چھپرا». جیل میں پہونچا دیا.

یہ میرا جیل جانے کا پہلا ہی تجربہ تھا۔ جب میری گرفتاری کی خبر شہر میں پھیلی تو لوگوں نے ایک جلوس نکال کر، شہر میں مظاہرہ کیا۔ جیل میں اس وقت تین چار سو ستیہ گرہی تھے۔ جیسے ہی میں جیل کے پھاٹک کے اندر پہونچایا گیا، ستیہ گرہیوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ وہ وہاں شور و غل مچانے لگے اور نعرہ لگاتے ہوئے جیل کے پھاٹک کے نزدیک آگئے۔ میں وہیں جیلر کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ شہر کا جلوس بھی جیل کے نزدیک چلا آیا۔ جیل کے اندر سے لوگ نعرہ لگاتے تھے، اور چاہتے تھے کہ جیلر ان کو جلد موقع دے تاکہ وہ میرا استقبال کریں، لیکن ادھر باہر کی بھیڑ اور اندر کے شور و غل سے گھبرا کر جیلر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ بندوقوں سے جھوٹا فائر کرو۔ باہر کا جلوس جیل کے احاطہ کے باہر کی سڑک پر جا رہا تھا۔ جیلر نے اپنی گھبراہٹ میں وہ حکم دیدیا تھا۔ جب اندر کے لوگوں نے بندوق کی آواز سنی تو وہ سمجھے کہ باہر کے لوگوں پر گولی چل گئی۔ وہ اب اس پر اور بھی طیش میں آگئے۔ میں نے جیلر سے کہا مجھے ایک بار اندر جانے دو تو سکون

ہو جائیگا. لیکن جب تک باہر شور و غل تھا، وہ پھاٹک کھولنے سے ڈرتا تھا. آخر میں جب اس نے دیکھا کہ بغیر اس کے کام نہیں چلےگا، تو اس نے مجھے کھڑکی سے کچھ کہنے کا موقع دیا. نتیجہ یہ ہوا کہ سب چپ ہو گئے.

گرفتاری کے وقت میرے بھائی صاحب چھپرہ میں نہیں تھے میرا مقدمہ دھلی میں ہوا اسی وقت وہ آئے اور ان سے ملاقات ہوئی. چھ ماہ کی سزا سنائی گئی. کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دو بار، ایک بار چھپرہ میں اور ایکبار پٹنہ میں، مجھے سزا دینے والے مجسٹریٹ پرانے ملاقاتی ھی نکلے، جو وکالت کے زمانہ میں میرے موکل رہ چکے تھے، اور ان کے مقدمہ کی پیروی میں نے ھائیکورٹ میں کی تھی. سزا تو انہوں نے ضرور دی لیکن میری طرف سر اٹھاکر مجھسے کبھی نہ دیکھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایک پنجابی مسلمان تھے.

ہزاری باغ جیل میں دوسرے بہت سے ستیہ گرھی رکھے گئے تھے. بہت ھی خفیہ طور سے میں بھی وھیں بھیجا گیا تاکہ راستہ میں کہیں گڑبڑ نہ ہونے پائے. چھپرا سے ہزاری باغ سیدھے راستے سے جانے میں پٹنہ اور گیا دو بڑے شہر

پڑتے تھے۔ گنگا پار کرنیکے لئے سون پور جیسے بڑے اسٹیشن پر گاڑی بدلنا پڑتی۔ اسٹیمر سے گنگا پار کرنی پڑتی۔ ان سب جگہوں پر مظاہرہ کا کافی موقع تھا۔ اس وجہ سے چپ چاپ بہت چکر دیکر بنارس کے راستہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل موٹر کا سفر کرا کے کسی طرح مجھے هزاری باغ پہونچایا گیا۔ جب تک میں وہاں جیل میں داخل نہ ہو گیا۔ کسی کو پتہ نہ لگا کہ میں کہاں بھیجا گیا ہوں اور کس راستے سے؟ چھپرہ جیل کے افسروں کو بھی اسکا پتہ نہ تھا۔ کیونکہ مجسٹریٹ کے ملنے کے بہانے سے جیل کے پھاٹک پر بلایا گیا۔ جہاں دسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنی موٹر لیکر تیار تھا۔ وہاں میں جس حالت میں پہونچا اسی حالت میں بغیر سامان لئے ہوئے وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔ جب گاڑی شہر سے باہر نکل گئی اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ میں کہاں اور کس راستے سے هزاری باغ جیل لیجایا جا رہوں۔ جیل کے اندر خبر ہوتے ہی کہ میں کہیں دور لیجایا گیا، لوگوں نے شور مچانا شروع کیا۔ دو منزلوں سے انہوں نے چلا چلا کر سڑک پر چلنے والوں کو سنایا کہ میں نمعلوم کہاں اور کس نا معلوم مقام

پر لیجایا گیا ہوں. میرے بھائی سمجھ گئے کہ ہزاری باغ ہی سبلوگ لیجائے جاتے ہیں. اس لئے مجھسے وہیں لیگئے ہونگے. اسی وجہ سے وہ موٹر سے "سون پور" اسٹیشن گئے کہ کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائیگی. لیکن میں اس راستہ سے ہی نہیں گیا تھا.

ہزاری باغ پہونچ جانے کے بعد دسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھائی صاحب کو اطلاع دی. اسنے مجھ سے موٹر ہی میں بہت معافی مانگ کر کہا کہ "نوکری میں بہت سے ایسے کام کرنا ہی پڑتے ہیں. نوکری چھوڑ نہیں سکتا. اسلئے سب کام کرنا پڑتے ہیں. لیکن ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ آپ کو یہاں سے وہاں تک کوئی تکلیف نہ ہوگی". یہی ہوا. مجھسے تکلیف نہیں ہوئی. جو پولیس افسر ساتھ گئے تھے وہ سبھی اچھا برتاؤ کرتے رہے. میں موٹر میں جا رہا تھا اور راستہ ضلع گیا کے شہر اورنگ آباد سے ہو کر تھا. موٹر ڈرائیور کو حکم تھا کہ شہر میں بڑی تیزی سے نکل جانا، جسمیں کوئی پہنچان نہ سکے. جو پولیس کا افسر ساتھ تھا اس نے کہا کہ "نزدیک ہی انوگرہ بابو کا گھر ہے، وہ بیمار ہیں، اگر آپ ملنا چاہتے ہیں تو میں

ان کے گھر چل کر ملاقات ضرور کرا دیتا۔ لیکن شاید اس گاڑی کے پیچھے پیچھے سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی اپنی موٹر سے آرہا ھے اسلئے میں وہاں لیجانے سے ڈرتا ھوں»۔ میں نے کہا «انوگرہ بابو کا گھر میں بھی جانتا ھوں اور یہ بھی معلوم ھے کہ وہ بیمار ھیں، لیکن آپ قاعدہ کے خلاف کچھ نہ کریں، مجھے ملنا نہیں ھے»۔

بائیسواں باب

مجھے افسوس ھے که آهسته آهسته جیل کے بہت سے افسروں کا رخ بدل گیا. کچھ تو شروع ھی سے دوسرے خیال کے تھے. لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ستیه گرھیوں کو پہلے بڑے عقیدے کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ بھی ایک طرح سے اب لا پرواہ سے ھو گئے. جس کا سبب کچھ تو ستیه گرھیوں کی غلطیاں تھیں. مہاتماجی نے بار بار جتایا تھا که قانون توڑ نے کا اسکو ھی اختیار ھو سکتا ھے جو قانون کی پابندی اچھی طرح کر سکتا ھے. اس کا مطلب یه ھے که جو شخص یونہیں قانون توڑا کرتا ھے وہ ستیه گرہ کے جذبه سے قانون نہیں توڑ سکتا، کیونکه وہ تو معمولی طور سے بھی توڑا کرتا ھے. ستیه گرہ کا جذبه نه تو اس کے دل میں ھوگا اور نه دوسروں پر اس کا اثر ھوگا. اسلئے انہوں نے بتایا تھا که جیل کے اندر سبھی قاعدوں کی پابندی کرنی چاھئے، بجز ایسے قاعدوں کے جن سے خودداری کو ٹھیس لگتی ھے. اس طرح کا ایک قانون تھا جس کے متعلق سنه ۱۹۲۱ع سے ھی

کانگریسی لوگ لڑتے چلے آئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ع میں بھی وہ خواہ جیل کی کتابو نمیں کیوں نہ ھو ستیہ گرھیوں کیساتھ وہ وہ نہیں برتا جاتاتھا۔ وہ قانون یہ تھا کہ جب کوئی بڑا افسر آتا تھا اسوقت سب قیدیوں کو قطار میں کھڑا ھونا پڑتا تھا۔ اسکے بعد ایك سپاھی کے «سرکار سلام» کہنے پر سبکو اپنا ایك ھاتھ پورا پنجہ کھول کر دکھانا پڑتا تھا، اور دوسرے ھاتھ سے ھونٹ کھول کر دانت دکھانے پڑتے تھے۔ اسمیں ایك تو برٹش گورنمنٹ کے وجود کو سلامی دینی پڑتی تھی اور دوسرے ایك غریب آدمی کی طرح دانت کھولنے پڑتے تھے۔ اسطرح کے قانون بننے کا سبب کچھ ھو، یہ بات بہت بری اور بے عزتی کی معلوم ھوتی تھی، اسلئے اسکی عملی شکل میں سنہ ۱۹۲۱ع ھی سے مخالفت شروع ھو گئی تھی۔ اسکو نہ ماننے کی وجہ سے ستیہ گرھیوں کو بہت قسم کی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ آخر میں ایسا ھو گیا کہ جب تك جیل کے افسر ستیہ گرھی قیدیوں سے جھگڑا کرنے کا ارادہ نہیں کرتے تھے «سرکار سلام» نہیں کہتے۔ گویا ایسا کہنے ھی سے طیش پیدا ھو جاتا تھا۔ دوسرے قانون بھی جو کچھ بے عزتی کے حامل

ہوتے تھے، کچھ ایسے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ ستیہ گرھیوں کو بہت سی جیلوں ھی سے چھٹکارا مل گیا. جہاں نہیں ملا تھا وھاں کچھ نہ کچھ جھگڑا ضرور ہو جاتا تھا. لیکن ستیہ گرھی صرف ایسے ھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے. جنکی خلاف ورزی کرنی مہاتماجی نے جائز قرار دی تھی. بلکہ وہ دوسرے قانونوں کی بھی مخالفت کیا کرتے تھے، جن سے اپنا کردار یا کیکٹر کمتر ہوتا جاتا رھا. ایک معمولی قانون چٹھیوں، اخباروں، یا کتابوں کے منگانے کے متعلق تھا. اس قانون کے خلاف ہم میں سے اکثر لوگ یہ چیزیں کسی نہ کسی طرح سے منگاتے تھے، اور وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طرح گھر چٹھیاں بھیج دیتے. یہ کام ایسے تھے جو غیر مناسب تھے. جیل کے افسران اور سپاھی بھی ستیہ گرھیوں کی اسمیں مدد کیا کرتے. کیونکہ ان میں جو اچھے تھے وہ یہ مانتے تھے کہ ایسا کرنے سے ہم ایک قسم کی خدمت ھی کر رھے ھیں. اور جو برے تھے وہ شاید ان کمزوریوں کی خبر دوسرے افسروں تک پہونچا دیتے تھے. اس کا ایک نتیجہ تو یہ دیکھنے میں آیا کہ کچھ تو ان چھوٹی موٹی مہربانیوں کیلئے

افسروں کی خوشامد بھی کرتے. اگر کسی ستیہ گرھی کے ساتھ افسروں کا بہت زیادہ ربط ضبط ہو گیا تو اسکی وجہ سے ستیہ گرھیوں میں آپس میں اختلاف ہو جاتا. جو ہوشیار افسر تھے، اسطرح کتنی بھی خدمت کیوں نہ کردیں، ایسے خدمت چاھنے والے ستیہ گرھیوں کے بارےمیں وہ عزت نہیں رہ جاتی تھی. اس طرح سے بہت سے لوگوں کے بارے میں انکا عقیدہ جو شروع میں ہوا تھا، کم ہو جاتا.

ہماری کمزوری دوسری طرح سے بھی ظاہر ہوتی. جیل کے افسروں کیساتھ کھانے پینے کی چیزوں کیلئے بھی کبھی جھگڑا ہوجاتا. مگر اس سے زیادہ بری بات یہ تھی کہ آپس میں بھی اس معمولی بات کیلئے کبھی کبھی جھگڑے ہوجاتے. اسی سال جیلوں میں ایک نیا قانون جاری ہوا، جس کے مطابق قیدی تین حصونمیں بانٹ دئے گئے. جو سب سے اونچے یعنی اے "A" درجہ کے تھے، ان کیلئے کھانے پینے، ملاقات، اور چھٹیوں کی زیادہ آسانی تھی، انکو اپنے کپڑے پہننے کا حق تھا، کام کرنے سے بری تھے. جو دوسرے یعنی بی "B" کلاس کے تھے، ان کو کھانے پینے کی تو وھی آسانی

تھی جو اے کلاس والوں کو تھی، لیکن چٹھیوں اور ملاقاتوں کی آسانی اے کلاس کے مقابلہ میں کم تھی، جیل کے کپڑے پہننے پڑتے. اور جنکو سخت سزا ملتی وہ کام کیلئے بھی مجبور تھے. تیسرے درجہ سی "C" کلاس کیلئے پہلے دو درجوں کے مقابلہ میں کھانے پینے کی اور دوسری سب آسانیاں بہت کم تھیں. یہ تقسیم کسی اصول کی بنیاد پر نہیں کی گئی تھی، بلکہ قیدی کے جیل جانے سے پہلے اس کے رہن سہن اور اسکی عزت وحیثیت کی بنیاد پر کی گئی تھی، جس میں سیاسی قیدی اور دوسرے قیدیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا. ایسے قیدی بھی جو فریب، جعلسازی اور چوری تک کی سزا پائے ہوئے تھے، لیکن جنکو بی "B" کلاس مل گیا تھا، ان سبھی آسانیوں کو حاصل کئے ہوئے تھے جو بی کلاس کے سیاسی قیدیوں کو ملی ہوئی تھیں.

مہاتما جی نے کہا کہ سیاسی قیدیوں کی الگ تقسیم کی جانی مناسب نہیں ھے. کیونکہ جب ہم جیل خانے جاتے ھیں تو ہمکو اور قیدیوں کی طرح سے ھی اپنے تئیں سمجھنا چاھئے. اور جو دوسرے قیدی سکھ اور دکھ برداشت کرتے ھیں

وھی ھمکو بھی برداشت کرنا چاھئے. اسلئے کہ جو دوسرے قیدی ھونگے، ان کے ساتھ ھماری ھمدردی ھوگی اور ان کی ھمدردی ھمارے ساتھ. یہ ممکن ھے کہ جیل کے افسروں کا جو برتاؤ معمولی قیدیوں کیساتھ بہت سخت ھوا کرتا ھے، وہ ھم لوگوں کی وجہ سے کچھ بدل جائے. اور جو آسانیاں ھملوگوں کو ملیں، وھی معمولی قیدیوں کو بھی ملنے لگیں. اگر ھمارا کردار ٹھیك رھا تو کچھ اچھا اثر معمولی قیدیوں پر بھی پڑ سکتا ھے. مہاتماجی کو امید تھی کہ اس طرح جیل کے اندر بھی ھم اپنے اچھے اصول اور پاکیزہ چال چلن سے معمولی قیدیوں کی کچھ خدمت کر سکیں گے. ممکن ھے کہ جیل میں ھماری وجہ سے بہت کچھ اصلاح ھو جائے. اسطرح سے ھم لوگوں پر بھی اچھا ھی اثر پڑے گا، کیونکہ ھم اپنے تئیں عوام میں ھی سمجھتے رھیں گے. ملك کی خدمت کا گھمنڈ ھم پر برا اثر نہیں کریگا، اور جیل کے افسروں پر اسکا اچھا اثر پڑے گا.

لیکن یہ باتیں ھمارے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں. ان میں تو ھمیشہ ایك ھی بات کا چرچا رھا، کہ سیاسی قیدی

دوسرے معمولی قیدیوں سے الگ سمجھے جائیں اور ان کی تقسیم الگ کی جائے. اسوقت برٹش گورنمنٹ نے اسکو اصولی طور پر نہیں مانا، لیکن برتاؤ میں سیاسی قیدی الگ سمجھے جانے لگے. اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جیل کے افسر ڈرتے تھے کہ ستیہ گرھی معمولی قیدیوں کو بھی بگاڑ دیں گے، جیلونمیں ان سے بھی بغاوت کرائیں گے. اس وقت ان کیلئے معمولی قیدیوں کو حکم کا پابند رکھنا مشکل ہو جائیگا. اسی خیال سے ستیہ گرھیوں کیساتھ جہانتك ہو سکتا، معمولی قیدیوں کا بہت کم ربط ہونے دیا جاتا. جب سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھی تو ان کیلئے الگ جیل خانے قائم ہو گئے، کچھ نئے اور کچھ پرانے، جن میں صرف سیاسی قیدی رکھے جاتے ھیں. اگر کسی جیل خانے میں دونوں قسم کے قیدی رہتے، تو وہ الگ صحنوں میں رکھے جاتے، تاکہ ان کو ایک دوسرے سے ملنے کا کم سے کم موقع ملے. اس طرح دوسرے قیدیوں سے ستیہ گرھی اکثر الگ ھی رکھے جاتے رہے. کہیں کہیں ستیہ گرھیوں اور دوسرے قیدیونمیں جھگڑا بھی ہوا، لیکن بہت کم. اتنا ضرور ہوا کہ

جو اثر هم اپنی ملاقات اور اچھے چلن سے معمولی قیدیوں پر ڈال سکتے تھے، اتنا نہیں ڈال سکے. اسمیں هماری اپنی تو کمزوریاں تهیں هی، مگر جیل کی بھی کچھ ایسی هی پالیسی تهی.

تقسیم کا ایك دوسرا اثر جو ستیہ گرهیوں پر پڑا وہ بہت برا تھا، کیونکہ اس سے آپس میں نفاق پیدا هو جاتا تھا. ستیہ گرهیوں کی خواهش تهی کہ وہ اے "A" یا بی "B" درجہ میں رکھے جائیں. اسکے لئے وہ خود یا ان کی طرف سے دوسرے لوگ جیل کے اندر یا باهر افسروں کے پاس پہونچکر کوشش کرتے. اگر کسی کو اے کلاس مل جاتا تو کچھ لوگ ایسے بھی هوتے جو اسکو برا مانتے اور حسد کرتے. اور جنکو اوپر کا درجہ مل جاتا تھا انمیں سے کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے تئیں سی "C" کلاس والوں کے مقابلہ میں بڑا سمجھتے، کچھ گھمنڈ بھی کرتے. یہ آپس کا نفاق اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا، جب «سی» کلاس کیساتھ اے کلاس اور بی کلاس کے سیاسی قیدی ساتھ هی رکھے جاتے تھے. لیکن افسروں نے دونوں کو اپنی آسانی کے خیال سے الگ الگ رکھا. اسلئے جھگڑا اس حد تك نہیں بڑھا جہانتك

بڑھ سکتا تھا. ان سب اسباب کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا کہ ہم سیاسی اثر جتنا جیل کے افسروں پر ڈال سکتے تھے، نہ ڈال سکے.

ستیہ گرھیوں کو جیل کا تجربہ کافی ہوا. جب ہمارے ھاتھونمیں اختیار آیا تو ہم کو جیلونمیں اصلاح کرنے کا اب موقع ھے اور ہم اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتے ھیں. میں نے دیکھا کہ جیل کے جتنے قانون بنے ھیں سب تجربوں ھی سے بنے ھیں. چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا مطلب پہلے سمجھ میں نہیں آتا تھا، کچھ مطلب رکھتی ھیں، جو تجربہ پر منحصر ھے. میں نے دیکھا کہ جیل کا ایک سپاھی سہ پہر کو تین چار بجے کے قریب لوھے کی ایک چھوٹی سی سلاخ لیکر دروازوں اور جنگلونمیں لگی ھوئی سلاخوں پر ھلکی چوٹ دیتے ھوئے ایک طرح سے جل ترنگ بجاتا ھوا چلا جا رہا تھا. میں نے کئی دن تک اسطرح دیکھا. پہلے تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں کرتا ھے. لیکن بعد میں معلوم ھوا کہ یہ طریقہ ھر ایک سلاخ کو جانچنے کا ھے. اگر کہیں کوئی سلاخ کٹی یا ٹوٹی ھو تو اسکی آواز مختلف قسم کی ھوگی. قیدیوں کے پاس کوئی

رسی یا سوت کی بنی ہوئی تھیلی اور لمبا کپڑا بھی رھنے دینے کا
قاعدہ نہیں ھے. پہننے کیلئے تو «جانگھیا» اور آدھی آستین کا
کرتا، اور اوڑھنے کیلئے کمبل معمولی طرح سے ملتے ھیں. اس
کے علاوہ ایک ڈیڑھ فٹ لمبا چوڑا رومال ملتا ھے. لمبا کپڑا
اور رسی اسلئے نہیں دی جاتی کہ قیدی کہیں پھانسی نہ لگا لے.
تھیلی بھی اسلئے نہیں دی جاتی کہ ایسا دیکھا گیا ھے کہ تھیلی
سے گھس گھس کر اور لوھے کی سلاخ کاٹ کر قیدی بھاگ
گیا ھے. جیل کے سارے احاطہ کے اندر کوئی چیز بھی جو
ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائی جا سکے، رات کو باھر نہیں
چھوڑی جاتی. کیونکہ اس کے سہارے سے دیوار پر چڑھکر
قیدی بھاگ سکتا ھے. اس لئے کوئی رسی بھی باھر نہیں
چھوڑتے. کپڑے سکھانے کیلئے بہت دنوں تک ھم لوگوں کو
بھی رسی ملنے میں دقت ہوئی. بعد میں ملی بھی تو اس طرح
سے کہ سپاھی اسے سویرے لاتا اور شام سے پہلے واپس لیجاتا.

جیل کے احاطہ کے اندر «پپیتا» یا کیلا جیسے ھلکے لمبے
درخت بھی رھنے دینے کا حکم نہیں ھے. کیونکہ وہ آسانی سے
توڑے یا کاٹے جا سکتے ھیں. اور ان کو بھی دیوار سے

لگاکر قیدی اسکے ذریعہ بھاگ سکتا ھے. اونچی دیوار کے نزدیك کوئی درخت اندر یا باھر نہیں رھنے دیا جاتا. جو درخت دیکھنے میں آتے ھیں وہ اتنی دوری پر ھوتے ھیں کہ ان تك کوئی چھلانگ مار کر بھی نہیں پہونچ سکتا. رات میں ھر ایك قیدی باری باری سے ھر کمرہ میں جاگتا رھتا ھے اور چلا چلا کر سپاھی کو بتاتا ھے کہ اس کمرے میں جتنے قیدی بند ھوئے تھے گنتی کے مطابق موجود ھیں. ھر «بیرك» میں ایك روشنی جلتی ھے. لیکن وہ اتنی اونچی رکھی جاتی ھے کہ وھاں تك کوئی پہونچ نہیں سکتا. جب رات کو سپاھی پہونچتا ھے تو گن لیتا ھے کہ جتنے قیدی بند ھوئے تھے وہ موجود ھیں یا نہیں. دن کو بھی کئی بار قیدیوں کی گنتی کی جاتی. شام کو جب سب «بیرك» بند ھو جاتی ھیں تو شمار کر کے دیکھ لیا جاتا ھے کہ کتنے نئے آئے اور کتنے چھوٹے؟ ان سب کا حساب ملاکر جیل خانے کے اندر جتنے موجود ھونے چاھئیں، اتنے موجود ھیں یا نہیں. اگر کہیں حساب میں غلطی ھو جاتی ھے تو افسروں کو بہت پریشانی ھوتی ھے، اور جب تك حساب ٹھیك نہیں مل جاتا وہ دن

بھر کا کام ختم نہیں سمجھتے۔ اسیطرح صبح بھی جب تک حساب ٹھیک نہیں مل جاتا پریشان رہتے ھیں اور قیدیوں کو باہر نہیں نکلنے دیتے۔ اتنی احتیاط کے باوجود بھی قیدی بھاگ ھی جاتے ھیں۔ کبھی دیوار کود کر اور کبھی لوھے کے سیخچے توڑ کر اور کبھی دوسرے طریقہ سے، اسمیں شک نہیں کہ سب ھی قاعدوں کی اگر ٹھیک پابندی کی جائے، تو قیدی کا نکل بھاگنا بہت مشکل ھے۔

ان قاعدونکا استعمال قیدیوں کو بھاگنے سے روکنے کیلئے ھوتا ھے۔ لیکن کچھ قاعدے ایسے بھی ھیں جو ان کے دل پر یہ اثر کرتے رھتے ھیں کہ آخر وہ قیدی ھی تو ھیں، وھاں وہ تکلیف اٹھانے کیلئے ھی بھیجے گئے ھیں، اور دوسرے آدمیوں سے بالکل مختلف ھیں۔ غریب بھی ھیں، بے عزتی تو قدم قدم پر ان کو سہنی پڑتی ھے۔ جسم کی حفاظت کیلئے انتظام اچھا رھتا ھے۔ اگر انہیں کھانے کیلئے قانون کے مطابق جو کچھ مقرر ھے، وہ ٹھیک طرح سے دیا جائے، اس میں چوری نہ ھو تو وہ تندرستی کیلئے کافی ھے۔ جیل کے اندر بیماروں کے لئے بھی انتظام ٹھیک رھتا ھے، لیکن ملازم

کبھی اپنا فرض پورا نہیں کرتے. اس لئے کھانا اور دوا
دونوں سے قیدی بالکل محروم رہتے ہیں، جتنا ان کو
ملنا چاہئے، نہیں ملتا. مجھے سب چیزوں کو دیکھ کر ایسا
معلوم ہوا کہ سارے انتظام کی سیاست یہ ہے کہ قیدی کے دل
میں ڈر پیدا کیا جائے، اسکی روح دبا دی جائے، ہمت توڑ
دی جائے. تا کہ جب کبھی وہ باہر نکلے تو پست ہمت،
مایوس اور دکھی آدمی ہو کر نکلے. قیدیوں سے کچھ کام بھی
لیا جاتا ہے. پہلے کچھ کام ایسے بھی ہوتے تھے جو
ان کے جسم اور دل دونوں کو توڑ ڈالتے تھے جیسے کولھو کا
کام، لیکن بہار میں وہ اٹھا دیا گیا ہے. دوسرے جو کام
ہیں وہ ایسے ہیں جنکو لوگ باہر بھی کیا کرتے ہیں، ان
کے کرنے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی. کچھ کام ایسے
بھی کرائے جاتے ہیں، جنکو اگر قیدی سیکھ لے اور باہر
آ کر کرنا چاہے تو اس کو ایک روزگار مل جائے، اور وہ
اپنے کو مالی مشکلات سے آزاد بنالے. لیکن میں نہیں جانتا
کہ اس سے کتنے قیدی فائدہ اٹھاتے ہیں. ہاں، میں نے ایک
ایسے قیدی کو دیکھا ہے جو کئی بار جیل جا کر دری اور

قالین بننے کے کام میں اتنا ماهر هو گیا که وه اچھی سی چیزیں تیار کر سکتا. آخر میں رها هونیکے بعد جیل میں دوسرے قیدیوں کو یه کام سکھانے کیلئے نوکر رکھ لیا گیا. اور وه کئی سال سے یه کام کر رها هے. اب وه آرام سے هے اور بھلا مانس بن گیا هے. اسیطرح سے ایك دوسرے قیدی کو بھی میں نے دیکھا. وه بڑا نامی ڈکیٹ تھا. ایك زمانه تك پولیس اسکو پکڑنے سے عاجز رهی. عمر قید کی سزا پاکر جیل گیا. وه بہت هوشیار تھا. کپڑا بننے وغیره کا کام خوب اچھی طرح جان گیا تھا، اور اسکی زندگی بھی سدھر گئی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا که جیل سے باهر نکلنے پر میں اسکو کھادی کے کام میں نوکر رکھا دوں. میں نے وعده بھی کیا. لیکن جیل سے رها هو کر وه میرے پاس نہیں آیا. وه ایك کوڑھ آشرم میں خدمت کا کام کر رها هے. اتفاق سے جب میں کوڑھ آشرم گیا اور اس سے ملاقات هوئی، تو معلوم هوا که وه وهاں کے کام سے مطمئن هے اور آشرم کے لوگ بھی اس سے مطمئن هیں. اسطرح سدھرے اور سلجھے هوئے قیدی بہت کم نکلتے هیں.

ایك جو بچپن میں گرہ کٹ بن گیا، جتنی بار جیل گیا، اس سے زیادہ ماہر گرہ کٹ بنکر نکلا. میں نے دیکھا کہ ایکبار بیل گاڑیوں پر جیل میں چاول لایا گیا. وہ گاڑی والے باہر کے دیہاتی آدمی تھے اس لئے وہ بیچارے سیدھے سادے اور بیخوف تھے. جیل کے قیدیوں نے چاول کے بورے ان کی گاڑیوں سے اتارے. نمعلوم کب اور کیسے، بورے کے ساتھ ھی، ایك گاڑی‌بان کی جیب میں کچھ رقم تھی، نکال لی. اس بیچارے کو اسکا پتہ چلنے کے وقت لگا. اسکا پتہ تو جیل کے افسر بھی نہ لگا سکے کہ یہ رقم کس نے نکالی. جب بہت سے چور، گرہ کٹ، اور ڈکیٹ اکٹھے ھوتے ھیں تو ایك دوسرے سے باتیں کرتے ھیں، اور ایك دوسرے کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ھیں، اسکے ساتھ ھی نت نئے ڈھنگ بھی سیکھتے رہتے ھیں. جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ «جیل کے افسر بھی ایسے لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے ویسے ھی ھو جاتے ھیں. ان میں تھوڑے ھی ایسے ھوتے ھیں جو اپنے کو اس اثر سے بچا سکیں». بات یہ سہی ھے، وہ اگر اچھے ھوں تو قیدیوں کو سدھار بھی سکتے ھیں. لیکن جیل

کے سارے قاعدے ایسے بنائے گئے ھیں کہ ان میں سدھار کی گنجائش نفی کے برابر ھے۔ ان میں ھر طرح سے ڈر پیدا کر کے دل توڑنے کی کوشش کی جاتی ھے۔ اس طرح اگر کوئی سدھر جاتا ھے تو اپنی خوشی سے ھی سدھرتا ھے، جیل کے قاعدوں کی وجہ سے نہیں۔

جیل میں زیادہ ایسے ھی لوگ جاتے ھیں جو موٹے تازے ھوتے ھیں، اور جو قید ھونے سے پہلے کام کر کے کچھ پیدا کرتے رھتے ھیں۔ ان سے اگر ٹھیک طرح سے کام لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کم سے کم اتنا نہ کما لیں جو ان کے کھانے پینے کیلئے کافی ھو۔ معمولی طور سے ایک جوان آدمی جیل کے باھر اتنا پیدا کرسکتا ھے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو کھلا سکتا ھے۔ وہ جیل میں جا کر گورنمنٹ پر بوجھ ھوجاتا ھے۔ صرف اس کی نگرانی کے لئے ھی خرچ نہیں کرنا پڑتا، بلکہ اس کو جو کھانا کپڑا دیا جاتا ھے وہ بھی گورنمنٹ ھی کو دینا پڑتا ھے۔ یعنی جو سماج سے ٹیکس وصول کر کے دیا جاتا ھے، یہ سماج کیلئے تگنا نقصان دہ ثابت ھوتا ھے۔ ایک تو اس نے سماج کے خلاف کچھ کام کیا، جس کی پاداش

میں اس کو سزا ملی. دوسرے وہ جو کچھ پیدا کرسکتا تھا اور دوسروں کو اور اپنے کو پال سکتا تھا، وہ بند ہوگیا. تیسرے اس کے کھانے کپڑے کیلئے سماج کو خرچ کرنا پڑا. اگر جیل کی سیاست سدھر جائے تو یہ سب نقصان موقوف ہوسکتا ہے. جیل کے خرچ کا بہت بڑا حصہ قیدیوں سے ان کے لائق کام لیکر وصول کیا جاسکتا ہے. اسکے لئے جیل کے مقصد کو بدلنا ضروری ہے. اگر جیل ڈرانے اور سزا دینے کے بجائے سدھار اور اصلاح کی جگہ بن جائے، جہاں بگڑے ہوئے لوگ جاکر اچھے ہوسکیں، تو اس سے بڑھکر سماج کی کوئی دوسری بھلائی نہیں ہوسکتی. پھر اگر کوئی چلا بھی جائے تو بہتر ہوکر وہاں سے نکلے، اور باہر بھی سماج کا بہترین آدمی ہوکر رہے. گویا وہ جیل کے اندر بھی کام کرکے اتنا پیدا کرلے کہ جیل کا محکمہ خرچ کا محکمہ نہ بن کر آمدنی کا محکمہ بن جائے. اس کام کیلئے ایسے افسر ہونے چاہئیں جو اس سیاست کو اچھی طرح سمجھیں اور قیدیوں کے ساتھ صرف سختی ہی کا نہیں بلکہ ہمدردی کا بھی برتاؤ کریں. ان کو صرف ڈرائیں ہی نہیں بلکہ ان کی روح کو بھی بیدار کریں اور

ان کے رھن سہن کو سدھاریں.

یہ ایك ایسا مسئلہ ھے جس پر بہت کچھ کہا جاسکتا ھے. اسکے متعلق بہت لٹریچر بھی تیار ھوگیا ھے. کئی ملکوں میں سدھار کی پالیسی سے کام بھی لیا جا رھا ھے. ھم لوگ بھی اگر اپنے تجربہ سے کام لیں اور جیل کا سدھار کرنا چاھیں تو بہت کچھ کرسکتے ھیں. لیکن جہانتك مجھے معلوم ھے، ابتك جو کچھ تھوڑی بہت سدھار کی تدبیریں کی گئیں وہ زیادہ تر سیاسی قیدیوں کو زیادہ آسانیاں دینے کے لئے ھی کی گئی ھیں. لیکن سچ پوچھئے تو زیادہ دھیان دینے کے قابل معمولی قیدی ھی ھیں. کیونکہ سیاسی قیدی تو کچھ سمجھدار اور دبنگ ھوتے ھیں اور اپنا کام کئی طرح سے کبھی دباکر کبھی ترکیب سے کبھی اپنے اچھے اثر سے نکال لیتے ھیں. لیکن غریب معمولی قیدی جو بہت تجربہ کار اور بدمعاش نہیں ھوتے وہ بیچارے جوں کے توں رہ جاتے ھیں.

میرا خیال ھے کہ جیل کی اصلاح میں تین چار باتوں کا غور کرنا ضروری ھے. جہاں تك ھو سکے اسکے قاعدے اس اصول سے بدلے جائیں کہ جو لوگ یکایك کسی غلطی سے

جیل چلے گئے ہوں ان کا ایسے قیدیوں سے میل جول نہ ہوسکے جو سچ مچ چھٹے ہوئے بدمعاش ہوں. اکثر گاؤں کے لوگ آپس میں لڑتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو سزا ہو جاتی ہے. لیکن وہ دل کے برے نہیں ہوتے، صرف غصے میں آکر اور کسی پیدا ہونے والی وجہ سے کوئی غلطی کر دیتے ہیں. ایسوں کو بدمعاش قیدیوں کی صحبت سے الگ رکھنا چاہئے. جو قیدی کم عمر ہوتے ہیں وہ آج بھی الگ رکھے جاتے ہیں، لیکن ان کے بھی سدھارنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ انتظام ہونا چاہئے. ان میں بھی یہ دیکھنا چاہئے کہ ان میں سے کون بار بار جیل گیا ہے اور کون دفعتاً کسی غلطی کی وجہ سے سزا پا گیا ہے. ان دونوں قسم کے نوجوانوں کو بھی الگ الگ رکھنا چاہئے. یہ قاعدہ آج بھی ہے لیکن اس کا صحیح استعمال نہیں ہوتا ہے . ایسے نوجوانوں کو پرانے بدمعاش قیدیوں کے ساتھ کبھی نہ رکھنا چاہئے. میں نے دیکھا کہ جیل کے اندر یہ سدھرنے کے بجائے اور زیادہ چوری اور گرہ کٹی وغیرہ کی بری عادتوں میں گرفتار ہوجاتے ہیں. تعلیم، اچھے لوگوں

کی صحبت میں دل کو بہلائے رکھنا اور کسی طرح کا لالچ نہ ہونا، یہ سب سدھار کی تدبیریں ہیں. انسانی نفسیات کے جاننے والے یہ بتا سکتے ہیں کہ کن کن طریقوں سے وہ نوجوان سدھارے جا سکتے ہیں. اسوقت جو تدبیریں کی جاتی ہیں وہ نفی کے برابر ہیں. قصور کے اعتبار سے بروں کی بھی کئی قسمیں کی جا سکتی ہیں. لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب جیل کے افسر خود اس پالیسی کو سمجھ لیں اور اسکے متعلق کچھ علم حاصل کرلیں.

فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو بہت دنوں تک خاص تعلیم دی جاتی ہے. پولیس کے سپاہیوں اور افسروں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے. منصف اور مجسٹریٹ بھی اگرچہ کالج کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں مگر پھر بھی کچھ دنوں کے لئے ان کو اپنے خاص قانونی کام کے لئے خاص تعلیم لینی پڑتی ہے. لیکن جہاں تک مجھے علم ہے جیل کے افسروں کے لئے کسی قسم کی خاص تعلیم کا انتظام نہیں ہے. وہ تقرر کے بعد جیل میں رکھ دئے جاتے ہیں، جو کام وہاں ہوتا رہتا ہے اسی کو دیکھ کر جو کچھ سیکھ سکتے ہیں سیکھ لیتے ہیں

اس کے معنے یہ ھیں کہ پرانے ھی طریقہ کو سیکھتے اور کام میں لاتے ھیں. اس کا ایك ثبوت یہ ھے کہ جو جیل کے سب سے بڑے افسر ھوتے ھیں وہ فوج، پولیس یا ڈاکٹروں میں سے یا کسی دوسرے محکمہ سے لئے جاتے ھیں. ان کو جیل کے متعلق کوئی خاص علم نہیں ھوتا. البتہ انتظامی کام ٹھیك جانتے ھیں. جیلر وغیرہ تو نیچے ھی سے ترقی پاتے ھوئے مقرر ھوتے ھیں. اس طرح یہ سارا محکمہ ایسے لوگوں کے ھاتھوں میں ھوتا ھے جو نفسیات کا کوئی علم نہیں رکھتے آج تمام دنیا کے ملکوں میں جیل کے متعلق جو اصلاحیں ھو رھی ھیں ان سے بھی واقفیت نہیں رکھتے اور جن کے سامنے سدھار کے لئے کوئی نمونہ بھی نہیں ھوتا. وہ صرف ایك ھی بات جانتے ھیں، یعنی کس طرح قیدی سے جیل کے قانون کی پابندی کرائی جائے. اور کوئی قیدی کسی طرح سے بھی بھاگنے نہ پائے. قیدی کے سدھارنے کا تو ان کے سامنے کوئی سوال ھی نہیں ھوتا. جو قاعدے قیدیوں کے کھانے پینے کے لئے بنائے گئے وہ ایسے ھیں، جن کے متعلق میرے ایك دوست کہا کرتے تھے کہ قیدی کو اتنا کھانا

ملـ جاتا ہے کہ وہ نہ مرے اور نہ موٹا ہو۔ اور جیـل کے افسروں کی تو یہی کوشش رہتی ہے کہ جیـل سے جو نکلے وہ خوف زدہ ہوکر نکلے، سدھر کر نہ نکلے۔ لیـکن اسکا نتیجہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ جو بھلا آدمی اتفاق سے جیـل چـلا جاتا ہے، جس کو زیادہ ڈرانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ دوبارہ قصـور کرنے والا نہیں ہے، وہ ضرور خوف زدہ ہوکر نکلتا ہے۔ لیکن جو پکا بدمعاش ہوتا ہے وہ باہر صرف اس لئے جاتا ہے کہ دل بہلا آئے۔ جیل میں جو سیکھتا ہے وہ اسکو باہر جانے پر استعمال میں لا کر پھر جیل چلا جاتا ہے، کیونکہ جیل میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ قیدیوں سے جیل میں پیـداوار کے لئے کام لینا چاھئے، نہ کہ سزا دینے کے لئے۔ اگر اس خیال سے کام لیا جائے اور کام میں لطف پیدا کرایا جائے، اور صرف سزا کے خـوف سے ہی کام نہ کرایا جائے، تو انکی عادت بدل سکتی ہے اور جیل کی آمدنی بھی بڑھائی جاسکتی ہے۔ یہی ایك طریقـہ ہے جس سے جیل خانے خود مکتفی بنـائے جا سکتے ہیں، اور کوئی وجـہ نہیں کہ سارا ڈپارٹمنٹ خـود مکتفی نہ ہو جائے۔

اس کے علاوہ کچھ مذھبی اور سیاسی تعلیم کا بھی انتظام ھونا چاھئے. آجکل بھی محض نام کے لئے کچھ انتظام ھے. اس سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا. جیل سے رھا ھونے کے بعد بہت سے نو آموز چور وغیرہ کچھ اس طرح پولیس کے چکر میں پڑ جاتے ھیں کہ ان کو خواہ مخواہ چوری ھی کرنی پڑتی ھے. کبھی کبھی پولیس ان کو اتنی تکلیف دیتی ھے کہ وہ پھر جیل ھی میں جانا آرام‌دہ سمجھتے ھیں. اس لئے جیل سے نکلے ھوئے لوگوں کی دیکھ بھال کیلئے بھی کوئی انتظام ھونا چاھئے. پولیس کے ذریعہ جو انتظام ھوتا ھے وہ تو جیل کے ھی زندگی کو باھر بھی معمولی ترمیم کے ساتھ قائم رکھنے کیلئے ھوتا ھے. قیدی کو کبھی آزاد ھوکر بے خوفی سے سدھری ھوئی زندگی گزارنے کا موقع ھی نہیں ملتا. اس لئے یہ کام پولیس کے ذریعہ نہیں ھوسکتا. اس کے لئے غیر سرکاری ادارہ ھونا چاھئے جو چھوٹے موٹے قیدیوں کی اس طرح مدد کرے کہ وہ معمولی سماجی زندگی میں گھل مل جائیں. جب جیل کے اندر سدھار ھوجائے اور باھر ان کو موافق فضا مل جائے، تو وہ قیدی نہ رہ کر سماج کے ایک تجربہ کار اور ھوشیار ممبر بن سکتے

ہیں۔ اگر سزا اسی مقصد سے دی جائے تو جس کو سزا ملے وہ آرام میں رہے اور سماج بھی۔ سماج کا اتنا ہی فرض ہے، کیونکہ کوئی آدمی بغیر سبب کے برا نہیں بن سکتا۔ سماج میں ہی کچھ ایسی خرابی ہوتی ہے جس کی صحبت میں بیٹھکر یا تو برے کاموں کی ہمت افزائی ہوتی ہے یا ان کے کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تیئیسواں باب

برٹش گورنمنٹ کی دو عملی سیاست کام کر رھی تھی۔ ایک طرف ستیہ گرہ کے دبانیکی تدبیر کی جا رھی تھی، دوسری طرف گول میز کانفرنس کا منصوبہ کر کے یہ دکھایا جا رھا تھا کہ وہ ہندوستان کو سیاسی اقتدار دینے کیلئے تیاری کر رھی ھے۔ جس وقت ھم لوگ جیل میں تھے اسیوقت ایک تدبیر ھوئی تھی کہ کانگریس کے لوگ بھی اس کانفرنس میں شریک ھوں۔ اس گفتگو کی ابتدا پنڈت موتی لال جی کیساتھ ایک انگریز اخبار نویس «سلوکومبھ» نامی کے ذریعہ سے ھوئی۔ پنڈت موتی لال جی اور پنڈت جواھر لال وغیرہ مہاتماجی کیساتھ مشورہ کرنے کیلئے نینی جیل (پریاگ) سے یرودا (پونا) جیل میں لیجائے گئے۔ جب تک یہ گفتگو ھوتی رھی سبھی جیلوںمیں جہاں ستیہ گرھی تھے، طرح طرح کی باتیں ھوتی رھیں۔ کچھ لوگ تو اس گفتگو کو بڑی امید سے دیکھ رھے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس کے ذریعہ کوئی سمجھوتہ ھو ھی جائیگا، اور جیل جانے کا سلسلہ بند ھو

جائیگا. دوسرے لوگ سمجھتے تھے کہ ہم لوگوں کی قربانی اتنی نہیں ہوئی ھے کہ اس کا اثر برٹش گورنمنٹ پر اتنا بڑا ہو کہ وہ سچ مچ ہمیں سوراج دینے کیلئے تیار ہو گئی ہو. کچھ لوگ اسی بات کو دوسری طرح سے سوچا کرتے تھے، کہ ہم نے ابتك اتنا نہیں کیا ھے کہ برٹش گورنمنٹ ہم سے دب جائے، اور مجبور ہوکر ہماری بات مان لے. باہر کے جو لوگ اسمیں دلچسپی لے رہے تھے، جنمیں ممتاز، سرتیج بہادر سپرو، ڈاکٹر جیکر بڑے لوگونمیں سے تھے، وہ دل سے چاہتے تھے کہ کوئی سمجھوتہ ہوکر جھگڑا ختم ہو جائے. لیکن گفتگو کا کچھ نتیجہ نہ نکلا. گورنمنٹ چاہتی تھی کہ کانگریس کے لوگ کانفرنس میں شریك ہوں. کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر کانگریس کیساتھ کچھ طے نہ ہوا تو گول میز کانفرنس بغیر دولھا کی برات ہوکر رہ جائیگی. لیکن وہ کانگریس کی مانگ پورا کرنے کیلئے تیار نہیں تھی. اسکو تو یہ بھی دکھلانا تھا کہ کانگریس کو چھوڑ کر بھی وہ اپنا کام چلا لیگی، جیسا اس نے سنہ ۱۹۲۱ ع میں کیا تھا.

گول میز کانفرنس ہوئی. اسمیں سوائے کانگریس کے

دوسرے سب لوگ شریك ہوئے، جسمیں دیسی والیان ملك بھی تھے. اس کا ایك اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ راجاؤں نے بھی اپنی طرف سے کہدیا کہ اگر سارے ہندوستان کی ایك یونین بنے تو وہ بھی اسی میں شریك ہو جائینگے. اس سے آجتك جو ہندوستان دو حصونمیں تقسیم تھا. یعنی برٹش سرکار کے تحت اور ریاستوں کے تحت. اسکے ایك ہو جانیکا راستہ کھل گیا. لیکن شاید برٹش گورنمنٹ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ برطانوی ہند کو وہ بہت دنوں تك اختیارات سے محروم نہیں رکھ سکے گی. البتہ راجواڑوں کو ساتھ ملا کر جہاں رعایا کا ابھی تك کوئی نام نہیں تھا، وہ راجواڑوں کی معرفت خفیہ طور سے اپنے ہاتھونمیں اختیار رکھ سکیگی. شاید اسی لئے اس نے اس چیز کو پسند کیا. کانگریس کی غیر حاضری میں قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا. کانفرنس اس امید کیساتھ اس سال ملتوی کی گئی. اور یہ سوچکر کہ وہ لوگ جب پھر ملیں گے، تو اس وقت کانگریس بھی اسمیں شریك ہوگی اور پھر کوئی متفقہ فیصلہ ہو سکے گا. ادھر اس بات کی کوشش کی گئی کہ کانگریس کے لوگ کسی طرح سے بھی گول میز کانفرنس میں

پہونچائے جائیں. اسکے لئے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ جو کانگریسی لیڈر جیل میں تھے وہ چھوڑ دیئے گئے، تا کہ وہ آپس میں مل کر اس مسئلہ پر غور کریں. گورنمنٹ جانتی تھی کہ جب تک ان کو بلا شرط چھوڑ کر پوری آزادی کیساتھ غور کرنے کا موقع نہیں دیا جائیگا اس وقت تک وہ کچھ نہیں کرینگے. اسلئے ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبروں کو جو اس زمانہ میں کچھ دنوں کیلئے عارضی طور پر ممبر بنا دیئے گئے تھے چھوڑ دیئے گئے. الہ‌آباد میں گفتگو ہوئی. سر تیج بہادر سپرو وغیرہ گول میز کانفرنس سے ہندوستان واپس آچکے تھے. انہوں نے وہاں کی سب باتیں بتا کر اپنی رائے دی. آخر میں یہ ارادہ ہوا کہ اگر موقع مل جائے تو مہاتماجی لارڈ ارون وائسرائے سے گفتگو کریں. ٹھیك اسی وقت جب یہ گفتگو جاری تھی، ملك کی بد قسمتی سے پنڈت موتی لال جی کا انتقال ہو گیا. سارے ملك میں ماتم ہونے لگا. لیکن کام تو کرنا ہی تھا اسلئے گفتگو جاری رکھنے کا ارادہ قائم رہا.

ان دنوں دو قسم کے خیالات پھیلے ہوئے تھے. کچھ لوك تو چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح صلح ہو جائے،

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو صلح تو چاھتے تھے مگر اسی حالت میں کہ برٹش گورنمنٹ ھماری باتوں کو مان کر کم سے کم آگے کیلئے راستہ صاف کردے. مہاتماجی لارڈ ارون سے دلی میں گفتگو کرنے لگے. ورکنگ کمیٹی کے لوگ ان کے ساتھ ھی ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ٹھہرے تھے. مہاتماجی جو کچھ باتیں وھاں کر کے آتے، سب کو سنا دیتے. ان کا سب سے زیادہ زور نمك کے قانون پر تھا جو ستیہ گرہ کا سب سے بڑا ھتھیار تھا. سردار ولبھ بھائی کا زور اس بات پر تھا کہ جو زمینیں کسانوں کی ضبط ھوئی ھیں واپس کردی جائیں، اور جو ستیہ گرھی قیدی جیل میں تھے ان کو تو چھوڑنا تھا ھی، لیکن جو آشرم وغیرہ ضبط کئے گئے تھے ان کو بھی واپس کرنا تھا. گفتگو کئی دن تك جاری رھی. آخر میں سمجھوتے کا ایك مسودہ تیار ھوا. لندن سے منظوری لینے کیلئے گفتگو کی خبر دی جایا کرتی تھی، اس عرصہ کیلئے یہاں گفتگو روك دی جایا کرتی تھی. ٹہلنے کے وقت مہاتماجی کیساتھ میں اکثر سویرے باھر جایا کرتا تھا، اس وقت زیادہ باتیں ھوا کرتی تھیں. میری خواھش تو تھی

کہ صلح ہو جائے، لیکن ساتھ ھی میں یہ بھی چاھتا تھا کہ اس کیلئے شرطیں ایسی ھوں کہ جس سے ھمارے لوگوں کا حوصلہ بلند رھے. چنانچہ میں نے کہا بھی کہ جو کچھ بھی ہو، ایسی شرط ضرور رکھی جائے جس سے ھماری جیت کا اشارہ ھو. مہاتماجی نے کہا کہ جہانتك ھم نے سچ مچ جیتا ھے اتنا ھی صلحنامہ میں آ سکتا ھے، اس سے زیادہ نہیں. جہانتك ھم نے سچ مچ جیتا ھے اگر اس سے زیادہ صلح نامہ میں آ بھی جائے تو وہ کسی کام کا نہ ھوگا. کیونکہ ھمکو اتنا ھی نفع سمجھوتے سے مل سکتا ھے جتنا نفع اٹھانے کی ھم میں طاقت ھے. اور وہ طاقت اسی مقدار میں ھم میں آتی ھے جس مقدار میں ھم جیت سکے. اسلئے یہ غلط خیال چھوڑ دینا چاھئے کہ اپنی طاقت سے زیادہ ھم سمجھوتے سے پا سکیں گے. میں نے سوچا کہ مہاتماجی کا اعتقاد سچائی پر اتنا ھے کہ وہ طاقت سے زیادہ سمجھوتے کے ذریعہ سے لینے میں کچھ غلطی دیکھتے ھیں. اسی وجہ سے نہ تو اسکی امید رکھتے ھیں اور نہ اس کیلئے تدبیر کرتے ھیں. بات ٹھیك ھی تھی، جو کچھ ھم ھضم نہیں کر سکتے اسکو لے لینے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ھو سکتا،

بلکه اس سے نقصان هی هے.

مہاتماجی کا لارڈ ارون پر اعتماد تھا. وہ سمجھتے تھے که وائسرائے جتنا کہتے هیں اتنا پورا کرینگے. لارڈ ارون کا بھی مہاتماجی پر اعتماد تھا. وہ بھی چاهتے تھے که کوئی راسته ایسا نکل آئے جس سے گول میز کانفرنس میں کانگریس شریك هو جائے. اسکے لئے وہ بھی جہاں تك جا سکتے تھے. وهاں تك جانیکے لئے تیار تھے. اور وهاں تك وہ گئے بھی لیکن انکے ماتحت افسر سمجھوتے کی گفتگو هی کو ناپسند کرتے تھے اور سمجھتے تھے که انہوں نے تحریك کو دبا دیا هے، اب سمجھوتے کی کوئی ضرورت نہیں. لیکن چونکه برٹش گورنمنٹ گول میز کانفرنس میں مہاتماجی کو شریك کرنے پر تلی هوئی تھی. اسلئے وہ چاهتی تھی که ان سے کچھ باتیں کرکے انکو وهاں بھیج دینا چاهئے، پھر اسکے بعد دیکھا جائیگا. اتفاق سے لارڈ ارون کے عہدے کی میعاد بھی اسی وقت ختم هو گئی، اور سمجھوته کرکے وہ چلے گئے. ان کی جگه پر لارڈ ولنگڈن آگئے، جو بالکل اپنے ماتحت افسروں کے هاتھ میں تھے یا ان سے متفق تھے. نتیجه یه هوا که سمجھوته پر دستخط تو

ہو گئے، لیکن لارڈ ارون کے جاتے ہی اسے کسی نہ کسی طرح سے بیکار بنانے کی تدبیریں شروع ہو گئیں. لارڈ ارون کے زمانہ میں اسکی جو شرطیں پوری کی جا چکی تھیں وہ تو باقی رہیں لیکن دوسری شرطوں کی تکمیل میں دقت پیش آنے لگی. کئی ماہ تک مہاتماجی کو شرطوں کے پورا کرانے میں پریشان رہنا پڑا. ہمکو تو صرف ایک ہی شرط پوری کرنی تھی کہ ستیہ گرہ بند کردی جائے. یہ شرط سمجھوتہ ہوتے ہی پوری کردی گئی، اور مہاتماجی اور ورکنگ کمیٹی کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ ستیہ گرہ بند کردی جائے. اس اعلان کے ہوتے ہی وہ سبھی جگہوں پر بند ہوگئی. لیکن گورنمنٹ کو قیدیوں کا چھوڑنا. ضبط شدہ آشرم کمیٹیوں کو واپس دینا، نمک کے قانون کے رہتے ہوئے آسانیاں دینے کی جو شرائط طے ہوئی تھیں انکو پورا کرنا، گجرات میں ضبط شدہ زمینوں کے متعلق جانچ کرنا، وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں ہوئی تھیں، انمیں سے ہر ایک میں رکاوٹیں ڈالی گئیں. جو بات سب سے آسان تھی، یعنی قیدیوں کا چھوڑنا، اس کیلئے بھی مہینوں خط و کتابت کرنی پڑی. بہپور (بھاگلپور) کا ضبط شدہ آشرم تو آخر تک

نہیں چھوڑا گیا. جب کوئی دوسرا بہانہ نہیں ملا ، تو گورنمنٹ کی طرف سے کچھ ایسی تدبیر کی گئی، کہ اس زمین پر بعض لوگوں سے دعوے کرا کر ان سے کچھ لکھوا لیا گیا. اور اسی کے بھروسہ پر اس پر قبضہ رکھا گیا. بات یہ تھی کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ صوبہ کے افسر شرطوں کو ماننا ھی نہیں چاھتے تھے. اس لئے جہاں تك رکاوٹ ڈال سکے وہ اسکو ڈالتے ھی گئے.

سمجھوتے کے وقت ھی ایك واقعہ پیش ھوا جس نے ملك میں بڑی ھلچل پیدا کردی. سردار بھگت سنگھ کے مقدمہ میں، جو بہت دن سے چل رہا تھا، حکم سنا دیا گیا اور پھانسی کی سزا ھو گئی. ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے ایك انگریز افسر کو مار ڈالا تھا، جس نے «سائمن کمیشن» کے آنے کے وقت لاجپت رائے پر وار کیا تھا. جسکی وجہ سے کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ھو گیا. مہاتماجی نے لارڈ ارون سے کہا کہ وہ پھانسی کی سزا معاف کردیں اور اسکے بجائے جنم قید کی سزا دے دیں. لیکن وائسرائے اس پر راضی نہ ھوئے. ادھر کانگریس کا باضابطہ اجلاس جو ستیہ گرہ کے زمانہ میں

نہیں ہوا تھا، کراچی میں کرنے کا ارادہ کیا گیا. اس کا وقت بھی نزدیك آ گیا تھا. سمجھوتہ کو کانگریس میں منظور کرانا تھا. کیونکہ اسکی ایك شرط یہ تھی کہ کانگریس کا نمایندہ گول میز کانفرنس میں شریك ہو. مہاتماجی کا خیال تھا کہ سردار بھگت سنگھ کی پھانسی اگر رك گئی تو ملك میں اچھی فضا قائم ہو جائیگی. اس وقت صرف سمجھوتے کے پاس کرانے ہی میں آسانی نہیں ہوگی بلکہ دوسری طرح سے جو جھگڑا چل رہا تھا وہ کم ہو جائیگا. اور اس سے سچا سمجھوتہ جیسا ہونا چاہئے ویسا ہو سکے گا. لیکن لارڈ ارون پھانسی کو نہ روك سکے. شاید ان پر دوسرے افسروں کا اتنا زور پڑا کہ وہ ایسا نہ کر سکے. انہوں نے آخر میں یہ کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں پھانسی کی تاریخ کو کانگریس کے بعد تك کیلئے ملتوی کر سکتا ہوں، لیکن پھانسی کی سزا معاف نہیں کرسکتا. مہاتماجی نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں نہیں چاہتا کہ کانگریس کے اجلاس تك پھانسی کو ٹال دیا جائے، اور جب کانگریس سمجھوتہ کو منظور کرلے تو بعد میں پھانسی دے دی جائے. اس سے بہتر یہی ہے کہ کانگریس سے قبل پھانسی ہو جائے

تا کہ کانگریس کسی دھوکے میں نہ رہے، اور ساری حالت سمجھ کر جو مناسب سمجھے کرے. چنانچہ ایسا ھی ھوا. کانگریس سے دو تین روز قبل خاموشی کیساتھ پھانسی دے دی گئی. سب کچھ ھو جانے کے بعد یہ بات ظاھر کی گئی. اس سے لوگوں میں، خاصکر پنجابیوں میں غیظ و غضب پیدا ھو گیا.

سمجھوتہ کی کچھ شرطوں نے پنڈت جواھر لال نہرو کو تکلیف دی. مہاتماجی کو انہیں بہت سمجھانا پڑا. لیکن وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں تھے کہ ایك بات طے ھو جانیکے بعد اس کی مخالفت کرتے رھتے. اگرچہ وہ غیر مطمئن تھے پھر بھی وہ خاموش ھو گئے. لیکن کچھ دوسرے لوگ پھانسی سے طیش میں آکر یا سمجھوتے ھی سے غیر مطمئن ھو کر اسکی مخالفت کرنے لگے. کراچی کانگریس کے وقت فضا بہت خراب ھو گئی تھی. جب ھم لوگ ریل سے کراچی جا رھے تھے، اس وقت راستہ میں بہت سے مخالف مظاھرے ھوئے. مہاتماجی کو لوگوں نے کالے پھول دئے. دوسرے طریق سے بھی یہ بتایا کہ سمجھوتے کی تمام باتوں سے لوگ غیر مطمئن

ہیں. اس وقت مہاتماجی کا ضبط وتحمل اور اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہنے کی حالت دیکھنے کے قابل تھی. مظاہرے کرنیوالوں کے غصہ کو اپنے میٹھے لفظوں سے اور اپنے اوپر سارا گناہ لیکر ختم کرتے رہے. کانگریس میں مخالفت کا طوفان سا آتا ہوا معلوم ہوا. لیکن انہوں نے اسکو اس خوبی سے سنبھالا کہ اور کسی کیلئے اس طرح سے سنبھالنا ممکن نہیں تھا. ان کے جذبہ محبت سے مخالف بھی پگھل جاتے. جو لوگ بہت غصہ میں آتے وہ بھی مطمئن ہو کر چلے جاتے.

کراچی کانگریس کے بعد یہ طے ہو گیا کہ کانگریس کے نمائندے گول میز کانفرنس میں جائینگے، اور صرف مہاتماجی وھاں کانگریس کی نمائندگی کرینگے. لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ سمجھوتہ کی شرطیں پوری ہو جائیں. اسمیں کافی رکاوٹ پیدا ہوئی. مہاتماجی برابر خط و کتابت کرکے شرطوں کو پورا کرانے میں لگے رہے. اسمیں بھی ان کا تحمل اور استقلال خوب دیکھنے میں آئے. وہ اپنی باتیں چھوڑتے نہیں تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کوئی بھی افسر سمجھوتہ کی شرطوں کو علانیہ طور پر صاف صاف ماننے کی بات کبھی نہ کہے گا.

ان شرطوں کو انہیں پورا تو کرنا هی هوگا. لیکن وہ رکاوٹیں ڈال کر همکو اتنا تھکا سکتے هیں که هم خود مایوس هو کر کہہ دیں که اب شرطیں پوری هو گئیں، پوری ہونیکی ضرورت نہیں رهی. مہاتماجی اسکے لئے تیار نہیں تھے، وہ ایك ایك کرکے سبھی شرطوں کو پورا کراتے رهے. آخر میں گول میز کانفرنس میں جانے کا وقت آگیا. اسوقت تك گجرات کی زمینوں کے متعلق جانچ پوری نہیں هوئی تھی. مہاتماجی بھی اس پر که یه معامله اگر طے نه هوگا تو هم گول میز کانفرنس میں شریك نه هو سکیں گے. «لارڈ ولنگڈن» نے اپنی هار مان کر انکی بات منظور کرلی. کیونکه گول میز کانفرنس میں پہونچنے کیلئے بمبئی سے جہاز تك معمولی طور سے مہاتماجی نہیں پہونچ سکتے تھے اسلئے اسپیشل سے وہ پہونچائے گئے، اور مقررہ وقت سے کچھ بعد تك جہاز روك دیا گیا.

مہاتماجی کی بات لارڈ ولنگڈن نے مجبور هو کر مان لی تھی. لیکن وہ اسی وقت سے اس فکر میں تھے، که کسی نه کسی طرح مہاتماجی اور کانگریس کو دبانا چاهئے. ادهر مہاتماجی انگلستان گئے، ادهر چالیں چلی جانے لگیں. که

کانگریس کو کسی نہ کسی تدبیر سے قصوروار ٹھرا کر سختی
کیساتھ دبا دیا جائے تاکہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکے. سردار
ولبھ بھائی پٹیل جو کراچی کانگریس کے صدر ہوئے تھے
مہاتماجی کی غیر موجودگی میں شرطوں کو پورا کرانے اور یہاں کی
کی حالت سنبھالنے میں بہت ھی مضبوطی اور ہوشیاری سے
لگے رھے. مگر جب ایك طرف سے بگاڑ ھی پر گورنمنٹ کے
افسر تلے ہوئے تھے، تو ان کی کیا اور کہانتك چل سکتی
تھی. ادھر گول میز کانفرنس میں بھی ایسی حالت پیدا ہو گئی
تھی. کہ وھاں بھی مہاتماجی جیسا چاھتے تھے ویسا نہ کر پائے.
وھاں پر دنیا کے سامنے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی کہ
برٹش گورنمنٹ تو بہت کچھ کرنے پر تیار ھے، مگر ہندوستان
کے لوگ اتفاق کر کے کوئی ایك بات نہیں کہہ سکتے، انکے آپس
کے جھگڑے اور باھمی بے اعتمادی اتنے گہرے ھیں، کہ
برٹش گورنمنٹ کو مجبوراً اپنے ھاتھوں میں بہت سے اختیارات
رکھنے پڑتے ھیں. یہاں پر گول میز کانفرنس کی باتیں لکھنا
بھی میرے لئے ممکن نہیں.

مہاتماجی جب وھاں سے ناامید ہو کر چلے تو ہندوستان

میں افسروں نے اس وقت تک ایسی حالت پیــدا کردی تھی که کانگریس کے دبانے میں وہ اپنی من مانی کرسکیں. بنگال کی گرفتاریاں، یوپی (صوبه متحدہ) میں کسانوں کیساتھ سختیاں اور صوبه سرحد کی زیادتیاں. ان سب باتوں نے کانگریس کی کمیٹی کو اس سخت حالت پر غور کرنے کیلئے مجبور کیا. هملوگ مہاتماجی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے. جس روز وہ جہاز سے بمبئی پہونچنے والے تھے. اس روز وهاں پر ورکنگ کمیٹی کی نشست مقرر هو گئی. هملوگ سب کے سب جگه جگه سے بمبئی کیلئے روانه هو گئے. پنڈت جواهرلال جی اله اباد سے اسی ٹرین میں سوار هوئے، جس میں میں بھی تھا. اله آباد سے تھوڑی هی دور پر بے جگه ٹرین ٹھرا کر جواهر لال جی گرفتار کر لئے گئے. اب یه بات صاف هو گئی که گورنمنٹ یه نہیں چاهتی هے که مہاتماجی سے هم سبلوگ مشورہ کر سکیں یا خود وہ صلح کا راستــه نکالے. وہ تو اس بات پر تل گئی تھی که کسی نه کسی طرح سے کانگریس کو دبانا اور توڑ دینا چاهئے. هملوگ بمبئی پہونچے. جنتا نے مہاتماجی کا بڑے جوش اور بڑی شان سے استقبال کیا. مہاتماجی

نے اترتے ھی کانگریس کمیٹی سے باتیں کر کے لارڈ ولنگڈن کو تار دیا کہ وہ ان سے ملکر اپنی غیر موجودگی میں پیدا شدہ حالات کے متعلق باتیں کرنی چاھتے ھیں، تا کہ کوئی راستہ نکل آئے. لیکن لارڈ ولنگڈن نے ملنے سے انکار کردیا. لھذا کوئی بات نہ ھو سکی. ھم لوگ سمجھ گئے کہ لڑائی پھر چھڑ گئی. پھر اسی رات کو ھملوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ھو گئے.

بمبئی سے ھملوگوں کے روانہ ھو جانیکے بعد بھی مہاتماجی نے تاروں کے ذریعہ سے بات کرنے کی کوشش نہ چھوڑی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا. رات کو انکی بھی گرفتاری ھو گئی اور وہ یرودا جیل پہونچا دئے گئے. اسی دن صوبوں میں جتنے بڑے لوگ تھے گرفتار کر لئے گئے. تمام آشرم، کانگریس کے دفتر اور کانگریس کے کام کرنیوالے، دوسرے متعلقہ ادارے، سب غیر قانونی قرار دیدئے گئے. سب اداروں کے بڑے بڑے سب کارکن گرفتار کر لئے گئے. جیل جانے تک ھملوگوں کو کوئی ایسا خاص موقع بھی نہیں ملا کہ کوئی تیاری کرتے یا لوگوں کو کوئی ھدایت دے سکتے. کانگریس کے

کارکن بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ اب ھمکو کیا کرنا ھے. جنتا کو تو کچھ پتہ ھی نہ تھا کہ اس دفعہ کیا پروگرام رھیگا. ھملوگوں نے سنا کہ گورنمنٹ کے افسروں کا یہ خیال تھا کہ ابکی بار یہ ساری تحریك دو چار دن کے اندر ھی ختم کردی جائیگی. لیکن ایسا نہ ھو سکا. جتنی بھی سختی ھو سکتی تھی خوب کی گئی. گورنمنٹ کی یہ تدبیر تھی کہ اگر کوئی کانگریسی جیل کے باھر رہ بھی جائے، تو اسکے پاس کوئی ایسا سرمایہ نہ رہ جائے جسکے ذریعہ سے وہ کام کو آگے بڑھا سکے. اسطرح کانگریسی لوگوں کو اگر کوئی پیسہ بھی دیتا تو اسکی وجہ سے وہ گرفتار کر لیا جاتا، اگر ان کو اپنے گھر میں پناہ دیتا تو اسے سخت سزا ملتی. یہانتك کہ ان کیلئے کرایہ کی سواریاں بھی ممنوع تھیں. تار و ڈاك کو تو وہ کام میں لا ھی نہیں سکتے تھے. اخباروں میں کوئی خبر بھی حتی الامکان چھپنے نہیں پاتی تھی. دوسرے جتنی بھی اشیاء ان کے کام آسکتی تھیں سبھی سے وہ محروم کر دئے گئے. لیکن جنتا میں سنہ ١٩٣٠ع سے ستیہ گرہ کا اثر باقی تھا. کہ بغیر کسی کے بتائے ھوئے لوگوں نے ستیہ گرہ کے راستے ڈھونڈھ نکالے.

گورنمنٹ کے جو حکم نکلتے تھے وہ اسمیں بہت مدد کرتے تھے. جس بات کو گورنمنٹ منع کرتی تھی، لوگ اسکی مخالفت شروع کردیتے اور ستیہ گرہ شروع ہو جاتی. تحریك کو دو چار دن کے اندر ختم کر دینے کا ارادہ پورا نہ ہوا. مہینوں تك یہ تحریك تیزی سے جاری رہی. لیکن گورنمنٹ جنتا کی کمزوریوں کو پرکھ چکی تھی، جو کمزور مقام تھا اسی پر اس نے چوٹ دی.

سنہ ۱۹۳۰ع کی تحریك ھی میں جبکہ وہ ختم ہونیوالی ھی تھی، ہم نے ایك کمزوری محسوس کی تھی. لوك جیل خانے سے نہیں ڈرتے تھے، لاٹھیاں بھی خوشی سے برداشت کر لیتے تھے، کہیں کہیں گولیوں کا مقابلہ بھی انہوں نے بڑی بہادری سے کیا تھا، لیکن گورنمنٹ جب مال اور جائداد پر قبضہ کرنے لگی اس وقت لوگ کچھ ڈرنے لگے. ہم نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا اور گورنمنٹ نے بھی اس کمزوری کو سمجھ لیا تھا. اسلئے اس دفعہ گرفتاریوں کے بعد لمبی لمبی سزائیں تو ملتی ھی تھیں، لیکن ساتھ ھی ساتھ بڑی بڑی رقموں کے جرمانے بھی ہوتے اور سختی سے وصول ہونے لگے. اگر کوئی اپنی گاڑی، خواہ وہ گھوڑا گاڑی ہوتی یا موٹر، ستیہ گرہ

کے کام میں لگا دیتا تھا تو وہ گاڑی بھی ضبط ہو جاتی. اور اگر کوئی اپنے مکان میں ستیہ گرھی کا کام ہونے دیتا تو وہ بھی ضبط ہو جاتا. جو روپیہ بنکونمیں جمع ہوتا وہ اگر ستیہ گرہ کے کام میں لگایا جاتا، تو وہ بھی قرق کر لیا جاتا اور نکاسی بند کر دی جاتی. اس طرح ان تمام باتوں سے راستہ بند کردیا گیا، کہ ستیہ گرھی نہ کہیں آجا سکے، نہ کسی سے روپیہ لے سکے اور نہ کسی کے گھر میں پناہ پا سکے، نہ کسی طرح کے مال پر کوئی اختیار رکھ سکے نہ کوئی سواری ھی کام میں لا سکے. جسپر ذرا بھی شبہ ہوتا وہ ستیہ گرھی سمجھ لیا جاتا، اسپر سختیاں کی جاتیں. نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ جو ستیہ گرھی تھے وہ تو نہ دبے، لیکن دوسرے لوگوں نے جو خود تو ستیہ گرھی نہ تھے لیکن ان کے ساتھ ہمدردی کیا کرتے تھے یا ان کو مدد دیتے تھے، انمیں دھشت پیدا کر کے ستیہ گرھیوں کو بے بس کردیا. پھر بھی ملک نے لارڈ ولنگڈن کے چیلنج کا اچھا اور شاندار مقابلہ کیا. گورنمنٹ اس تحریک کو بند نہ کر سکی، لیکن ڈیڑھ سال کے بعد یہ تحریک آھستہ آھستہ دھیمی پڑ گئی. اب گورنمنٹ یہ کہنے کے قابل ہو گئی کہ اس نے ملک کی حالت پر پوری طرح قابو پا لیا.

چوبیسواں باب

مہاتماجی نے اپنی آپ بیتی میں بتایا ہے کہ ان کو بچپن ھی سے اچھوت ادھار کے سوال کا پتہ چل گیا تھا. جب انکو پورا علم ھوا کہ یہ برا طریقہ کتنا غیر انسانی اور غیر فطری ہے، تو اس وقت سے انہوں نے اسکے مٹانے کی تدبیر میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی. جب ھندوستان لوٹ کر پبلك کام انہوں نے شروع کیا تو اس وقت سے «اچھوت پن دور کرنا» اپنے پروگرام کا ایك بڑا جز بنا لیا تھا. اس پر جہاں تك ھو سکا زور دیتے رہے، پھر عملی شکل سے اسے دور کرنے میں مصروف رہے. کانگریس کے پروگرام کا یہ ایك بہت بڑا کام ھوگیا تھا. سیٹھ جمنا لال جی نے تو اسکو اپنا ایك فریضہ بنا لیا تھا، کچھ دنوں تك وہ اسی کام میں لگے رہے. سارے ملك میں کانگریس کی تنظیم جیسے جیسے پھیلتی اور مضبوط ھوتی گئی، اچھوت پن دور کرنے پر زور دیا جانے لگا. ھزاروں سال کا جاری اور قائم یہ برا طریقہ ایك بارگی دور نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اسمیں شك نہیں کہ اسکی جڑ

هل گئی.

سیاسی وجوہ سے ہندو مسلم مسئلہ بھی پیچیدہ بنتا گیا. خلافت تحریک کے زمانے میں جو منظر دیکھے گئے وہ تھوڑے دنوں کے بعد تقریباً خواب کے مانند بھول سے گئے. آپس کے فساد بہت بڑھ گئے. اگرچہ دیکھنے کیلئے انکی شکل اور وجہ مذھبی ہوا کرتی تھی. کہیں گائے کی قربانی کیلئے، تو کہیں اینٹ پتھر کا پھینکنا محرم کے تعزیہ پر، کہیں مسجدوں کے سامنے باجے بجانے پر اور کہیں کہیں جلوس نکالنے کیلئے بھی. کہیں تو افرادی جھگڑا عام بلوہ کا سبب بن جاتا تھا. جیسے جیسے قومی تحریک زور پکڑتی گئی، ایسا معلوم ہوا کہ اب کچھ سیاسی اختیارات ہندوستانیوں کے ھاتھ میں آنیوالے ھیں، ویسے ھی یہ تدبیر کی جانے لگی کہ اسکے بٹوارے میں کسطرح زیادہ سے زیادہ حصہ لیا جائے، چاھے اسکے حاصل کرنیکی تدبیر اور قربانی میں حصہ لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو. اس طرح مسلمانوں کی تنظیم ہوئی، جو اپنی طرف سے دعوی پیش کرنے لگی. اچھوت ذاتوں کی بھی تنظیم ہوئی، جس میں اچھوتوں کی طرف سے بھی دعوی پیش ہوا. انگریزی

سرکار کی پالیسی یہی رہی کہ جب تك ہندوستان کی جماعتوں کے لوگ مل کر مطالبہ پیش نہ کریں وہ کچھ نہیں کر سکتی. اگر کچھ کرتی بھی تو اسمیں ایسی شرط لگا دی جاتی جو سارے ملك کیلئے جھگڑے کا سبب بن جاتی. اسی پالیسی کے مطابق پہلے پہل جب منٹو مارلے اسکیم آئی تو اسمیں برائے نام کچھ نمائندے کونسلونمیں لئے گئے. لیکن کسی مسئلہ میں ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اختیار نہیں دیا گیا. اسی کیساتھ مسلمانوں کیلئے حلقہ انتخاب کی ایسی پچڑ لگادی گئی جس سے ملك کے لوگ مسلم اور غیر مسلم دو حصونمیں بانٹ دئے گئے. اور رائے دیکر نمایندہ چننے کا جو تھوڑا بہت اختیار ہندوستانیوں کو ملا وہ ہندوستانی کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلم اور غیر مسلم کی حیثیت سے ملا. اس فیصلہ کی اشاعت کرنیسے قبل مسلمانوں کی ایك جماعت کو ابھار کر اس طرح مطالبہ پیش کرایا گیا. چنانچہ اسی مطالبہ کے جواب میں یہ نفاقی طریقہ اصلاح کے نام سے جاری کیا گیا. لیکن جب اس طرحکی کوئی چیز چل جاتی ھے یعنی جب بیج بویا جاتا ھے تو پھلے بغیر نہیں رہ سکتا. نتیجہ یہ ھوا کہ کچھ دنوں کے بعد

اوروں نے بھی علحدہ حلقہ انتخاب کی مانگ پیش کی، کچھ دوسروں کیلئے بھی الگ حلقۂ انتخاب قائم کئے گئے، جیسے سکھ عیسائی وغیرہ. گول میز کانفرنس میں مہاتماجی کو ایك ایسی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا جو پہلے سے تیار کرکے رکھی گئی تھی.

سنہ ١٩٣٠ع کی پہلی گول میز کانفرنس میں خاصکر اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جو نیا آئین بنے وہ سارے ہندوستان کیلئے بنے. ہندوستان کا ایك وہ حصہ تھا جو انگریزی راج کے نام سے بالکل انگریزی پارلیمنٹ کے ماتحت چلتا تھا. دوسرا وہ حصہ تھا جس میں دیسی رجواڑے انگریزی سلطنت کی ماتحی مانتے ہوئے اپنی اپنی ریاستوں کو اپنے طریقوں سے چلایا کرتے تھے. سوال یہ تھا، کہ دونوں کیلئے ایك آئین بنے، یا صرف انگریزی حصہ کیلئے ھی بنے، اگر دونوں کیلئے بنے تو اسمیں راجواڑوں کا مقام کیا ہو؟ اس کانفرنس میں راجواڑوں کے نمائندے بلائے گئے تھے. جب برٹش سرکار نے سوراج کی لہر سارے دیس میں تیزی سے بڑھتی دیکھی، تو اسکو ایسا معلوم ہوا کہ جہاتنك ہندوستان کے انگریزی حصہ کا تعلق ھے اس میں اختیارات دئے بغیر اب

زیادہ دنوں تک کام نہیں چل سکتا۔ اس وقت اس نے رجواڑوں کو اپنا آلہ کار بنا کر ملک کی حکومت کو اپنے ہاتھونمیں رکھنے کا راستہ سوچا۔ کچھ رجواڑے اس کے آلہ کار بنکر اور کچھ سچ مچ وطن کی محبت سے متاثر ہو کر گول میز کانفرنس میں گئے۔ گول میز کانفرنس میں وہ سارے ملک کیلئے ایک متحدہ آئین کے موافق ہو گئے۔ یہ بات پہلے پہل وہیں پیش ہوئی کہ آئین کی شکل ایک متحدہ ہو، جس میں رجواڑے بھی شریک ہوں۔ چونکہ وہ اپنی اپنی ریاستونمیں اندرونی معاملوں میں زیادہ تر آزاد سمجھے جاتے تھے اسلئے وہ یونین میں شریک ہونے کیلئے شرطیں تلاش کرنے لگے۔ برٹش سرکار دوسری طرف اس فکر میں تھی کہ اگر سارے ہندوستان کی ایک پارلیمنٹ ہو، تو اس میں راجواڑوں کے نمائندے اور برطانوی ہند کے ایسے نمائندے جو قومی تحریک سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں، یا جو کسی نہ کسی سبب سے برٹش سرکار کا ساتھ دینا چاہتے ہیں، دونوں مل کر قومی جماعت کو دبائے رکھ سکیں گے۔ اس طرح سے دیکھنے میں اگرچہ نمائندوں کے ذریعہ سے حکومت ہونے لگے گی

لیکن پھر بھی حقیقت میں اختیار در پردہ انگریزوں کے ھی ھاتھونمیں رھیگا.

سنہ ۱۹۳۱ع میں مہاتماجی دوسری گول میز کانفرنس میں گئے. وھاں انہوں نے قومی مطالبوں کے خلاف ایك دیوار کھڑی دیکھی، جو انگریزوں کی نہیں بلکہ ھندوستانیوں کی تھی اور جسکو انگریزوں ھی نے مدد دیکر تیار کیا تھا. وھاں ھزار کوشش کرنے پر بھی کوئی ایسا راستہ نہ نکل سکا جسکو سبھی ھندوستانی منظور کر لیتے. سب سے بڑھکر مسلمانوں اور اچھوتوں کے لیڈر کانگریس کی مانگ میں شریك نہ ھوئے. کچھ لیڈر ایسے بھی چنکر بلائے گئے تھے جو شریك نہ ھوتے. ھزار کوشش کرنے پر بھی ایك کانگریسی مسلمان وھاں نہیں بلایا گیا. نتیجہ جو ھونیوالا تھا وھی ھوا. آپس کا اختلاف نہ مٹا، مہاتماجی کو اپنی ھار ماننی پڑی. اس حیص و بیص میں اچھوتوں کی طرف سے یہ مانگ پیش کی گئی کہ کونسلونمیں انکے لئے جگہیں محفوظ کردی جائیں اور مسلمانوں کی طرح ان کے بھی نمایندے، الگ حلقۂ انتخاب کے ذریعہ سے، جس میں اچھوت طبقہ کے لوگوں ھی کو امیدوار بننے اور رائے

دینے کا اختیار ہو، قائم کر دئے جائیں.

مہاتماجی چھوت چھات کو ایک گناہ سمجھتے تھے. وہ سماج سے اسے دور کرنیکی سر توڑ کوشش کر رہے تھے. انہوں نے سوچا کہ اچھوتوں کا یہ الگ حلقۂ انتخاب ذات والے ہندوؤں سے ان کو ہمیشہ کیلئے الگ کردیگا، وہ اچھوت ہی رہ جائیں گے. اس لئے اس چیز کو وہ مذہبی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتے تھے. مخالف لوگ تو یہ جانتے تھے کہ سیاسی وجوہ سے اچھوتوں کو ہندؤونمیں ملا کر مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے رکھنا تھا. اس لئے وہ انکو الگ حلقۂ انتخاب دینے کی مخالفت کر رہے تھے. لیکن جو لوگ مہاتماجی کے خیالات سے واقف تھے اور جو ان کی سچائی پر بھروسہ کرتے تھے، ان کے سامنے یہ عیاں تھا کہ اسکو وہ ایک مذہبی سوال سمجھتے تھے اور اسپر مذہبی حیثیت سے غور کرتے تھے، وہ اچھوتوں کو ہندو ذات کا جز مانتے تھے، وہ ان کو بھی اس سماج میں وہی مقام دلانا چاہتے تھے جو دوسری اور ذاتوں کے لوگوں کو حاصل ہے. جب انہوں نے دیکھا کہ الگ حلقۂ انتخاب اس اصلاح کیلئے نقصاندہ ہوگا

اور اچھوتوں کو دوسروں سے سیاست میں بھی الگ کردے گا، اس وقت انہوں نے گول میز کانفرنس میں اعلان کردیا کہ برٹش گورنمنٹ نے اگر اس مطالبہ کو منظور کر لیا تو وہ اسے ہرگز نہ مانیں گے، اور اسمیں اگر ان کو جان بھی دینی پڑی تو اسکی بھی بازی لگا دیں گے۔ اس وقت لوگوں نے اس اہم بیان کا کوئی خاص مطلب نہیں لیا اور نہ اسکو کوئی اہمیت ھی دی۔ اگر اسکی طرف کسی کا دھیان گیا بھی تو اس نے سمجھ لیا کہ یہ محض زبان کا چٹخارہ ھے، اور زوردار الفاظ میں اس مطالبہ کی مخالفت کرنے کا ایک طریقہ، اس سے زیادہ یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن مہاتماجی نے سمجھ بوجھکر ان لفظوں کو کہا تھا، وہ حرف بحرف ان کو پورا کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔

جب آپس میں فرقہ دارانہ مسئلوں پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو وزیر اعظم میکڈانل نے اعلان کردیا کہ اس مسئلے کا فیصلہ وہ خود ھی طے کرینگے۔ کچھ دنوں کے بعد وزیر اعظم نے اپنا فیصلہ دیدیا۔ اس میں ایک بات یہ تھی کہ پست اقوام کیلئے کونسلونمیں صرف جگہیں ھی نہیں محفوظ کی جائینگی بلکہ

ان کیلئے ایک حلقۂ انتخاب بھی قائم کیا جائیگا. اور ان حلقونمیں صرف پست اقوام ھی کے لوگ ھی امیدوار بن سکیں گے اور رائے دے سکیں گے. یہ فیصلہ وزیر اعظم میکڈانل کے اوارڈ[1] یعنی پنچایتی فیصلہ کے نام سے مشہور ہوا، لیکن حقیقت میں یہ پنچایتی فیصلہ نہیں تھا. کیونکہ پنچایتی فیصلہ وھی دے سکتا ھے جسکو مدعی اور مدعی علیہ نے خوشی سے پنچ بنایا ہو. لیکن شری رمزے میکڈانل کو ہندوستان کے مختلف الخیال جماعتوں کے نیتاؤں نے اور خاصکر گاندھی جی نے، جو ملك کی سب سے بڑی عوامی جماعت یعنی کانگریس کے نمایندے تھے، کبھی پنچایت کی موافقت نہیں کی تھی. وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ جو چاھیں فیصلہ دے دیں، اس کا ان کو اختیار تھا. انکا یہ فیصلہ اسی قسم کا تھا. پنچایتی فیصلے، اور کسی حاکم کے فیصلہ میں جو فرق ھے، اسکو یاد رکھنا ضروری ھے. حاکم کے فیصلے کو ماننے کیلئے کوئی فریق مجبور نہیں ھے. اگر وہ کسی طرح سے اسے

---

١ — انگریزی لفظ "Award" کے لفظی معنی حکم دینے کے ھیں لیکن اصطلاح میں پنچ کے آخری فیصلہ کو «اوارڈ» (Award) کہتے ھیں.

توڑوا سکے، بدلوا سکے یا رد کروا سکے. تو اسمیں کوئی سیاسی نقص نہیں مانا جاتا. اسلئے دونوں فریقوں کو حاکم کے فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق قانونی طور پر دیا گیا ھے. لیکن پنچ تو سبھی فریقوں کی مرضی سے مقرر کیا جاتا ھے. سیاسی حیثیت سے اس کے فیصلے کو ماننا سب فریقوں کیلئے واجب اور مناسب ھوتا ھے. اسلئے قانون میں بھی پنچ کے خلاف اپیل نہ ھوگی، جب تک یہ صاف ثابت نہ ھو جائے کہ پنچوں نے بے ایمانی کی ھے یا اپنے اختیار سے باھر ھو کر اس بات کا فیصلہ کیا ھے جو پنچایت میں پیش نہیں ھوئی تھی. یہ اتنا کہنا اسلئے ضروری ھو گیا کہ آئندہ چل کر جب گاندھی جی نے اس فیصلہ کی مخالفت کی تو سیاسی حیثیت سے اسمیں کوئی خرابی کی بات نہیں تھی. اس فیصلہ کو پنچ کا فیصلہ کہنا ھی غلط تھا کیونکہ انہوں نے کبھی پنچایت مانی ھی نہیں تھی.

خیر اس فیصلے میں، جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، پست اقوام کیلئے علحــدہ حلقہ انتخاب قرار دیا گیا، جس کے خلاف. جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ھے. مہاتماجی نے جان کی بازی لگا کر لڑائی کیلئے گول میز کانفرنس ھی میں کہہ دیا تھا.

فیصلہ میں ایك بات یہ بھی تھی کہ سارے فریق، جن کا اس کے کسی جز سے تعلق تھا. اگر ایك رائے ہوکر اسکو بدلوانا چاھیں گے تو وہ بدلا بھی جا سکتا ھے. یرودا جیل میں جب مہاتماجی کو اخباروں سے فیصلہ کی خبر ملی، تو انہوں نے گورنمنٹ کو لکھا کہ اچھوتوں کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا ھے اس کا یہ جز بدلنا چاھئے، اور گورنمنٹ اگر اسپر راضی نہ ہوگی تو ان کو اپنی جان کی بازی لگاکر اسکی مخالفت کرنی پڑی گی. گورنمنٹ نے اس بات پر دھیان نہ دیا. کافی خط و کتابت کے بعد جیل کے اندر ھی انہوں نے اعلان کردیا کہ جب تك وہ حصہ بدلا نہیں جائیگا وہ اس وقت تك روزہ رکھیں گے. روزہ شروع کرنیکی تاریخ کا بھی انہوں نے اعلان کردیا اور مقررہ تاریخ پر روزہ شروع بھی کردیا. اس خبر کے پھیلتے ھی سارے ملك میں ھاچل مچ گئی. پنڈت مدن موھن مالوی، شری راجگوپال اچاری بڑے بڑے نیتاؤں نے بمبئی میں ایك کانفرنس طلب کی. اس میں پست اقوام کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر اور دوسروں کو بھی بلایا گیا. سارے ملك کے بڑے بڑے کانگریسی کارکن، جو اس وقت جیل کے باھر

تھے۔ کانفرنس میں شریک ہونیکے لئے بمبئی پہونچگئے۔

اس وقت سوال یہ تھا کہ پست اقوام کے لیڈر سے مل کر کوئی ایسی بات طے کی جائے جسے مہاتما گاندھی جی منظور کر لیں، اور اسی کے اعتبار سے شری میکڈانل کا فیصلہ بدلوایا جائے اور مہاتما جی روزہ توڑ دیں۔ یہ امید تھی کہ شرط پوری ہو جانے پر وہ اپنا روزہ توڑ دینگے۔ لیکن شرط کے پورے ہونے میں بہت دشواری دکھائی دیتی تھی۔ کئی دن بمبئی میں باتیں ہوتی رہیں، اسکے بعد یہ سوچا گیا کہ پونا ھی میں چل کر گفتگو کرنی مناسب ہوگی، اور جہاں مہاتما جی سے ملنے کا بھی موقع رهیگا اور ساری باتیں انسے پوچھی جا سکیں گی۔ گورنمنٹ نے بھی ان سے ملنے کی اجازت بڑے لوگوں کو دیدی۔ اسکے علاوہ دوسرے قسم کی آسانیاں بھی مل گئیں۔ کئی دن تک گفتگو کے بعد ایک راستہ نکلا، علحدہ حلقۂ انتخاب کو چھوڑ دینے کیلئے ڈاکٹر امبیدکر راضی ہو گئے۔ لیکن انہوں نے دو شرطیں لگائیں۔ ایک یہ کہ علحدہ حلقۂ انتخاب نہ ہونیکی صورت میں ان کیلئے کونسلوںمیں ان کی تعداد کے اعتبار سے جگہیں محفوظ ہونی چاہئیں۔ دوسری یہ کہ دس

سال کیلئے یہ مان لینا چاھئے کہ آخری انتخاب اگرچہ سب مل کر کرینگے، لیکن پھر بھی ھر ایک جگہ کیلئے چار امیدواروں کو پست اقوام کے لوگ ھی چنکر انکا نام دیں، اب انہیں میں سے ایک کو سب مل کر منتخب کریں. کئی دن تک صبح و شام مہاتماجی سے باتیں ھوتی رھیں:

مہاتماجی چارپائی پر لیٹے لیٹے آم کے درخت کے نیچے بات کرتے رھے. سبلوگ، جو جیل کے اندر جاتے، چارپائی کے چاروں طرف بیٹھکر یا کھڑے ھوکر انکی باتیں سنا کرتے. اس وقت جس صبر و تحمل کے ساتھ وہ باتیں کرتے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا. ساتھ ھی ان کے ھر ایک لفظ سے یہ ٹپکتا تھا کہ اپنے اس روزے سے وہ ذات والے ھندوؤں کیلئے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاھتے تھے، بلکہ ان کو پست اقوام کی حالت کے متعلق ھی فکر تھی. وہ چاھتے تھے کہ چھوت چھات جلد سے جلد جڑ سے جاتی رھے. لیکن الگ حلقۂ انتخاب کے ذریعہ وہ مستقل بن جاتی تھی. انہیں باتوں کو انھوں نے کئی بار بہت ھی زور سے اور دردناک لفظونمیں ڈاکٹر امبیدکر سے کہا. آخر میں وہ بھی پگھل گئے

اور سمجھوتہ ہو گیا. اسکے لئے مہاتماجی روزانہ گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انمیں ایك عجیب قوت آگئی ھے، جو روزے کے دنونمیں انکو اس قابل بنا دیتی ھے کہ وہ گھنٹوں بڑے بڑے مسائل پر بھی باتیں کرتے رہیں. لیکن پھر بھی جسمانی کمزوری تو دن بدن بڑھتی ھی جاتی تھی، جسکا پتہ ان کی اس آواز سے لگتا تھا جو دھیمی ہوتی جا رہی تھی. اس سمجھوتے سے پست اقوام کو ایك بڑا نفع یہ ہوا کہ ان کو جتنی جگہیں شری میکڈانل کے فیصلہ سے ملی تھیں اس سے کہیں زیادہ مل گئیں. شری امرت لال ٹھپکر نے، جو اس مسئلہ میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے، انکی تعداد نکال کر بتادی کہ ان کو کتنی جگہیں ملنی چاھئیں. سمجھوتہ ہوتے ھی گورنمنٹ کو اطلاع کردی گئی. اس نے تمام باتیں تاروں کے ذریعہ وزیر اعظم میکڈانل کو بھیج دیں. وھاں سے چند گنھٹوں کے اندر ھی جواب آ گیا کہ انہوں نے اپنے فیصلے کا وہ حصہ، جسکے متعلق مہاتماجی نے روزہ رکھا تھا، رد کردیا، اور اسکی جگہ یہ سمجھوتہ مان لیا. یہ اطلاع گورنمنٹ نے جیل میں پہونچا دی. اس وقت مہاتماجی نے

اپنا روزہ ختم کیا. آپس کی اس گفتگو میں تمام شریك ہونیوالے، روزہ ختم ہونیکے وقت پونا میں موجود تھے. ان کے علاوہ «کوندر رونڈ» ٹھیك اسی وقت پونا پہونچگئے. اس قربانی میں انہوں نے بھی حصہ لیا. مہاتماجی نے اپنے تمام روزوں کو ایشور کا نام لیکر ھی شروع اور اسی کی عبادت کے ساتھ ختم کیا. اس موقع پر بھی ایسا ھی ھوا. اسکی عمدہ تفصیلات «کوندر روند» نے اسی وقت لکھی تھیں.

اس وقت اس سمجھوتے میں ایك شرط یہ بھی تھی کہ ذات والے ھندو اچھوت پن دور کرنے کی تدبیر کرینگے، اور پست اقوام کو ترقی دینے میں معاون ھونگے. سمجھوتہ ھوجانے پر ھم سب پونا سے بمبئی آئے اور وھاں ھریجن سیوك سنگھ کی بنیاد ڈالی، جو اسوقت سے آجتك اسی کام میں لگی ھوئی ھے. مہاتماجی نے جیل سے ھی اچھوت سدھار کے متعلق مضمون لکھنے شروع کئے. گورنمنٹ نے بھی ان مضمونوں کو نہیں روکا. جو لوگ باھر رہ گئے تھے انہوں نے پورے جوش سے چھوت چھات دور کرنے کا کام شروع کیا. صرف «ھریجن سیوك سنگھ» کی بنیاد ھی نہیں پڑی، بلکہ سبھی جگہوں

پر اس بات کی کوشش بھی پوری قوت سے کی جانے لگی. که اچھوت پن دور کرنے کے لئے کون سی عملی صورت اختیار کی جائے. ایك کوشش اس تدبیر کی یه هوئی که جن مندروں اور شوالوں میں اچھوت لوگ درشن اور پوجا کے لئے نہیں جانے پاتے تھے، وہ ان کے لئے کھول دیئے گئے اور وهاں انہیں درشن اور پوجا کی آسانیاں دی جانے لگیں. اس کے پہلے کئی جگھوں پر ایسی تدابیر کی گئی تھیں. کئی جگه اس کے لئے ستیه گره بھی هوئی. اب همارے پروگرام میں بہت قوت پیدا هوگئی تھی اور کام زور سے چلنے لگا. کچھ دنوں بعد مہاتماجی نے یرودا جیل هی میں اسکے متعلق اکیس دن کا روزہ رکھا تھا، جو کفارے هی کی شکل میں تھا. میں اس وقت هزاری باغ جیل میں تھا، وهاں پر یه اطلاع پا کر کئی آدمیوں نے اکیس دن تك صرف پھل کھائے، کہیں کہیں کچھ لوگوں نے تو روزہ بھی رکھا. یه ایك ایسا اچھا موقع تھا، جو سارے ملك کو خاصکر هندو جات کو اچھوت کے سوال پر سوچنے کا اور اس طریق کار کے متعلق فرض پورا کرنے کا موقع ملا. اس روزے میں مہاتماجی نے اس مسئله کے حل

کرنے کو سماجی مسئلہ کی سطح سے اٹھا کر ایک مذھبی عھد کی سطح پہونچا دیا. اسی کا نتیجہ یہ ھوا کہ سارے ھندو سماج میں اس سے ھلچل مچگئی. نتیجہ یہ ھوا کہ آج اچھوت پن اپنے قلعہ کے ایک ایک کونے سے نکلا جا رہا ھے.

مہاتماجی نے جیل سے لکھنا جاری رکھا. اسمیں جب کوئی مشکل اور رکاوٹ پیدا ھونے لگتی تو وہ پھر روزہ رکھ لیا کرتے. جسکا اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ گورنمنٹ نے مجبور ھوکر ان کو چھوڑ دیا. جیل سے نکلنے پر انھوں نے کسی سیاسی کام میں ھاتھ نہیں ڈالا. وہ اپنے خیال سے ابھی جیل ھی میں تھے. جو کچھ وہ جیل سے کر سکتے تھے، سیاسی حیثیت سے اسی قدر انھوں نے کرنا مناسب سمجھا. کیونکہ ان کو اچھوت پن دور کرنے کے متعلق کام کرنیکی اجازت جیل میں بھی تھی، اسلئے انھوں نے جیل سے باھر آنے کے بعد بھی اسکو پوری قوت سے چلایا. اپنے اخبار میں مضمون لکھنے کے علاوہ انھوں نے ملک کا دورہ بھی کرنا شروع کیا. ستیہ گرہ کی تحریک آھستہ آھستہ دھیمی پڑنے لگی. پھر مہاتماجی کو کوئی ایسا اشارہ ملا کہ اب اسکو زیادہ چلانا

مناسب نه تها. آخر میں پہلی تحریك ملتوی کردی گئی.
لیکن وہ پہلے هی کی طرح سے سواری، موٹر، اور ریل پر دورہ کرتے رهے. اس دورے میں اهوں نے ملك کے مختلف صوبوںمیں اچھوت پن دور کرنے کی باتیں بتائیں. سناتن دهرم خیال کے هندوؤں نے ان کی بہت مخالفت کی، کچھ پنڈت عالموں نے شاستروں کے ذریعه ان کی تائید بهی کی، کہیں کہیں دونوں فریقوں کے شاستری مقابلے بهی هوئے. ایك طرح سے هندو سماج میں هل چل مچگئی. اسی وجه سے خفا هوکر پونا میں کچھ لوگوں نے مہاتماجی پر، جبکه وہ ایك جلسے میں جا رهے تهے، زهریلا بم پهینکا، لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ گئے. ان کے دورے میں مہاسبهائیوں نے بہت رکاوٹ ڈالی. چنانچه وہ جہاں جاتے، وهیں وہ ستیه گرہ کرتے، یعنی ان کو جلسے سے روکنے کی تدبیر کرتے. اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے انتظام کرنیوالے لوگ بہت سی تدبیریں کرتے، لیکن وہ مہربان پیچھا نه چهوڑتے تهے. پونا کے علاوہ اور کئی جگہوں پر بهی مہاتماجی پر حملے کئے گئے. کہیں کہیں معمولی چوٹ بهی آئی. لیکن وہ اپنے عہد پر قائم رهے اور دورہ

کرتے ھی رھے. آخر میں انہوں نے اڑیسہ پہونچکر یہ ارادہ کیا کہ پیدل ھی دورہ کرنا چاھئے، اس لئے وہ کچھ دنوں تک صوبہ میں پیدل ھی دورہ کرتے رھے. صوبہ کے ایك بڑے حصہ میں اسی طرح وہ پیدل پھرے.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، اس زبردست تدبیر سے چھوت چھات کے قلعہ کی دیواریں ٹوٹنے لگیں. اگرچہ آج بھی یہ کہنا صحیح نہ ھوگا کہ چھوت چھات اٹھ گئی. لیکن پھر بھی یہ کہنے کے مستحق ھیں کہ جیسے ایك پودا جڑ سے ھلا دیا جائے اور اکھاڑ کر نہ پھینکا جائے، پھر بھی وہ سوکھنے لگتا ھے، اسکا ایك ایك پتہ سوکھتا جاتا ھے، اسکی ٹہنیاں سوکھتی جاتی ھیں، آخر میں وہ مرجھا جاتا ھے. اسی طرح سے چھوت چھات کی جڑ ھل گئی، اسکی پتیاں اور ٹہنیاں سوکھتی جا رھی تھیں، اسکی جڑونمیں یہ طاقت نہیں ھے کہ زمین، آسمان اور پانی سے اپنے تئیں قائم رکھنے کیلئے پرورش کے قابل چیزیں لے سکے. اور جب پودا ان پرورش دینے والی چیزوں سے محروم ھو جاتا ھے تو اکثر اسے سوکھنا ھی پڑتا ھے. اسی طرح اس برے طریقہ کو اب مرجانا ھی ھے.

کیونکه یه برا دستور محض ایك پودا هی نہیں ھے. بلکه هزاروں سال کا پالا پوسا هوا ایك بہت بڑا درخت ھے، جس نے بہت دور تك گہرائی میں اپنی جڑوں کو پھیلا رکھا ھے. اسلئے اسکے هل جانے کے بعد بھی اس کے دفعتاً سوکھ جانے میں ابھی وقت لگےگا. اسکی موجودہ حالت اس بڑے درخت کی ھے جو بڑے طوفانمیں اکھڑ کر گر جاتا ھے. لیکن گر جانے کے بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ تعلق زمین کے ساتھ رہ جانیکی وجه سے وہ هرا رهتا ھے پھر بھی اسمیں حقیقی جان نہیں رہ جاتی. اسیطرح یه درخت گر گیا ھے لیکن ابھی بے جان نہیں هوا.

مہاتماجی اس مسئله کو مذهبی مسئله کی شکل میں دیکھتے تھے. لیکن ساتھ هی پست اقوام کی غیر مذهبی حالت کو بھی وہ بھولے نہیں تھے. وہ چاهتے تھے که ان کی مالی حالت بھی سدھرے. انمیں اور دوسرے هریجنوں میں اس مسئله میں کچھ اختلاف بھی تھا. کچھ هریجنوں کا، خاصکر جدید تعلیم یافته لوگوں کا، اور جو صرف مالی ترازو پر هی سب کچھ تولنا جانتے هیں، یه خیال تھا که اگر ان کی سیاسی اور مالی حالت

سدھار دی جائے، تو سماج میں ان کا جو مناسب مقام ھے وہ ان کو خود بخود مل جائیگا. اس لئے وہ لوگ مندروں اور دیولوں کو کھلوانے کی کوششوں کو اتنی اھمیت نہیں دیتے جتنی مہاتماجی دیتے تھے. ان لوگوں کا خیال تھا کہ مندروں کی بجائے ھریجنوں کیلئے اسکول کھلوانے، زیادہ نوکریاں دلوانی، اور دوسری طرح سے مالی حالت سدھارنی زیادہ ضروری ھے. لیکن مہاتماجی ان مسئلوں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں رکھتے تھے. اچھوتوں کو سماج میں دوسرے ھندوؤں کے برابر مقام دلوانا، اور مذھبی معاملات میں وہ ان کی ترقی بھی، اتنی ضروری سمجھتے تھے. اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے خیال میں انسانی رشتے سے کسی بھی انسان کو اچھوت ماننا، یا اسے دیو درشن کا اختیار نہ دینا، اچھوتوں کے باریمیں اور جو اچھوت پن مانتے ھیں ان کیلئے بھی، پاپ ھے. اس لئے جب تک سماج اس گناہ سے نجات نہیں پا جائیگی اس وقت تک اسکی حالت بھی نہیں سدھر سکتی. ھریجن اس سماج کے جز ھیں، ھریجن کو جتنا سدھارنا چاھئے اتنا نہیں سدھارا جا سکتا. مہاتماجی اپنے کام میں لگے رھے. جس طرح انہوں نے سناتن دھرمیوں کی مخالفت کی پرواہ نہ کی ویسے ھی

هریجنوں کی مخالفت سے بھی وہ اپنے خیالات سے پیچھے نہیں ہٹے. اب تو سارا ملک یہاں تک ایک رائے پر پہونچگیا ھے کہ اس وقت کے آئین نے اچھوت پن کو ایک قصور یا جرم قرار دیدیا ھے، اور حکومت کا یہ فرض بتایا ھے کہ وہ اچھوت پن کو فنا کردے.

اس کے علاوہ پست اقوام کی ترقی کیلئے اس خاص وزیر پر یہ بوجھ ڈالا جائیگا جو اس مسئلہ پر غور کرے گا. اور اس کا یہ فرض ھوگا کہ وہ ان قاعدوں اور قانونوں کی پابندی کرائے جو اچھوت پن دور کرنے کیلئے بنائے جائیں گے. وہ ہر حیثیت سے سبھی ذاتوں کی تعلیم اور ہر ایک حیثیت سے ان کی ترقی کیلئے ہمیشہ دورہ کرتا رھیگا. دس سال کے بعد ایک کمیشن بنےگا جو ان کی اور دوسری پست ذاتوں کی حالت کی جانچ کرکے حکومت صدر کے سامنے سبھی باتوں کی رپورٹ پیش کریگا. اور وہ رپورٹ پارلیمنٹ میں غور کرنے کیلئے پیش کی جائیگی. پھر ان سبلوگوں کیلئے، جن کیواسطے علحدہ حلقۂ انتخاب اور کونسلونمیں مقررہ جگہیں محفوظ رکھی گئی ھیں، نئے قانونوں میں وہ سب باتیں منسوخ کردی جائینگی.

اچھوت طبقه اور دوسری پست اقوام کیلئے ابھی دس برس تك جگہیں محفوظ رکھی جائینگی. اس طرح نئے آئین میں اور لوگوں کے برابر لانے کیلئے، انکو جہانتك آئین وقاعدے سے ہو سکتا ھے، کوشش کی گئی ھے. گورنمنٹ کوئی بھی ہو اور خواہ کسی جماعت کی ہو، اسکو آئینی قاعدوں کے مطابق ھی کام کرنا ھوگا. اسمیں شك نہیں که جو کچھ اچھوت پن رہ گیا ھے اسکو دور کرنے میں، اور پست ذاتوں کو دوسروں کے برابر لانے میں، یه قاعدے بہت کام دیں گے. لیکن نئے آئین اور آئندہ کیلئے ھی یه پروگرام نہیں بنا ھے. جو کچھ پچھلے کئی سال سے ہو رہا ھے اور جن کے مطابق کانگریسی سرکاریں کام کرتی چلی آ رھی ھیں، انہیں باتوں کو نئے آئین میں ایك مکمل روپ دینے کی تدبیر کی گئی ھے. جب سے مہاتماجی نے زور لگایا اسی وقت سے سبھی کانگریسی، جنکا کسی جگه اس سے کچھ بھی تعلق ہوا ھے، اس کے دور کرنےکی تدبیر میں لگے ہوئے ھیں. نتیجتاً کئی صوبوںمیں خاصکر جنوب میں، جہاں یه سوال بہت ھی سخت اور خوفناك شکل اختیار کئے ہوا تھا، قانون کے ذریعه مندروں اور شوالوں میں ہریجنوں

کا داخلہ کرا دیا، اس کیلئے قانون بھی بن گئے. ان کیلئے
سبھی مقامات پر مخصوص وظیفہ دیکر اسکول کھول کر اور
دوسرے طریقوں سے بھی تعلیم کیلئے ہمت افزائی کی جا رہی
تھی، ان کو نوکریاں بھی دی جا رہی تھیں. اگرچہ ابھی
تعلیم کی کمی کی وجہ سے سب جگہوں کیلئے ان میں سے قابل
امیدوار نہیں ملتے، اور جتنی جگہیں انہیں ملنی چاھئے تھیں ابھی
نہیں ملی ھیں. سنہ ۱۹۳۷ع ھی میں جب کانگریس پہلے پہل
کئی صوبوںمیں وزارت بنا سکی تو ھریجن وزیر بھی مقرر
ہوئے. اور اس وقت بھی تقریبا سب صوبوںمیں ھیں، مرکز
میں تو ایسے دو وزیر ھیں. اس طرح بہت تیزی کیساتھ فضا
قائم ھو رھی ھے. اور جو فضا ھزاروں برس تک مشہور
رھی وہ اب آھستہ آھستہ ختم ھوتی جا رھی ھے. اسمیں شک
نہیں کہ اس برے دستور کا میدان ھی نیست و نابود ھو جائیگا.

پچیسواں باب

جب سنہ ۱۹۳۰ع میں مہاتماجی سابرمتی آشرم میں نمک کا قانون توڑنے کی خاطر ستیہ گرہ شروع کرنے کیلئے ڈانڈی جانے کو نکلے تھے، اسوقت انہوں نے کہا تھا کہ وہ آشرم میں سوراج لیکر ھی لوٹیں گے. یہ بات مضبوط ارادے کیساتھ انہوں نے کہی تھی. اس کا ایک ثبوت ھمکو اس وقت ملا جب اسکا استعمال انہوں نے وزیر اعظم میکڈانل کے فرقہ وارانہ فیصلے کے بدلوانے کے سلسلے میں کیا تھا. جو ھریجنوں کے علحدہ حلقۂ انتخاب کے متعلق تھا. اس وقت ان کی بات پر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی. اور نہ کسی نے یہ سوچا تھا کہ اس ڈانڈی جاترہ میں اگر وہ سوراج حاصل نہ کر سکے، تو اس کا نتیجہ یہ ھوگا کہ وہ اس آشرم کو، جسے انہوں نے کتنی محنت اور امید کے ساتھ بنایا تھا اور جہاں انہوں نے اپنے نمونے کے بہترین خادم تیار کرنیکی تدبیر کی تھی، وہ ھمیشہ کیلئے چھوڑ دیں گے. لیکن وہ جب اس طرحکی باتیں کہتے تھے وہ سوچ بچار کے بغیر نہیں کہتے تھے.

ایک بار کسی بات کے کہدینے پر اسے وہ کبھی نہیں بھولتے، بلکہ وہ اسکو پورا کر کے ھی چھوڑتے تھے. اس لئے جب سنہ ۱۹۳۱ع کے شروع میں وہ جیل سے نکلے تو برابر ادھر ادھر سفر ھی کرتے رھے. اسکے بعد گول میز کانفرنس سے واپسی پر جیل میں پھر بند کر دئے گئے. جیل سے نکل کر وہ ھریجن خدمت اور بہار کے قحط زدوں کی مدد کیلئے سفر کرتے رھے. بہار میں کچھ دنوں تک ٹھہرے بھی اور سابرمتی نہیں گئے. سابرمتی کی ایک شاخ وردھا میں کئی سال سے شری ونوباجی کی نگرانی میں چل رھی تھی، مہاتماجی ھر سال وھاں کچھ دنوں کیلئے جا کر ٹھہرا کرتے تھے. جب ھریجن جاترہ ختم ھوئی تو انہوں نے وردھا میں جا کر رھنے کا ارادہ کیا. کچھ دنوں وردھا میں سیٹھ جمنا لال بزاز کے باغ میں ٹھہرے رھے. وھیں پر گاؤں سدھار سنگھ کی بنیاد ڈالی اور چرخہ سنگھ کے کام کا طریقہ بہت کچھ بدل دیا. سنہ ۱۹۳٤ع سنہ ۱۹٤۲ع تک وردھا یا وھاں سے چار میل «سے گاؤں» میں رہ کر انہوں نے کامیابی سے کام کو بہت بڑھایا. «سے گاؤں» ایک چھوٹا سا گاؤں ھے جسمیں سیٹھ جمنا لال جی کا بھی حصہ تھا. اسی سے

« سے گاؤں » کا نام بعد میں سیوا گرام پڑ گیا. جو آج دنیا میں مشہور ھے. یہ چار سال کا زمانہ خاصکر تعمیری کام میں ھی لگایا گیا. اس پروگرام میں ایك ایك مسئلہ کو لیکر انہوں نے ملك کو راستہ دکھایا.

ھریجن سیوك سنگھ کا ذکر اوپر آ چکا ھے. اس کے سکریٹری شری ٹھکر بابا اور اسکے صدر سیٹھ گھن شیام داس برلا تھے. اور اسکا صدر دفتر دھلی میں قائم ھوا اور آج بھی وھیں ھے، لیکن سارے کام کی ھدایت مہاتما جی سے اسے ملتی رھی. مہاتما جی نے اسے اپنا ایك دستور بنا لیا تھا. اور جہاں کہیں وہ جاتے اور رھتے ھریجنوں کیلئے چندہ جمع کرتے. اسکے لئے انہوں نے کئی طریقے نکالے تھے. جب کبھی وہ سفر میں جاتے تو ان کے درشنوں کیلئے جو بھیڑ ھوتی، اس سے ھاتھ بڑھا کر چندہ مانگتے. ریل کے اسٹیشنوں پر جہاں گاڑی کھڑی ھوتی تو لوگ جمع ھی ھو جاتے تھے. بس مہاتما جی کا ھاتھ ڈبہ کے باھر نکل آتا، لوگ چندہ دینے لگتے. شام کے وقت برابر پرارتھنا کیا کرتے تھے جسمیں سبلوگ موجود ھوتے تھے اور بڑا مجمع ھوتا تھا،

اس موقع پر بھی وہ چندہ جمع کرتے. کچھ دنوں سے دستخط لینے کا دستور ہو گیا تھا. بہت سے لوگ بڑے بڑے لوگوں سے دستخط لینا چاہتے ہیں. مہاتما جی نے قاعدہ بنا لیا تھا کہ وہ پانچروپے لئے بغیر اپنے دستخط کسی کو نہ دیں گے. اس سے دستخطوں کی مانگ تو کم ہو گئی لیکن پھر بھی اس سے کچھ نہ کچھ چندہ آ ہی جاتا تھا. ان کو بھی یہ نہیں کہنا پڑتا تھا کہ وہ تھوڑے لوگوں کو دستخط دینگے، سب کو نہیں دینگے. جو کوئی فیس داخل کر دیتا اسکو دستخط مل جاتے. جو نہیں داخل کرتا وہ چاہے کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اسکو دستخط نہیں ملتے. مالدار لوگ پانچروپے کے بجائے بہت رقم دیکر دستخط لے لیتے. ان طریقوں سے وہ سال بھر میں بڑی اچھی رقم جمع کر لیتے تھے جو ہریجن سیوک سنگھ کو دے دیا کرتے. ہریجن نام کا ہفتہ وار اخبار انگریزی اور تھوڑا بہت نام بدل کر ہندی، گجراتی، مرھٹی، بنگالی اور اردو میں برابر نکلتا رہا. ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہریجن میں خود بہت لکھا کرتے اور جو کچھ دوسرے لوگ لکھتے تھے وہ بھی بغیر اچھی طرح

جانچ کئے ہوئے چھاپا نہیں جاتا تھا.

کھادی کے کام میں وردھا میں بیٹھکر ایک نئی حقیقت کا پتہ چلا. جب انہوں نے تلاش کر کے چرخہ نکلوایا اور اسکو سابرمتی آشرم میں چلوانا شروع کیا. تو ملک کی حالت یہ تھی کہ بہت سی جگہوں پر چرخے چلتے تھے، جنکے ذریعہ تیار کئے ہوئے سوتوں سے بہت سی قسم کے کپڑے بنا کرتے تھے. بہت سی جگہونمیں تو موٹے ہی سوت نکلا کرتے تھے، جن سے موٹے کپڑے ہی تیار ہوا کرتے تھے. پنجاب کے بہت سے گھرونمیں چرخے چلا کرتے تھے، لیکن سوت زیادہ‌تر کھیس جیسی اشیاء کے بننے ہی میں خرچ ہوتا تھا. راجپوتانہ میں بھی زیادہ‌تر موٹا کپڑا ہی بنا جاتا تھا. لیکن کہیں کہیں باریک سوت بھی ہوتا تھا. جیسے آندرہ میں. وہاں کے باریک سوت کا کپڑا بہت ہی مشہور تھا. اسی طرح بہار میں ایک خاص قسم کی روئی ہوا کرتی تھی جسکا رنگ بہت ہی اچھا ہوتا تھا. اس سے بہت باریک سوت کات کر بہت ہی ملائم اور خوش رنگ کپڑا بنا جاتا تھا، جسے وہاں «کوکٹی» کہتے تھے. نیپال میں کوکٹی کی بہت عزت تھی،

خاصکر نیپال راج سے ملے ہوئے ضلع دربھنگہ میں کوکٹی بہت بنی جاتی تھی. نیپال کی ہمت افزائی سے یہ کپڑا چلتا رہا. لیکن اس سب کے باوجود یہ کہنا مبالغہ نہیں ھے کہ چرخہ تقریباً غائب ہو چکا تھا اور روز بروز غائب ہوتا چلا جا رہا تھا. کارگاھوں کی حالت اتنی گری ہوئی نہیں تھی. اگرچہ وہ بھی کم ہوتے جا رہے تھے. بہار میں گورنمنٹ نے سنہ ۱۹۲۱ع کی مردم شماری کیساتھ کارگاہ کا بھی حساب لگایا، جس سے یہ پتہ چلا کہ صوبہ بہار میں تقریباً پانچ کروڑ روپے کا کپڑا کارگاھوں پر بنا جاتا ھے، لیکن سوت زیادہ تر مل کا ھی ہوا کرتا تھا. اس طرح دوسرے صوبوںمیں بھی کارگاھوں پر بہت کپڑا بنا جاتا تھا. اندازہ یہ ھے کہ اس وقت جتنا کپڑا ملك میں تیار ہوتا تھا اس کا ایك چوتھائی سے ایك تہائی تك ھاتھ کے کارگاھوں پر ھی تیار ہوا کرتا تھا. مہاتما جی نے دیکھا کہ اگر چرخہ کی ہمت افزائی نہ کی گئی تو ایك وقت ایسا آئے گا کہ کرگے بھی بند ہو جائینگے. کیونکہ کارخانوں کو سوت تیار کرکے کپڑے بن لینے میں زیادہ نفع تھا. صرف سوت کی کتائی میں اتنا نفع نہیں تھا، اسلئے ضرور وہ صرف سوت کی کتائی کم

کر دینگے، اور کتائی بنائی دونوں کرنے لگیں گے. اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہاتھ کے کرگوں کیلئے ملوں سے سوت ملنا کم ہوتا جائیگا جو آخر میں بند ہو جائیگا. اسلئے انہوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ کرگوں کو بھی اگر زندہ رکھنا ھے تو پھر سے چرخہ چلانا ضروری ھے. اس وقت کہیں کہیں جو سودیشی کی ہمت افزائی کرنیوالے لوگ تھے وہ کارگاہ ھی پر زور دیا کرتے تھے.

جب سے چرخے کا کام شروع کیا گیا اس وقت سے کام کرنیوالوں کی یہ کوشش رھی کہ جتنا اچھا اور باریك کپڑا بنا جا سکے، بنا جائے. یہ بھی طے کیا گیا کہ جہاں پیداوار کے مرکز کھولے جائیں وہاں اس بات کی کوشش کی جائے کہ کم خرچ میں اعلی سے اعلی کپڑے تیار کئے جائیں. مگر اس میں دقت یہ تھی کہ وہاں چرخے تو چلتے تھے لیکن روئی کی کمی تھی اسلئے ویسی روئی وہاں دور سے لائی جا کر سوت کاتنے والیوں کو دی جاتی تھی. کہیں کہیں وہ روئی وھیں خرید لی جاتی اور سوت کے دام دیکر بیچی جاتی تھی. اور کسی کسی جگہ سوت اور روئی کا باہم تبادلہ ہوتا، جسمیں سوت کے ڈیڑھ گنے یا پونے دو گنے کے حساب سے سوت کی باریکی

پر روئی دی جاتی. جو روئی زیادہ ہوتی وہ انکو مزدوری میں دے دی جاتی. میں کئی مرکز پیداوار پر جا کر دیکھا کرتا اور خود روئی تولا کرتا. غریب کاتنے والیوں کی بھیڑ لگی رہتی اور وہ دور دور سے آکر سوت بیچ جایا کرتیں. اس سے جو چند پیسے مل جاتے وہی ان کا سہارا ہوتا. اگر کھادی بھنڈار ان کا سوت نہ خریدتا تو کوئی دوسرے خرید لیتے تھے. کہیں کہیں زیادہ کارگاہ چلا کرتے تھے، لوگ مل اور چرخہ کے سوت کو ملا کر کپڑے بنا کرتے تھے، اسی جگہ کچھ سوت بك جایا کرتا. یہاں بھی جب چرخہ سنگھ نے کام شروع کیا تو کاتنے والیوں کا کام بہت بڑھگیا، سوت زیادہ تیار ہونے اور بکنے لگا. ابھی یہ خیال نہیں تھا کہ سوت کاتنے کیلئے جو مزدوری دی جاتی ہے اس سے کاتنے والیوں کو کیا بچتا ہے اور انکی محنت کا پورا معاوضہ ہوتا ہے یا نہیں. یہ سب سمجھتے تھے کہ اگر ان کو یہ بھی نہ دیں تو ان بیچاریوں کی یہ آمدنی بھی بند ہو جائے. ہم جو یہ دیتے رہے تو ان کیلئے ہماری یہ بڑی مہربانی ہے. یہ بھی سوچنا پڑتا تھا کہ ہم جو کھادی تیار کرتے ہیں وہ سب نکل بھی

جائے. اتنی کم مزدوری دینے پر جو کھادی بنی جاتی تھی اسکی قیمت مل کے کپڑے سے بہت زیادہ ہوتی، اور کھادی بیچنے کا ایك بہت بڑا سوال ہمارے سامنے رہتا. ایك طرف تو ہم کھادی کو اچھا اور زیبائشی بنا کر لوگوں کو لبھاتے تھے، دوسری طرف ہماری کوشش یہ تھی کہ ہم اسکو مل کے کپڑے کی قیمت میں لے آئیں. کام تو کٹھن تھا لیکن اسمیں کامیابی بہت حد تك ہو گئی. کیونکہ کاتنے والیوں کی جیسی ترقی ہوتی گئی ہم بڑھیا کھادی تیار کرتے اور قیمت بھی گھٹاتے گئے. موٹی کھادی کی قیمت تو تقریباً مل کے برابر ہو گئی تھی لیکن باریك کھادی کی قیمت میں ابھی بہت فرق تھا.

میں دیکھتا تھا کہ ایسے کاموں سے بہت سے غریبوں کی کچھ نہ کچھ روزی چلنے لگی، اگرچہ وہ تھوڑی ہی تھی. کیونکہ کھادی پرچار اور اسکے پھیلاوے کو ہم بے انتہا ضروری سمجھتے تھے. اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم بکری بڑھانے کا انتظام کرسکیں تو ہم جتنی چاھیں کھادی پیدا کرسکتے ھیں. لیکن ھاں، باریك کھادی کی پیداوار کم ہو گئی، کیونکہ باریك سوت کاتنے والیاں کم تھیں اور ان کو عادت بھی زیادہ

نہیں تھی. پھر ھمیں تو لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ اگرچہ ایك گز کھادی میں زیادہ پیسے لگانا پڑتے ھیں پھر بھی کئی حیثیت سے کھادی سستی تھی. ھمارا دعوی تھا کہ کھادی زیادہ مضبوط ھوتی ھے اور یہ دعوی علمی طریقہ سے ثابت کیا جا سکتا ھے. جن میں ایك تو یہ تھا کہ جہاں صرف روئی پیدا ھوتی تھی، اگر وھیں سے اسکا کپڑا بنا جائے تو کھیت سے روئی نکالنے کے تھوڑے ھی دنوں کے اندر تیار ھو سکتا ھے. لیکن اس کے بر خلاف جو کپڑا مل میں تیار ھوتا ھے اسکی روئی کم سے کم ڈیڑھ سال پہلے کھیت سے نکالی جاتی ھے. وقت کا اثر مضبوطی پر ضرور پڑتا ھے. یہ وقت ایك دوسرے طریقہ سے کھادی میں اور بھی کم لگتا تھا، کیونکہ تیار ھونے پر کپڑا جہاں بنا جاتا تھا وھیں آس پاس جلد سے جلد بك جاتا تھا. اور مل کا کپڑا تیار ھونے کے بعد بھی کارخانے کے اندر سے دوکانوں میں جا کر پڑا رہ جاتا. زیادہ مضبوطی کیلئے دوسرا سبب بھی تھا. جہاں روئی پیدا ھوتی تھی وھاں کھیت سے نکالی جا کر گھر میں صاف کی اور دھنی جاتی، جس سے اس کا سوت تیار ھو سکتا تھا.

اسطرح اسکی صفائی و دھنائی میں و نیز اسکے ریشونمیں اتنا زور اور اتنی کھینچ نہیں پڑتی تھی جتنی کہ مل میں پڑتی تھی. اسمیں شك نہیں کہ مل کی صفائی میں بھی روئی زیادہ کھنچتی ھے. پھر صاف کئے جانیکے بعد وہ گانٹھوں میں اتنی کس کر باندھی جاتی ھے کہ وہ اینٹ کی طرح ھو جاتی ھے، پھر دھننے کے وقت اسکو علحدہ کرنا پڑتا ھے. اس طریقہ سے اس کے ریشے بہت کمزور ھو جاتے ھیں. کھادی میں مقامی روئی ان کاموں سے بچ جاتی ھے، اس لئے اس کے ریشہ کی طاقت بنی رھتی ھے. پھر بنائی کا طریقہ بھی مل کا ایسا ھوتا ھے کہ جس میں ریشے پر کافی زور پڑتا ھے. ریشے کئی بار کھینچ تان کر درست کئے جاتے ھیں. مل کا کتا ھوا سوت اچھا تو ضرور ھوتا ھے، کیونکہ اس کے سب ریشے سیدھے کر دئے جاتے ھیں، لیکن اس میں شك نہیں کہ ایسا کرنے میں اسکی بری گت ھو جاتی ھے. یہی سبب ھے کہ جس روئی سے مل میں بیس نمبر کا سوت تیار ھوتا ھے اسی روئی سے چرخہ پر آسانی کیساتھ چالیس پچاس نمبر تك کا سوت تیار ھو سکتا ھے. سوت کی کتائی میں بھی مل میں ریشوں کو زیادہ کھینچ تان برداشت

کرنی پڑتی ھے. ان سب وجہوں سے مل کا سوت طاقت میں ھاتھ کے سوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا. لیکن اسکے لئے شرط یہ ھے کہ جتنے قسم کی ترکیبیں ھوتی ھیں وہ ٹھیك طرح کی جائیں. مثلا ٹھیك طرح سے صفائی کتائی نہیں ھوتی تو سوت اچھا نہیں ھو سکتا، اور جب سوت اچھا نہیں کتے گا، تو اسمیں جتنی ناپ میں بل دینا چاھئیں اتنے میں نہیں دیئے گئے، تو سوت بھی کمزور ھوگا.

مل کے اور ھاتھ کے کام میں ایك بہت بڑا فرق یہ ھے کہ مل میں ایك قسم کی دھنائی اور کتائی کرنی پڑتی ھے. دھنائی اور کتائی پر اگر کنجی لگتی گئی تو ٹھیك ویسی ھی بنائی اور کتائی بھی ھوگی، اسمیں بہت فرق نہیں پڑے گا. اگر پرزے میں کہیں کوئی عیب ھو تو وہ پرزہ ھمیشہ اپنا عیب سوت میں دکھاتا جائیگا. پرزے میں اگر کوئی عیب ھے تو ھر دو گز پر اسکا عیب سوت کے دیکھنے میں آئیگا. یا سوت ایسے مقام پر پہونچے گا تو پرزے کا اثر اسپر ضرور پڑے گا. اسلئے مشین کے کام میں ایك طرحکی برابری ھوتی ھے، چاھے وہ بٹائی میں ھو یا سوت میں. ھاتھ کے کام میں یہ بات نہیں

ہوتی. کیونکہ ایک تو آدمی مشین کی طرح کام نہیں کر سکتا، دوسرے اسکی طاقت، توجہ، اور بہت سی دوسری باتوں کا اثر اسکے کام پر پڑتا ہی جاتا ہے. اسلئے ہاتھ کے کام کرنیوالے کی اپنی محنت خاص شکل سے ظاہر ہوتی رہتی ہے. جب تک کاتنے والا پورا ماہر نہیں ہو جاتا سوت برابر نہیں ہوتا اور نہ اسمیں یکساں طاقت ہوتی ہے. مگر مشین کے سوت میں ایک خاص جگہ پر ایک خاص کمزوری آئیگی. وہ فوراً دیکھنے میں نہیں آتی، کیونکہ اسکی کمزوری اگر ہوتی ہے تو قاعدہ کی رو سے اتنی دور پر نہیں ہوتی جتنی مل میں.

اگر کھادی کا ٹھیک انتظام کیا جائے جیسا کہ ہونا چاہئے، تو اسمیں شک نہیں کہ وہ بعد میں مل کے مقابلہ میں کم خرچ میں تیار کرائی جا سکتی ہے. کھادی کیلئے صحیح اصول تو یہ ہے کہ جہاں کسان اپنے کھیت میں کپاس پیدا کرے وہیں وہ صاف کی اور دھنی جائے. اور اسکا سوت گھر ہی میں تیار کر لیا جائے اور پھر اسی سوت کا اسی گاؤں میں کپڑا بنا جائے. اس طرح تیار کی ہوئی کھادی گھر کے لوگ استعمال کریں. اس سے ایک تو جلد سے جلد روئی کا کپڑا تیار ہو سکتا ہے،

اسلئے زیادہ وقت گزر جانیکی وجہ سے جو کمزوری پیدا ہو جاتی ھے وہ ایك حد تك دور کی جا سکتی ھے. دوسرے، کارخانے کی یہ حالت ھے کہ کپاس گاؤنمیں پیدا کی جاتی ھے، پھر لادکر کچھ دور کے کسی شہر میں لائی جاتی ھے اور وھاں دھنائی کے کارخانے میں پہونچائی جاتی ھے. وھاں سے صاف ہوکر وہ گانٹھونمیں مضبوط باندھی جاتی ھے. وہ گانٹھیں بھی وھاں بھیجی جاتی ھیں جہاں گرنیاں یعنی کارخانے ھوتے ھیں. ھندوستان میں سیکڑوں میل کی دوری سے روئی لا کر گرنیونمیں سوت کاتا جاتا ھے. زیادہ‌تر تو باہر کے ملکوں سے بھی روئی لانی پڑتی ھے. دوسرے ملکوں جیسے انگلستان میں تو ساری روئی دوسرے ھی ملکوں سے منگانی پڑتی ھے، کیونکہ وھاں روئی نہیں ھوتی. لیکن جو کپڑا اس سے تیار ھوتا ھے وہ دنیا کے سب ملکونمیں جہاں اسکی کھپت ھوتی ھے اور جس کارخانے سے اس کا تعلق ھوتا ھے، پہونچایا جاتا ھے. اس ملك کے گاؤں گاؤں تك میں وہ کپڑا بیچا جاتا ھے. اس طرح کھیت سے صفائی کے کارخانے تك اور اس کارخانے سے دھنائی کے کارخانے تك اور اس کارخانے سے گرنی (کارخانے) اور

گرنی سے خریدار تک کپاس. روئی اور کپڑا ڈھونے میں جتنا خرچ ہوتا ھے وہ کھادی میں یکبارگی بچ جاتا ھے. یہ کوئی چھوٹی رقم نہیں ہوتی. کپڑے کی قیمت کا ایک بڑا جز ڈھلائی کا خرچ ہوتا ھے. اس کے علاوہ بھی ہر موقع پر بیوپاری اپنا منافع رکھتے ھیں. جو کپڑے کی قیمت میں جوڑا جاتا ھے. اوپر بتایا گیا ھے کہ مل کے کپڑے کے مقابلہ میں کھادی زیادہ مضبوط بنائی جا سکتی ھے. یہ سب باتیں اگر دھیان میں رکھی جائیں اور گاؤں کے لوگ وہاں کی روئی کو وھیں دھنیں. کاتیں اور بن کر کپڑا تیار کرایں. اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اگر کھادی میں کفایت نہیں ہوگی تو کم سے کم مل کے مقابلہ میں کم قیمت میں گاؤں والوں کو ضرور مل سکے گی. لیکن ہم سست ہو گئے ھیں اسلئے دام دیکر بنی بنائی چیز لینی زیادہ پسند کرتے ھیں، اسیوجہ سے کھادی مہنگی ہو گئی ھے.

مہاتماجی ان باتوں پر جیل میں بہت غور کرتے رھے. ساتھ ھی ان کے سامنے اس وقت یہ سوال تھا کہ ان سب کو جو مزدوری ملتی ھے کیا وہ اتنی کم ہوتی ھے کہ اس میں انکا گزارہ نہیں ہو سکتا؟ اور اگرچہ اس اصول کے اعتبار

سے « جہاں کچھ نہیں وہاں تھوڑا تو ھے » ان کو جو کچھ بھی مل جاتا تھا وہ ان کیلئے ایك طرح کی مہربانی ھے۔ پھر بھی کھادی پہننے والے کو یہ مناسب نہیں ھے کہ وہ ایسا کرے جس سے سوت کاتنے والیوں سے صرف اپنا کام ھی نکالے۔ اس لئے گاندھی جی نے وردھا میں کھادی کے متعلق ایك نیا اصول جاری کیا۔ وہ یہ کہ کاتنے والیوں کو اتنی مزدوری ضرور ملنی چاھئے جس سے وہ اپنا گزر کر سکیں۔

جیسا اوپر کہا جا چکا ھے کہ کاتنے والیوں کی مزدوری بڑھا دینے سے کھادی کی قیمت بہت بڑھ جاتی تھی۔ کم مزدوری دیکر بھی کھادی کی بکری میں جتنی دقت تھی وہ زیادہ دام بڑھا دینے سے اور زیادہ ھو جاتی۔ ھم میں سے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح جو کھادی کم ھونے لگی وہ اور کم ھوتی جائیگی، اور کھادی کی فروخت بھی گھٹ جائیگی۔ گاندھی جی اتنی دور تك کا سمجھوتہ کرنے کیلئے تیار تھے کہ اگر ھم اتنی مزدوری نہیں دے سکتے تھے کہ جو مزدوری اسوقت دیتے تھے اس سے کئی گنی مزدوری بڑھا دینی چاھئے۔ مزدوری کی در (شرح) اسطرح لگائی

جائے کہ جس سے آدھ گھنٹہ کام کرکے اگر کوئی کاتنے والی
اوسط درجہ کا سوت کات سکتی ھے اور اوسط پیداوار
تین سو گز ہر گھنٹہ میں ھو جائے تو اس سے وہ تین آنہ
مزدوری پا سکیگی. بہت چھان بین «اور شری ونوبابھاو» کے
کچھ دنوں کے تجربے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس میں
دوسرے کاریگروں کو سوت خریدنے میں آسانی ھو. اور
وہ کاتنے والیوں کا پتہ لگا سکیں کہ انہیں ٹھیك مزدوری دی
جا رھی ھے یا نہیں. اسکی ایك مکمل فہرست تیار کی جائے
کہ یہ فلاں نمبر کا سوت ھے جس کیلئے فی لچھی کتنی مزدوری
دی جائیگی. جیسا سوچا گیا تھا اسکے اعتبار سے کھادی کی
قیمت بہت بڑھگئی. اسکے ساتھ ھی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ
کھادی کی بکری کم نہیں ھوئی. کیونکہ زیادہ تر جہاں پیداوار
تھی وھاں کھادی بہت بکنے لگی اور ایك نیا طبقہ کھادی پہننے
والوں کا پیدا ھو گیا. ابھی تك جو کاتنے والی سوت کاتی تھی
یا جو بننے والا اسے بنتا تھا وہ اپنے ھاتھ کے کتے ھوئے
سوت سے، اپنے ھاتھ کا بنا ھوا کپڑا بہت کم پہنا کرتے تھے.
کھادی بننے والے خود کھادی نہیں پہنتے تھے، دوسرے ھی

لوگ اسے استعمال کرتے تھے۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ سوت کاتنے والے اور بننے والے بھی کھادی پہنا کریں۔ زیادہ مزدوری کی یہ بھی ایک شرط تھی کہ اسمیں سے ایک حصہ کاٹ لیا جائیگا، جسکے عوض میں اسے پہننے کیلئے کھادی دی جائیگی جو اسے خود پہننی بھی پڑے گی۔ اسطرح مزدوری کا ایک حصہ ہر ہفتہ یا پندرہ روز میں کاٹ کر کاتنے والیوں کے نام پر جمع رکھا جاتا۔ اور جب انہیں ضرورت ہوتی تھی کپڑا دے دیا جاتا تھا۔ اسطرح سے ان کو ایک دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ سب کاتنے والیوں کے نام پر علحدہ حساب رکھا جانے لگا اور اس کے ذریعہ سے ہر ایک کاتنے والی کے ساتھ چرخہ سنگھ کا حقیقی تعلق ہو گیا۔ مزدوری لگانے کے وقت اسکی سوت کی ہر لچھی کی جانچ بھی ہوتی۔ اور سوت کی لچھی کے حساب سے مزدوری ملنے کی وجہ سے سوت سدھار میں کافی مدد ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کو جو کھادی ملتی وہ پہلی کے مقابلہ میں بہتر ہوتی۔ اگرچہ لوگوں کو دام زیادہ دینے پڑتے لیکن پھر بھی اتنی تکلیف نہیں اٹھانا پڑتی۔ کھادی کی مانگ کافی بڑھتی گئی۔ جو اندیشہ تھا کہ

بلا وجہ دقت بڑھ جائیگی وہ بڑی حد تک بے بنیاد ثابت ھوا. مانگ بڑھنے کے اور اسباب بھی ھو سکتے ھیں یعنی لوگونمیں زیادہ بیداری وغیرہ. لیکن اس میں شک نہیں کہ اس اصول سے کھادی کی ترقی ھوئی.

اسکا ایک دوسرا نتیجہ یہ ھوا کہ نقلی کھادی بہت بکنے لگی. چرخہ سنگھ خود اپنے مرکزوں کی کھادی تیار کرایا کرتا اور اپنی دوکانونمیں جو جگہ جگہ تھیں ان کو بیچا کرتا تھا. اسکے علاوہ بہت سے بیوپاریوں کو جو شدھ کھادی بنواتے تھے، صداقت نامہ بھی دیا جاتا. ان کی تیار کی ھوئی کھادی بھی ویسی ھی شدھ سمجھی جاتی تھی جیسی چرخہ سنگھ کی. اس طرح اپنی اور چرخہ سنگھ کی کھادی میں ایسی اصلی کھادی پیدا کرنے والوں سے سستی سے اور اچھی سے اچھی کھادی تیار کرنے کا ایک قسم سے مقابلہ سا رہتا تھا. اب جو چرخہ سنگھ نے مزدوری بڑھا دی تھی، اس سے ایسی کھادی پیدا کرنے والے بھی، جو پرانی ھی مزدوری کے اعتبار سے سوت خریدتے تھے، بہت نفع کمانے لگے. اسلئے اصلی کھادی وھی سمجھی جانے لگی جو نئے اصول کے مطابق کافی

مزدوری دیکر تیار کرائی جاتی۔ بہت سے کھادی بننے والوں نے نیا طریقہ مان لیا۔ چرخہ سنگھ نے زیادہ مزدوری کی شرط منوا کر اور اسکی دیکھ بھال کا انتظام کر کے ان کو صداقت نامہ دے دیا۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے صداقت نامہ نہیں لیا۔ وہ پرانے ھی ڈھنگ پر مزدوری کی پرانی ھی شرح پر کام کراتے رھے۔ بہت سے کانگریسی لوگوں نے بھی، جنہوں نے نئے طریقہ کو پسند نہیں کیا، ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کی۔ اس سے بازار میں کھلے میدان اصلی کھادی بکنے لگی۔ نقلی کھادی تیار کرنے اور بیچنے والے کافی نفع کمانے لگے۔ کیونکہ ان کی کھادی کم خرچ سے تیار ہوئی اور اسے وہ کافی نفع کیساتھ اصلی کھادی کے مقابلہ میں سستے داموں میں بیچ سکتے تھے۔ جتنا فرق مزدوری میں تھا اسکے مقابلہ میں کھادی کی بکری کے درمیان کم فرق تھا۔ وہ منافع پورے روپے میں نقلی کھادی بیچنے والے کو مل جاتا تھا۔ اس طرح نقلی کھادی بہت بکنے لگی۔ چرخہ سنگھ سارا سوت نہیں خرید سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس اسکے لئے کافی سرمایہ نہیں تھا۔ اسلئے کم مزدوری دیکر بھی دوسروں کو کافی

سوت مل جاتا. چرخہ سنگھ نے اسکی روک تھام کرنے کی تدبیر کی. کانگریس کارکنوں نے بھی کانگریسیوں کو ھدایت دی کہ وہ اصلی کھادی ھی استعمال لائیں، اور نقلی کو کھادی ھی نہ سمجھیں. بہت سے لوگوں نے اس بات کو نہ مانا، اسلئے نقلی کھادی خوب چلتی رھی.

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے کہ نئے طریق سے کھادی میں اصلاح بہت ھوئی. چرخہ سنگھ سوت وغیرہ میں جتنا سدھار کرنا چاھتا تھا وہ اس نے کیا. وہ گاوؤںمیں کھادی زیادہ چلانے لگا. اس کا دوسرا سبب یہ بھی ھوا کہ مہاتما جی نے فیصلہ کیا کہ جہانتک ھو سکے یہ کیا جائے کہ جہاں کھادی پیدا کی جائے، وھیں اسکی کھپت ھونی چاھئے. کچھ دنوں بعد ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں کھادی کا آنا جانا بند کر دیا گیا. صرف خاص قسم کی کھادی کے باھر بھیجنے کی اجازت ملتی، لیکن معمولی طور سے کھادی صوبہ کے باھر نہیں بھیجی جا سکتی. اوپر بتایا جا چکا ھے کہ کپڑے کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر ڈھو کر لیجانے سے کافی خرچ پڑتا ھے، اس لئے یہ تدبیر کی گئی کہ کھادی میں وہ خرچ نہ پڑے.

کھادی کے اصول میں بڑی تبدیلی ہو گئی۔ پیداوار اور فروخت پر جتنا زور دیا جانا چاہئے تھا، آہستہ آہستہ اب دیا جانے لگا۔ اس طرح سے کھادی پہلے کے مقابلہ میں اب زیادہ بکتی۔ لیکن اب اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا زیادہ دھیان دیا جانے لگا۔ جس کا مطلب یہ ھے کے شخص اور سماج دونوں اپنے لئے کھادی کو اپنے ھی مقام پر تیار کرائیں اور استعمال کریں۔ یہ اصول کوئی نیا نہیں تھا، کیونکہ پہلے بھی بہت سی جگہوں پر اس کا استعمال ہوا، اسمیں کسی کسی جگہ کامیابی ہوئی تھی۔ خود اعتمادی کے خیال سے بعض جگہوں پر جنتا کیلئے وہیں کافی کھادی تیار کی جاتی۔ جس سے وہاں کے لوگوں کو نہ باھر سے کپڑا منگانا پڑتا اور نہ وھاں کی اپنی کھادی باھر بھیجنی پڑتی۔ یہ استعمالی تجربہ بہت مظاھرے میں نہیں کیا گیا تھا لیکن بہر حال کامیاب ضرور ہو گیا۔ اگرچہ اسکا نتیجہ مستقل نہیں نکلا، لیکن پھر بھی جب تک اپنے مقام پر کارکن کام کرتے رھے اور لوگوں کا حوصلہ و جوش بڑھاتے رھے، اس وقت تک کام ہوتا رہا۔ ان کے ھٹ جانے کے بعد لوگوں نے اپنی کھادی تیار کرنی

بھی چھوڑ دی، اسلئے باھر سے پھر کپڑا وھاں جانے لگا.
مہاتماجی نے سوچا کہ جب تک لوگونمیں کھادی کے بارے میں اتنا جوش و پریم نہیں پیدا ھوگا کہ وہ اسے کبھی چھوڑنے پر تیار نہ ھونگے، اس وقت تک یہ کام پھیل نہیں سکتا، جتنا کہ وہ چاھتے تھے. اس کے لئے کھادی کے متعلق علم اور کھادی بننے کے سامان دونوں کی ضرورت تھی. چرخہ سنگھ نے اب اس پر زیادہ سے زیادہ دھیان دیا. اسے اتنی ھدایت ملی کہ جہاں وہ کام کرے وھاں لوگوں کو کھادی کی تعلیم بھی دے اور کھادی کے متعلق جو مشینیں ھوتی ھیں اسکی درستی بھی کرائے. ساتھ ھی ساتھ ایسی مشینوں سے کام لیا جاتا جس سے لوگ مضبوط اور اچھی کھادی بننا سیکھ لیں.
تجربہ کے بعد دو باتیں خاص اھم نکلیں. ایک یہ کہ روئی صاف کرنے سے اسمیں کچھ کمزوری ھو جاتی ھے، اسلئے بنولے نکال دینے کا ایک ایسا طریقہ نکالا گیا جو پہلے سے کہیں جاری تھا لیکن سب جگھونمیں نہیں. اسکے لئے مشینوں کی ضرورت نہیں ھوئی، صرف چھوٹی سی ایک پٹری اور لوھے یا لکڑی کی ایک، چھوٹی سی انگلی کے برابر، موٹی سلاخ کافی

تھی. دھنائی سے ریشوں میں کمزوری آتی ھی ھے، اسلئے دھنائی کے بجائے ھاتھ سے اسکو تنا جانے پر زیادہ زور دیا گیا. ان ترکیبوں سے ریشے کی طاقت کم سے کم بکھرتی ھے. اس کا نتیجہ کپڑے پر ضرور اثر انداز ہوتا تھا. تا کہ کپڑا زیادہ مضبوط نکلے. کھادی کی بنائی کا بھی سوال سخت تھا. سب کچھ ھو جانے کے بعد بھی ھاتھ کے کتے ہوئے سوت میں اتنی مضبوطی اور برابری نہیں ھوتی تھی، جتنی مل کے سوت میں. اسلئے بننے والے اتنی تیزی کے ساتھ ھاتھ سے کتے ہوئے سوت کا کپڑا نہیں بن سکتے، جتنا کہ مل کے کتے ہوئے سوت سے. اس کا نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ کھادی بننے کیلئے وہ زیادہ مزدوری لیتے تھے. کھادی کے دام اس سبب سے بھی زیادہ ھوتے تھے. مہاتماجی نے سوچا کہ سوت میں بھی اصلاح ھونی چاھئے، جس سے بننے والوں کو آسانی ھو. تنائی وغیرہ سے کچھ اصلاح تو ھوئی لیکن دو سوتوں کو ایک ساتھ بٹکر بنائی کے قابل بنانے کا طریقہ بہت مفید ثابت ھوا. اس پر بھی زور دیا جانے لگا کہ ایک ساتھ بٹکر دو سوت دیا جایا کرے. لیکن یہ رواج نہ چلا کیونکہ ایک تو اسمیں ایک

عجیب ترکیب کام میں لائی جاتی، دوسرے فی گز کپڑے کیلئے زیادہ سوت بھی لگانا پڑتا. لیکن اسمیں شك نہیں کہ کپڑے کی مضبوطی میں کافی فرق ہو جاتا. اس طرح کی ترکیب میں سدھار کی کوشش برابر ہوتی رہی ہے. لیکن ادھر اب زیادہ زور پیداوار کے بڑھانے میں رہا. اسلئے لڑائی کے دنوں میں اور اسکے بعد بھی، جب ملك میں کپڑے کی بہت کمی رہی، اور جب اسکا موقع بھی تھا کہ کھادی کی پیداوار اور بکری زیادہ بڑھائی جا سکتی تھی، اس وقت وہ نہیں بڑھی. اور اسوقت جو ایك بہت بڑی کمی تھی وہ بھی پوری نہیں کی جا سکی. خود مکتفی کرنے کا کام تو بہت کٹھن ہے. اسلئے کھادی کا چلن دیکھنے میں نہیں آتا. اور اسلئے بہت سے لوگوں کی عقل میں کھادی کا اصول وقت کے موافق نہیں رہا ہے. اسکا جتنا چلن ہو سکتا تھا. لوگوں کو اس سے جتنا فائدہ پہونچایا جا سکتا تھا. کپڑے کی کمی جس حد تك دور کی جا سکتی تھی، ان باتوں میں سے ایك بات بھی پوری نہیں ہوئی. کچھ لوگ یہ مانتے تھے کہ چرخہ سنگھ کے اس اصول سے ہی کھادی کو بہت نقصان پہونچا. لڑائی کے زمانے میں اور

اسکے بعد بھی، ملك کی ملیں لڑائی کے سامان تیار کرنے میں لگی ہوئی تھیں. اسلئے عوام کے استعمال کیلئے معمولی کپڑا نہیں بنتا تھا یا کم بنتا تھا. غیر ملکی کپڑا آنا بند ہو گیا تھا. اس سے ملك میں کپڑے کی بڑی کمی ہو گئی. اسوقت جتنی کھادی بن سکتی ملك اسے خرید لیتا. وہی موقع تھا جبکہ کھادی کی پیداوار بہت بڑھائی جا سکتی تھی. کپڑے کے دام اتنے بڑھ گئے تھے کہ مل کے کپڑے کے مقابلہ میں چرخہ سنگھ کی کھادی سستی ملتی. جو کبھی کھادی نہیں پہن سکتا تھا وہ بھی کفایت کی وجہ سے کھادی لینی چاہتا تھا. لیکن اسکو کھادی نہیں ملتی تھی. کہیں کہیں چرخہ سنگھ کو بھی یہ سوچنا اور کرنا پڑا کہ اس کے جو پرانے خریدار تھے، یعنی جو عادتاً کھادی استعمال کرنے والے تھے. انکے ہی ہاتھوں کھادی بیچی جائے. یہ افسوس کی بات کہ اس موقع پر کھادی کی پیداوار بڑھانے کا فائدہ نہ اٹھایا گیا اور کپڑے کی کمی کیوجہ سے غیر ملکوں سے کپڑا لانیکی پالیسی گورنمنٹ کو اختیار کرنی پڑی.

سوراج کی ساری لڑائی کے زمانہ میں بدیشی کپڑے کا

بائیکاٹ ہماری تحریک کا ایک خاص اور بہت بڑا جز رہا ہے اسکے متعلق بہت سے نیتاؤں کے ساتھ مہاتماجی کا اصولی اختلاف رہا کرتا تھا. کچھ لوگ تو صرف بدیشی کپڑے ہی کا بائیکاٹ نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کا اصول تو یہ تھا کہ سبھی برٹش چیزوں کا بائیکاٹ کرنا چاہئے، کیونکہ ہماری لڑائی برٹش کے ساتھ تھی. اور چونکہ برٹش اپنی تجارت پر ہی بہت کچھ بھروسہ رکھتی ہے، اور اسکا مال ہندوستان میں بہت کھپتا ہے، اسلئے اسکے مال کا بائیکاٹ کر کے ہم اسپر دباؤ ڈال سکتے ہیں. اس سے ہم سوراج کے متعلق اپنی مانگ منوا سکیں گے. گاندھی جی اس قسم کے بائیکاٹ کی پالیسی میں ہنسا کی کچھ جھلک دیکھتے تھے، اس لئے وہ سبھی برٹش مالوں کا بائیکاٹ پسند نہیں کرتے تھے. کپڑے کے متعلق انکا خیال تھا کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی اقتدار کا غلط استعمال کر کے ہندوستان کے کپڑے کی مقامی تجارت کو نیست و نابود کیا ہے. اسلئے ایسی کوششوں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہئے. کیونکہ یہ ایک قسم سے وسیع اور عام کوشش تھی. اسکے فنا ہو جانے سے گاؤںکی کی زندگی میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی.

وہ مانتے تھے کہ اس کے دوبارہ زندہ کرنے میں صرف برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ ہی سے کام نہیں چلے گا. بلکہ اس کیلئے سبھی ملکوں سے کپڑے کا آنا بند کرنا ضروری ھے. اس لئے وہ سبھی بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ پر مخصوص زور دیا کرتے تھے، صرف برٹش کپڑے ھی کے بائیکاٹ پر نہیں.

ادھر کچھ برسوں سے پچھلی لڑائی سے پہلے جاپان سے بھی بہت کپڑا آنے لگا تھا. ایك طرح سے جاپانی کپڑا اپنا اثر جماتا جا رہا تھا. مہاتماجی مانتے تھے کہ برطانوی کپڑے کو ہٹا کر جاپانی کپڑا کام میں لانا ملك کیلئے مفید نہیں ہوگا. لیکن حب وطن پر قائم رہنا ہر طریقہ سے برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ سے ہوگا. ادھر تو ملك کی ملوںمیں کافی کپڑا تیار ہو گیا ھے، غیر ملکوں سے بھی کچھ آنے لگا. پھر اگرچہ کپڑے اور اسکی قیمت پر قابو ھے اور اسکی قیمت بھی بہت بڑھی ہوئی ھے. پھر بھی کھادی کو جتنی چاھئے اتنی مدد نہیں مل رہی ھے. پھر کیا ہوگا، یہ آئندہ کے حالات پر موقوف ھے.

مہاتماجی نے کھادی کو صرف ایك گھریلو دھندے کی ھی

شکل میں نہیں دیکھا تھا. اگرچہ یہ ایک ایسی کوشش ہو جاتی جس سے جنتا کے سب سے غریب طبقہ کو مدد ملتی. انہوں نے اسکو بار بار سب کوششوں کا مرکز قرار دیا. کئی جگہوں پر ایسا لکھا بھی ھے کہ جیسے سیاروں میں سب سے بڑا سورج ہوتا ھے ویسے ھی سب دیہاتی پیشوں میں کھادی کا بڑا مقام ھے. سوراج تحریک کے زمانے میں کھادی پہننا ھماری تحریک کا ایک نشان بن گیا تھا. اگر مہاتماجی کا قابو چلتا ارر سبلوگ ان کی بات مانتے تو چرخہ چلانا ھر ایک کارکن اور نیتا کیلئے لازم ہو جاتا، اور کھادی صرف جسم ھی پر نہ ھوتی بلکہ دل کے اندر بھی گھر کر لیتی. لیکن یہ پوری طرح نہ ھو سکا. کانگریس نے اسے صرف ایک وردی ھی تسلیم کیا اور وہ جسم ھی پر رہ گئی، اندر داخل نہ ھو سکی. اگر وہ اندر داخل ھو جاتی تو ھماری زندگی میں زبردست تبدیلی واقع ھو جاتی. جہاں بڑے بڑے مشینوں کے کارخانے روز بروز کھلتے جا رھے ھیں اور چھوٹی چیزوں کے تیار کرنے کا کام اپنے ھاتھونمیں لیتے جا رھے ھیں، اور جہاں جنتا میں بیکاری روز بروز بڑھتی جا رھی ھے، وھیں کھادی یہ ثابت کرتی کہ

انسانوں کو سکھی بنانے اور سچی خوشی پہونچانے کیلئے ظاھری دکھاوے کی اتنی ضرورت نہیں ھے جتنی سادہ زندگی اور اندرونی اطمینان کی. کھادی جسمانی محنت کی عزت اور پابندی کو بڑھاتی ھے. مہاتماجی اپنے اکیس دن کے روزے میں بھی جب ان کی جسمانی طاقت بہت گرنے لگتی تھی، تو بھی ایك دن کیلئے بھی چرخہ چلانا بند نہیں کرتے تھے. جب پبلك کام میں اتنی زیادتی ھوتی تھی کہ ان کو چرخہ چلانے کا وقت ملنا مشکل ھو جاتا تھا. اس وقت بھی وہ آرام اور سونے کے وقت کو گھٹا کر چرخہ چلانے کا وقت نکال لیا کرتے تھے. وہ چرخہ چلانے کو ایثار سمجھتے تھے، اور جس مذھبی جذبہ سے وہ چرخہ چلایا کرتے تھے اسی جذبہ سے وہ پرارتھنا (عبادت) بھی کیا کرتے تھے. ان کیلئے چرخہ ھی مصیبت دور کرنے والا سرمایہ تھا. اگر ھم اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو ھماری زندگی میں سادگی آ جاتی، ھم کبھی غریبوں کی روزی چھین کر بڑے بڑے کارخانوں کے لالچ میں نہ پڑتے اور جسمانی محنت کی عزت کرنے لگتے. پھر تو ھماری زندگی کا رخ ھی بدل جاتا. باھری چمك دمك

اور ظاهری دکھاوے کو بڑھا کر زندگی کے معیار کو اونچا کرنے کا جو خیال پھیل رہا ہے اسکو بھی ہم ٹھیك ٹھیك سمجھ لیتے. اس وقت ہم پورے اطمینان سے سچی خوشی کا تجربہ کرنے لگتے. لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اور نہ سمجھا، ہم نے تو کھادی کو صرف ایك وردی ہی سمجھا جو بدلی جا سکتی ہے، وہ کسی روحانی طاقت سے تعلق نہیں رکھتی. ہم نے کھادی کی روحانی طاقت ہی کو نہیں کھویا بلکہ مالی حیثیت سے بھی ہم اتنی ترقی نہ کر پائے جتنی کہ کرنی چاہئے تھی.

چھبیسواں باب

جب مہاتماجی غائب شدہ چرخہ کو دوبارہ جاری کرنیکی پوری قوت سے کوشش کر رہے تھے، اسوقت تک ہماری آنکھوں کے سامنے دیکھتے ھی دیکھتے بہت سے چھوٹے موٹے گھریلو پیشے، جن کے ذریعہ سے بہت سے غریب آدمی گزارہ کیا کرتے تھے، کارخانوں کی چوٹ سے نیست ہوتے جا رہے تھے. جب ہم یہ سوچتے تھے کہ کھادی کو دوبارہ زندہ کرنا بہت ضروری ہو گیا، تو ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی. کہ ان دوسرے دھندوں کو کیوں مارنے دیا جا رہا ھے. یہ بات نہیں تھی کہ گاندھی جی کا خیال ان دھندوں کی طرف نہیں گیا. لیکن شاید انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جو چرخہ فنا ہو چکا ھے. اگر وہ دوبارہ زندہ کیا جا سکے گا. تو دوسری چیزوں کو. جو ابھی فنا نہیں ہوئی ھیں، زندہ رکھنا اتنا مشکل نہ ہوگا. اسلئے انہوں نے اپنی قوت کو منتشر نہ کرکے اسے مرکزیت دینا ٹھیک سمجھا، کیونکہ وہ جب سے زیادہ مشکل معلوم ہوا. جو کام سب سے

زیادہ کٹھن ہوتا تھا اسی کو وہ ہاتھ میں لینا پسند کرتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان سے کسی نے کہا «مہاراشٹر کے گاؤنمیں آپ کی باتیں لوگ نہیں سنتے، جتنا وقت آپ نے وردھا اور سیوا گرام میں لگایا ہے، اگر اتنا کسی دوسرے صوبہ کے گاؤنمیں لگاتے تو سارے صوبہ کی شکل بدل جاتی، آپ کے پروگرام کو ہر ایک گاؤں نے اپنا لیا ہوتا»۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ مہاراشٹر کے گاؤوں میں ہمارے پروگرام کا چرچا بہت کم ہوا ہے، اور لوگ ہماری باتیں کم سنی چاہتے ہیں، تو کیا ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم زیادہ وقت وہیں دیں؟ اگر وہ میری بات نہیں سنیں گے تو دوسروں کی اور بھی کم سنیں گے۔ اس لئے جب یہ کام اتنا مشکل ہے تو پھر میں دوسرے کام کرنے والوں پر اسے کیسے چھوڑ دوں! چونکہ یہ کام کٹھن ہے اسلئے ان کو اسکی اہمیت سمجھانی میرا اور بھی فرض ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں یہاں بیٹھا ہوں»۔ شاید یہی کچھ انہوں نے سوچا ہوگا۔ اگرچہ دیہی پیشوں کی طرف انہوں نے شروع سے ہی دھیان نہیں دیا، مگر پھر بھی وہ ان کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

جب وہ وردھا میں آکر بیٹھے تو انہوں نے دوسرے دیہی پیشوں کے حوصلے بڑھانے کا بھی کام شروع کیا. اسکے لئے «دیہاتی پیشہ سنگھ» انہوں نے قائم کر کے وہ ایك دیہی پیشہ کا حوصلہ بڑھانے اور ان کو دوبارہ زندہ کرنے کا انتظام کرنے لگے.

مہاتماجی برابر غذائی چیزوں کے متعلق تجربے کرتے تھے. جب وہ انگلستان میں پڑھتے تھے اسی وقت انہوں نے یہ کام شروع کیا تھا. وہاں ترکاری خوروں کی انجمن قائم کر کے وہ ترکاری کھانے کا پرچار کرنے میں پوری مدد کرنے لگے. دکھنی افریقہ میں بھی برابر اسپر دھیان دیتے رہے. جب سے ہندوستان لوٹ کر آئے اسیوقت سے اسپر وہ زیادہ زور دینے لگے. چمپارن پہونچنے پر تو کھجور اور مونگ پھلی ھی ان کی سب سے بڑی غذا تھی. کچھ دنوں تك آم وغیرہ بھی کھایا کئے، بعد میں چاول کھاتے تھے. لیکن انکا ہمیشہ سے ایك قاعدہ تھا کہ کسی طرح سے کوئی مسالہ یہانتك کہ نمك بھی اس وقت تك نہیں کھاتے تھے. جو سبزی ترکاری ہوتی اسکو صرف پانی ھی میں ابال کر کھایا کرتے تھے. ان کا یہ

مضبوط خیال همیشه رها که اهنسا (عدم تشدد) کیلئے برهم چاری
(تارك لذات) هونا از حد ضروری هے، اور اس کیلئے
ساده سے ساده کهانا، جس میں کوئی ایسی چیز جو تیز اور
خواهشات کو ابهارنے والی هو. نه هو. اسلئے وه اس فکر
میں رها کرتے تهے که کهانا ایسا هی هو جو جسم کو قوی
اور تندرست رکهنے کیلئے کافی هو، لیکن اسمیں حیوانیت کی
طاقت نه هو. اسکے ساتھ هی حسیات کو قابو میں رکهنے کیلئے
حس ذائقه (زبان) کو قابو میں کرنا بهی بے انتها ضروری هے.
لهذا تندرستی کیلئے تیز چیزوں کے کهانے کو وه برا سمجهتے
تهے. کهانے کا مقصد جسم کو درست اور مضبوط رکهنا هے،
نه که زبان کے ذائقه کو مطمئن کرنا. اسی لئے انهوں نے
کهانے میں ذائقه کو کبهی کوئی مقام نهیں دیا. صرف تندرستی
کی حیثیت هی سے وه کهانے پر غور کیا کرتے تهے.

ملك کے لوگوں میں کهانے کے متعلق بهت قسم کی غلط
فهمیاں هیں. هم زیاده تر مزے کیلئے هی کهاتے هیں اگرچه
خوش ذائقه کهانے کا اثر جسم پر برا هی کیوں نه پڑے. لیکن
کهانے میں هم بهت نقصان هی اٹهاتے هیں اور تندرستی کیلئے

جتنا ضروری ھے اس سے زیادہ ھی کھاتے ھیں۔ اسلئے مہاتماجی اسکو بہت سے اخباروںمیں برابر لکھتے رھتے ھیں کہ وھی چیز کھائی جائے جو جسم کو ٹھیک اور دل کو پاك رکھ سکے۔ سابرمتی آشرم میں کھانے کی چیزوں کے متعلق برابر تجربہ ھوتا رھا۔ آشرم کے بہت سے رھنے والے اپنے جسم پر ھی اسکا تجربہ کرتے تھے۔ مہاتماجی تو اس مسئلہ کا ساری زندگی تجربہ کرتے ھی رھے۔ انہوں نے دودھ اور اس سے بنی چیزوں کو اپنے لئے ممنوع کر رکھا تھا۔ جب وہ سخت بیمار پڑے تو کسی نے بکری کے دودھ کی فہمائش کی۔ اس وقت تك وہ بغیر دودھ کے ھی رھتے تھے۔ جب بکری کے دودھ کی خاصیتوں کا پتہ چلا اس وقت سے وہ برابر استعمال کرنے لگے۔ «مگن واڑی» میں انہوں نے کچھ دنوں تك نیم کی پتی اور کھلی وغیرہ ھی کو استعمال کیا۔ کچھ دنوں تك اسی بات کی دھن رھی کہ ایك ھی بار بغیر پکا ھوا کھانا کھایا جا سکتا ھے یا نہیں، اور اس استعمال کا نتیجہ انسان کی تندرستی پر کیا اثر ڈال سکتا ھے۔ ڈاکٹر نے اسکی مخالفت کئی بار کی، لیکن انہوں نے نہ مانا اور بہت دنوں تك بغیر پکی ھوئی چیزیں

کھاتے رہے۔ ان کے دانت کمزور تھے اور بہت سے گر بھی گئے تھے۔ اسلئے کسی چیز کو چبا کر کھانا ان کیلئے مشکل تھا۔ کچی چیز سل پر پیس کر دی جاتی تھی اور وہی وہ کھاتے تھے۔ کچا گیہوں بھگو کر کدو اور دوسری قسم کی سبزی و ترکاری، سب کچھ سل پر پیس کر ان کو دیا جاتا تھا، نیم کی پتیاں بھی اسی طرح پیس کر دی جاتی تھیں جسے وہ چٹنی کی طرح کھا لیتے۔ ان کا خیال تھا اگر پکانے کی ترکیب اٹھ جائے تو کھانے کے متعلق بہت بڑا جھگڑا دور ہو جائیگا۔ اس سے صرف ایندھن کا خرچ ھی نہیں بلکہ وقت بھی بچے گا۔ اور مزے کا تو ایک طرح سے مقاطعہ ھی ہو جائے گا۔ لیکن ایسے تجربوں کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا، ان کی تندرستی بہت بگڑ گئی، مجبوراً انہیں یہ تجربے چھوڑنے پڑے۔

اس حالت میں یہ قدرتی تھا کیونکہ انہوں نے دیہی کوششوں کو پھر سے زندہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ خاصکر ایسے دیہی کاموں پر ان کا دھیان گیا جو کھانے کی چیزوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے چاول، آٹا، تیل اور گڑ کے متعلق بہت سی کوششیں کیں اور کرتے رہے۔ کبھی تو تھوڑے آدمیوں کو،

جن کے ذریعہ سے یہ چیزیں تھوڑی تیار کی جاتی تھیں. مدد دیکر اس کام کی اصلاح کرائی. ایك دوسری حیثیت سے یہ کوشش بہت ضروری ھے کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی آدمی نہیں رہ سکتا. یہ انسان کی زندگی کیلئے لازمی چیز ھے. زندگی کے قابل چیزونمیں کھانے کی چیزوں کا مقام سب سے انچا نہیں تو بہت اونچا ضرور ھے ایك تو کسی طرح کھانے کی چیزوں کی پیداوار بڑھائی جائے جس سے ملك کے لوگوں کی ضرورت پوری ھو اور ان کی کمی نہ رھے. دوسرے یہ بھی سوچا جائے کہ ان کو کس طریقہ سے استعمال کیا جائے. تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھایا جا سکے اور کم سے کم کھانے پر انسانی زندگی کیلئے تندرستی دینے والی غذا مل جائے. کھانے کی چیزونمیں غلہ بہت ضروری ھے غلہ میں بھی خاصکر گیہوں اور چاول کا استعمال ھوتا ھے. اسلئے ان دونوں پر انہوں نے بہت زیادہ دھیان دیا

دھان کو کوٹ کر چاول نکالا جاتا ھے. اسکے تھوڑے بہت طریقے ملك میں جاری ھیں. ایك طرف یہ تدبیر کی گئی کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ چاول کسطرح تیار کیا

جائے. سب جگہ ایک ہی طریقہ جاری ہے یعنی دھان کو اوکھلی میں موسل سے کوٹا جاتا ہے، اسمیں کافی محنت پڑتی ہے اور چاول کم تیار ہوتا ہے. دوسرا طریقہ ڈھیکی سے دھان کوٹنے کا ہے، اوکھلی اور موسل کے مقابلہ میں ڈھیکی زیادہ چاول تیار کر سکتی ہے. چاول نکالنے کے ہر قسم کے طریقوں کو بھی تھوڑا بہت سدھارا گیا ہے. کوٹنے والے کی کم سے کم محنت سے، زیادہ سے زیادہ چاول نکالنے کی تدبیر کی گئی. لیکن ایک نیا طریقہ، جو خاصکر اتر میں پہلے جاری نہیں تھا، یہ نکلا ہے کہ چکی سے دل کر دھان کے اوپر کا چھلکا نکال دیتے ہیں. معمولی طرح سے دھان کو کوٹنے میں دو ترکیبیں ہوا کرتی ہیں. پہلی میں دھان کے اوپر کا موٹا چھلکا نکال دیا جاتا ہے اور اسطرح جو چاول نکلتا ہے اسپر ایک بہت باریک چھلکا ہوا کرتا ہے جو دکھائی نہیں دیتا. دوسری ترکیب میں وہ چھانٹ کر صاف کر دیا جاتا ہے جس سے وہ باریک چھلکا بھی نکل آتا ہے. چکی میں دھان دل کر وہ پہلی ترکیب بہت آسان کر دی گئی. اگر دھان بہت سوکھا ہو تو دلنے میں بہت آسانی ہوتی ہے. اس طرح تجربہ

کرکے دیکھا گیا ھے کہ دوسری ترکیب صرف غیر ضروری ھی نہیں بلکہ تندرستی کی حیثیت سے نقصان دہ بھی ھے. جو باریک چھلکا چاول پر رہ جاتا ھے اس سے چاول کی قوت دینے والی طاقت بہت کچھ باقی رھتی ھے. اسکو نکال دینے سے چاول کمزور ھو جاتا ھے لیکن دیکھنے میں بہت صاف نظر آنے لگتا ھے. اگر وہ خوب اچھی طرح چھانٹ لیا جائے تو اس میں ایک طرحکی چمک بھی پیدا ھو جاتی ھے. چاول میں جو گھن لگتا ھے وہ خاصکر اس کے ایسے ھی چھلکے میں لگتا ھے جو موٹا سا ھوتا ھے. کیونکہ گھن اسی کو کھاتا ھے. اگر چاول خوب چھانٹ دیا جائے اور چھلکا بالکل صاف کر دیا جائے تو اس میں ایک برس تک گھن نہیں لگتا. چھلکے کا جتنا جز رہ جاتا ھے اسی کی وجہ سے جلدی اور زیادہ گھن لگتا ھے. تجربہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر چھلکا نہ نکالیں تو چاول تیار ھونیکے بعد جلد ھی خرچ کر دینا ضروری ھے. ایسے ھی چاول میں قوت دینے والی طاقت بہت ھوا کرتی ھے، اسلئے باریک چھلکے سے صاف کئے ھوئے چاول کو پورن چاول (صاف چاول) کا نام دیا گیا ھے. اس تجربے سے یہ نتیجہ

نکلا کہ کم چاول پکانے سے زیادہ قوت دینے والی چیزیں مل سکتی ھے. اسطرح صاف قسم کے چاول کے استعمال سے دو قسم کے فائدے ہوتے ہیں. ایک وہ کہ جو چھلکا رہ جاتا ھے اس کا وزن چاول کے ساتھ مل جاتا ھے. اس طرح جہاں خوب چھانٹے ہوئے چاول کا وزن ایک من دھان میں ایک سیر نکلا. وہاں اتنے ھی دھانوں میں صاف چاول (پورن چاول) چار یا پانچ سیر نکلا. اسطرح دھان سے چاول کی پیداوار ھر سیکڑے پر چار یا پانچ سیر سے زیادہ ھو جاتی ھے. دوسرے یہ بھی دیکھا گیا ھے کہ پورن چاول آدمی کم کھا سکتا ھے کیونکہ کم چاول سے ھی وہ سیر ھو جاتا ھے. اور جتنا چھانٹا ھوا چاول آدمی پچا سکتا ھے اس سے کم ھی صاف چاول ھضم کر سکتا ھے. ان تجربوں سے اسطرح دونوں فائدے ھوئے، یعنی کم محنت سے زیادہ چاول کا تیار ھونا اور کم کھا کر زیادہ قوت دینے والی چیز حاصل کرنا.

چکی کے آٹے کی شکل میں گیہوں کا زیادہ استعمال ھوتا ھے مہین آٹے کیلئے زیادہ بھاری چکی ھونی چاھئے، وزن کے اعتبار سے اس کے چلانے میں زیادہ محنت بھی لگتی ھے. اسکے

علاوہ گیہوں کے چھلکے کا حصہ بھی چھلنی میں چھان کر نکال دیا جاتا ھے. چاول کی طرح گیہوں کی قوت دینے والی چیز کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ایسے ھی چھلکے میں رہا کرتا ھے. اس چھلکے کو بھوسی کی شکل میں نکال دینے سے قوت دینے والی چیز نکل جاتی ھے. اسمیں بھی ان تجربوں سے دو نتیجے نکلے، ایک یہ کہ چکی کا ایسا سدھارا کیا گیا کہ کم سے کم محنت سے گیہوں پیسا جا سکے. دوسرے یہ کہ چھلکے کو نہ نکال کر آٹے کی قوت دینے والی چیز کی طاقت بڑھا دی جائے. اس سے چاول کی طرح اسمیں بھی دگنا فائدہ ھوا. کیونکہ جو بھوسی نکل جاتی ھے وہ آٹے کے ساتھ ھی رہ کر اسکا وزن چھانے ھوئے آٹے کے وزن سے زیادہ بڑھ جاتا ھے. جسطرح چاول چھانٹنے کی محنت پورن چاول سے بچ جاتی ھے اسی طرح بغیر چھانے ھوئے آٹے کے استعمال سے آٹا چھاننے کی محنت بچ جاتی ھے. آدمی جتنا چھانا ھوا آٹا کھا سکتا ھے اس سے کم ھی بغیر چھانے ھوئے آٹے سے سیری ھو جاتی ھے اور قوت دینے والی چیز بھی مل جاتی ھے.

تیسری چیز جسپر دھیان دیا گیا تیل تھا. آدمی کی غذائی چیزوں میں کچھ تیل گھی جیسی چکنی چیزوں کا ھونا بھی ضروری ھے، اسلئے تیل اور گھی بھی کچھ کم اھم نہیں رھے. تیل کئی قسم کے بیجوں سے، جنکو تل وغیرہ کہتے ھیں، کولھو میں پیل کر نکالا جاتا ھے. یہ طریقہ بہت دنوں سے ھندوستان میں جاری ھے. کولھو میں بیل جوت کر کام نکالا جاتا ھے. تدبیر یہ کی گئی کہ بیل کی محنت کم ھو جائے اور تیل آسانی سے نکل سکے. اس تدبیر میں بھی کافی کامیابی ھوئی. کولھو کی ھی ایسی اصلاح کر دی گئی. کہ جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ تیل نکالا جا سکے.

غرضکہ ان تینوں چیزوں یعنی چاول گیہوں اور تیل کو بنانے کیلئے بہت سی انجمنیں کھل گئیں، اور کھلتی جا رھی ھیں. پہلے تو گاؤں کے لوگ ھی یہ سب تیار کر لیا کرتے تھے. چاول کوٹنے آٹا پیسنے کا کام گھر میں ھی ھوا کرتا تھا. اس سے گاؤں کے لوگوں کو صرف ایک کام ھی نہیں ملتا تھا بلکہ ایک طرح جسمانی ورزش بھی ھو جایا کرتی تھی. ان چیزوں کے کارخانوں کی وجہ سے صرف یہی نہیں ھوا کہ کروڑوں

انسانوں کا دیہاتی دھندا۔ جو بغیر گھر چھوڑے اور باہر گئے ہوئے ہر گھر میں ہو جایا کرتا تھا، ان سے چھینا جا رہا ھے بلکہ یہ بھی کہ جو کھانے کی چیزیں ان کارخانوں سے تیار ہوتی ھیں، انمیں وہ قوت دینے والی طاقت بھی نہیں رہ جاتی جو گھر میں کٹے پسے چاول اور آٹے میں، اور گاؤں کے نکالے ہوئے تیل میں ہوا کرتی تھی. فنی تحقیقات سے یہی نتیجہ نکلا ھے کہ مشینوں کے ذریعہ تیار کئے ہوئے چاول. آٹا اور تیل میں زندگی بخش چیزیں نہیں ہوتیں یا بہت کم ہوتی ھیں، جسکو «وٹیمن» کہتے ھیں. اس عمل درآمد کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کا دھندا ان کے ھاتھ میں رہ جائے اور ملک کی تندرستی بھی کم کھا کر سدھر جائے. گاندھی جی نے ان باتوں کا بہت شدت سے پرچار کیا. جسکا کچھ اثر بھی ہوا لیکن یہ اتنا نہیں پھیلا جتنا چرخہ اور کھدر پھیلا. آج جب خوراک کی اتنی کمی ھے اور کروڑوں من غلہ باہر سے اربوں روپیہ خرچ کر کے منگانا پڑ رہا ھے. یہ سوچنے کی بات ھے کہ ان تجربوں سے کتنا فائدہ ہو سکتا ھے اور ان کا پرچار کر کے وہ فائدہ کس طرح عام لوگوں تک پہونچایا جا سکتا ھے. میں

یہ مانتا ہوں کہ اصلی چاول آٹے کے استعمال سے آج بھی غلہ کی کمی ایک اچھی مقدار مین دور کی جا سکتی ہے. اس میں نہ کچھ نیا خرچ اور نہ کچھ نیا کام ہے، لوگوں کو بتا دینے سے ہی بہتر نتیجہ نکل سکتا ہے. لیکن اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت ہماری سستی اور کاہلی ہے، ہم چاول چھاٹنے اور آٹا پیسنے کی محنت سے بچنا چاہتے ہیں. اسی لئے کارخانے کا تیار کیا ہوا چاول اور وہیں کا پسا ہوا آٹا استعمال کرتے ہیں. اسکے ساتھ ہی جو ایک برا طریقہ جو چھانٹے ہوے چاول اور چھانے دھوئے آٹے میں چل رہا ہے، کاہلی کیوجہ سے چھوڑ نہیں سکتے. ابھی اسکا کافی پرچار بھی نہیں ہو پایا ہے.

کھانے میں میٹھا بھی ضروری ہے. پہلے ہندوستان کی بہت سی جگہوں پر گنے کی کاشت ہوتی تھی، اسی کو کولھو میں پیر کر گاؤں ہی میں گڑ بنا لیا کرتے تھے. گاؤں میں کہیں کہیں چھوٹے موٹے کارخانے میں گڑ اور چینی بنا لیا کرتے تھے. گذشتہ پچیس تیس سال میں یہاں کے تقریباً سبھی کارخانے بند ہو گئے، ان کی جگہ شکر کے بہت بڑے بڑے

کارخانے کھول دیئے گئے. سائنس جاننے والوں کا کہنا ھے کہ چھوٹے کارخانوں کی تیار کی ھوئی شکر میں جتنی اصلی زندگی ھوتی ھے اتنی بڑے کارخانوں کی تیار کی ھوئی شکر میں نہیں. ایسی شکر کا بھی وھی حال ھے جو کٹے ھوئے چاول اور پسے ھوئے آٹے کا ھے. ان بڑے کارخانوں سے گاؤونکی زندگی میں تھوڑا فرق آگیا ھے. یہ کارخانہ کسان سے گنا «ایکھ» لے لیتا ھے پھر اسے کارخانے کے ایک حصہ میں ڈال دیتا ھے، دوسری طرف مختلف ترکیبوں سے گزر کر شکر نکل آتی ھے. یہ کارخانہ بہت سا گنا ایک ھی روز میں پیر لیتا ھے. جسطرح گاؤونمیں پہلے ہزاروں کولھو چلتے تھے وھی کام اب ایک کارخانے کیلیئے کافی ھوتا ھے. اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ کھیتی کا جو کام فائدہ اور آرام پہونچاتا تھا وہ جاتا رھا. کسان لوگ اپنے چھوٹے بیلوں سے کھیت آباد کیا کرتے تھے، اس میں سے اپنے کام کیلیئے کئی قسم کا اناج پیدا کر لیا کرتے تھے. اسکے ساتھ ھی ضرورت کے مطابق نقد رقم کے لئے گنی کی کھیتی کرکے گڑ بنا لیا کرتے، جسے ان کے بال بچے کھاتے تھے اور جب ضرورت زیادہ ھوتی تو اسے بیچکر لگان

دینے اور کپڑا وغیرہ لینے میں خرچ کیا کرتے تھے. اس سے سال بھر دھندا چلتا تھا. جب کھیتی کے کاموں کی بہت زیادہ مصروفیت نہیں رہتی اس وقت ایک کام ہاتھ میں رہتا تھا. لوگ کچھ گنا چوستے کچھ رس پیتے اور کچھ گڑ کھایا کرتے. گنے کے ہرے پتے ان کے مویشی کھاتے، ان میں بھی جو تھوڑی شکر کا حصہ رہتا اس سے دوسرے جانور فائدہ اٹھاتے. اس طرح گنے کی کھیتی کم ہونے پر بھی بہت سے لوگوں کو اس سے فائدہ ہوتا تھا.

لیکن اب بڑے بڑے کارخانوں کے کھل جانے سے کچھ پیسے زیادہ مل جاتے ہیں. اس لئے جہاں جہاں کارخانے ہیں گنے کی کھیتی بہت بڑھ گئی. اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کارخانے نہیں ہیں وہاں گنی کی پیداوار کی مقدار پہلے سے کم ہو گئی. کسان اب اس کا خیال نہیں کرتا کہ اسے کتنی زمین میں کتنا غلہ پیدا کرنا چاہئے جس سے وہ گڑ بنا سکے. اب تو روپے کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ گنا بوتا ہے اور وہ روزانہ اتنا گنا کاٹ لیتا ہے جتنا وہ کارخانے میں پہونچا سکے. گنے کا پتہ ایک ساتھ ہی اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ مویشی

اسے کھا کر پچا نہیں سکتے۔ چونکہ وہ جلد سے جلد سارا گنا کاٹ کر کارخانے میں پہونچانے کی کوشش کرتا ھے اس لئے یہ پتی سارے موسم کے بجائے چند دنوں ھی میں ختم ھو جاتی ھے، اس لئے اس کے مویشی ایک خوش مزہ اور قوت دینے والے چارہ سے محروم ھو جاتے ھیں۔ جو بیل پہلے کولھو میں کام دیا کرتا تھا وھی اب گاڑی میں جت کر گنا ڈھونے کا کام کرتا ھے۔ اس کے لئے بیل کو اب بہت دور دور، چاھے کارخانے تک یا ریل کے اسٹیشن تک، گنا پہونچانے کیلئے جانا پڑتا ھے۔ وھاں اسے گھنٹوں اور کبھی تو ایک دن سے بھی زیادہ گاڑیوں کی قطار میں کندھے پر بھاری بوجھ لادے ھوئے چپ کھڑا رھنا پڑتا ھے۔

گاؤوں میں جب گڑ بنتا تھا اس وقت گنا پیر کر رس نکالنے کے بعد جو میٹھے دنٹھل بچتے تھے اسکو سکھا کر اسکا باریک حصہ بیل کو کھلاتے تھے۔ اور چھوٹے حصہ کو کچھ گڑ بنانے میں اور کچھ گھر میں جلانے کے کام میں لاتے تھے اب یہ سیدھا کارخانے میں چلا جاتا ھے۔ بہت سے آدمی، جو گڑ کے کام میں لگے رھتے تھے، اب بیکار

ہو گئے۔ کارخانے میں تو بہر حال بہت کم آدمی کام کرتے ہیں۔ لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ کارخانے کا نتیجہ، خواہ وہ کپڑے بننے کا ہو یا چاول کوٹنے کا۔ خواہ آٹا پیسنے کا ہو یا شکر بنانے کا، بہت سے لوگوں کیلئے بیکار ہوتا ہے، اگرچہ دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے بہت کام ہوا۔ لیکن یہ تو اب غور کرنے سے ہی ظاہر ہو جائیگا۔

حساب لگا کر دیکھا گیا ہے کہ کسی کارخانے کا ایک مزدور جب کارخانے میں سوت کاتنے کا کام کرتا ہے تو وہ چوبیس گھنٹہ کے اندر اتنا سوت کئی تکلوں کے ذریعہ سے کات سکتا ہے جتنا چرخے پر کاتنے والے تقریباً دو سو آدمی مل کر چوبیس گھنٹہ میں کاتیں گے۔ جو کپڑے کے کارخانے میں بنائی کرتا ہے وہ تقریباً اتنا کام کر لیتا ہے جتنا کام دس بارہ بننے والے کرتے ہیں۔ دیکھنے میں تو ایک جگہ ہزار دو ہزار مزدور ڈھیر کا ڈھیر کپڑا تیار کر دیتے ہیں۔ اسلئے لوگ سمجھتے ہیں کہ بہت لوگوں کو روزگار مل گیا۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں اور اس طرف انکا کبھی دھیان نہیں جاتا کہ اتنا ہی کپڑا تیار کرنے میں کتنی زیادہ تعداد میں مزدور

گاؤونمیں کام کرتے، اگر وہ کپڑا چرخوں اور کارگاھوں پر تیار کیا گیا ھوتا. اسطرح کارخانے کے مزدوروں نے کئی گنے بیکار ھو گئے.

یہ بات صرف کپڑے ھی کے کارخانے کے متعلق نہیں ھے بلکہ سبھی کارخانوں کا حساب ایسا ھی ھے. فرق اتنا ھی ھوتا ھے کہ کسی کارخانے کی وجہ سے بیکاری بہت زیادہ ھوتی ھے اور کسی میں اسکی نسبت سے کم ھوتی ھے. لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کارخانے کا نتیجہ یہ ھے کہ بیکاری بڑھتی ھی ھے، گھٹتی نہیں. اس طرح جب کپڑے کے کارخانوں سے کروڑوں آدمیوں کی بیکاری بڑھی تو چاول، شکر، آٹے کے کارخانوں سے بیکاری کچھ کم نہیں ھوئی. تقریباً اس نسبت میں تو ان سے بڑھی ھوئی بھی ھے. اسلئے گاندھی جی کا دھیان جب ان چیزوں کی طرف گیا کہ چرخہ کے علاوہ گھریلو کاموں کی طرف بھی دھیان دیا جانا اس سے کہیں بہتر ھوگا. اسلئے انہوں نے ان پیشوں ھی کو زیادہ اھمیت دی جو انسانی زندگی کیلئے مفید اور ضروری چیزیں تیار کرتے ھیں، اور جو اسیوجہ سے بہت رائج بھی ھیں. ان سے گاؤں والوں

کو روزگار ملنے کے علاوہ عام لوگوں کی تندرستی کے سدھار میں بہت مدد ملنے کی، جیسا اوپر بتایا گیا ھے، بہت امید تھی.

شکر اور گڑ کے متعلق ایك چیز اور بھی جنتا کے سامنے زور دیکر رکھی. هندوستان میں بہت سی چیزیں ایسی هیں جن کا رس نکال کر گڑ اور شکر تیار هو سکتی ھے، جیسے تاڑ کھجور وغیرہ. اس کے درختوں سے کہیں گڑ کافی بنتا بھی ھے. ویدك اور یونانی طبیب اس گڑ اور شکر کو گنے کے گڑ اور شکر کے مقابلہ میں دواؤں کیلئے زیادہ مفید سمجھتے هیں. جہاں ان درختوں کی تعداد بہت ھے وهاں بھی ان سے گڑ نہیں بنایا جاتا. ملك میں معلوم نہیں کتنے کروڑ ایسے درخت هیں جو یونہیں کھڑے هیں، لیکن جن کا استعمال اگر کیا جائے تو بہت زیادہ گڑ یا شکر بن سکتی ھے. ان درختوں سے جو رس نکالا جاتا ھے وہ فائدہ مند گڑ کی بجائے تاڑی کی شکل میں خرچ هوتا ھے، جس سے نقصان بھی هوتا ھے. اس لئے مہاتما جی نے تاڑ کے رس سے گڑ بنانے کا کام شروع کرایا، کچھ اور لوگوں کو بھی ایسے کام میں لگایا. جہاں ایسا گڑ بنتا ھے وهاں اس کا بنتا دیکھ کر اس کا پرچار اور

جگہوں پر بھی کیا جائے. اگر سب تاڑ کے درخت گڑ بنانے کے کام میں لائے جائیں تو بہت زیادہ گڑ بن سکتا ھے. یہ خیال کیا گیا کہ صوبہ بہار میں جتنے تاڑ ھیں اگر ان سبکو گڑ کے کام میں استعمال کیا جائے تو اتنی شکر تیار ہو سکتی ھے جتنے بہار کے سب کارخانے مل کر کرتے ھیں. آجکل گڑ اور شکر کے کارخانے زیادہ تر بہار اور یو-پی (صوبہ متحدہ) ھی میں ھیں، انمیں کافی شکر تیار ھوتی ھے. لیکن تاڑ کے درختوں کے استعمال سے جتنے لوگوں کو کام ملے گا وہ کارخانے میں کام کرنے والوں سے بہت زیادہ ملیگا. اسکے ساتھ ھی گنے کی کھیتی کی ساری زمین دوسرے کام میں آ سکے گی. اس صورت میں زمین کو مصروف کئے بغیر ھی ملك کو اتنی شکر مل جائیگی.

ایك اور مسئلہ کی طرف بھی دھیان دیا گیا. اس سے بہت ھی مفید غذائی چیزیں بغیر کسی وجہ اور محنت کے لوگوں کو مل سکتی تھیں. وہ شہد ھے. انسان کو محنت کر کے اسے پیدا نہیں کرنا پڑتا تھا. اسے تو شہد کی مکھی ھی اپنی محنت سے پیدا کرتی ھے. انسان کو تو صرف جمع شدہ شہد کو نکال

لینا پڑتا ھے. اگر شہد کی مکھیوں کیلئے کوئی آرام دہ جگہ مقرر کردی جائے، اور شہد نکالنے میں تھوڑی احتیاط برتی جائے، تو جس چھتے کو مکھیاں بہت محنت سے بناتی ھیں، وہ ایك ھی بار شہد نکال کر توڑ نہ دیا جائے، تو بہت جلد جلد مکھیاں کافی شہد تیار کر کے دے سکتی ھیں. چھتہ بنانے میں انکا بہت وقت بھی لگتا ھے، اور ان کو محنت بھی کرنی پڑتی ھے. جو لوگ ان کے پالنے کا طریقہ ٹھیك نہیں جانتے ھیں، وہ چھتے کو توڑ کر شہد نچوڑ تے ھیں. اسکا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ مکھیوں کو پھر محنت کرکے شہد تیار کرنا پڑتا ھے. جب چھتہ تیار ھو جاتا ھے. تو اسی وقت وہ محنت کر کے شہد جمع کر سکتی ھیں. اگر چھتہ نہ توڑا جائے، اور بغیر توڑے ھی شہد نکال لیا جائے، تو ان کا جو وقت چھتہ بنانے میں لگتا ھے، وہ شہد بنانے میں لگے، اسطرح کم وقت میں شہد تیار ھو جائے. شہد بہت ھی مفید غذائی چیز ھے. اگر شہد کی مکھیوں کیلئے آسانی کر دی جائے، تو بغیر ھمارے کچھ کئے ھوئے، وہ ھمکو شہد دیتی رھیں گی.

جاننے کے قابل ایك اور بات یہ بھی ھے. کہ پھول

پھولنے کی فصل سے رس لیکر شہد کی مکھیاں شہد تیار کرتی ہیں. لیکن اس سے فصل کو کچھ نقصان نہیں پہونچتا ھے. ان کے بڑھنے سے پھول کی فصل کی اور بھی ترقی ہو جاتی ھے. اپنے ساتھ کوئی ایسی چیز لیجا کر وہ چھوڑ آتی ہیں. کہ جس سے غلہ کے دانے اور زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں. چونکہ اس طرح گاؤں کے لوگوں کو بغیر محنت اور بغیر خرچ کے ایک بہت اچھی غذائی چیز مل جاتی ھے. اسلئے دیہی پیشوں میں شہد کی مکھی پالنے کی جانب زور دیا گیا. اس کی واقفیت حاصل کرنا. اور تلاش کر کے نئی باتیں نکالنی، دیہی پیشے کا ایک اہم کام ہو گیا ھے. اگر اسکا پورا پرچار ہو جائے. تو ملک کو بہت فائدہ ہو اور لوگوں کی تندرستی بھی اچھی ہو جائے.

غذائی چیزونمیں سب سے بڑا مقام غلہ کا بھی ھے. اس لئے غلہ کو زیادہ اگانا بہت ضروری ھے. دیہی پیشے کا یہ ایک بڑا کام ھے کہ غلہ کی اگائی کس طرح بڑھائی جائے. یہ ایک مسلمہ بات ھے، کہ زمین میں کھاد دینے سے، اسکی طاقت بہت بڑھ جاتی ھے. اسکا سبب یہ ھے کہ زمین میں

کچھ ایسی چیز ہوتی ہے، جسکے ذریعہ سے ہی غلہ بنتا ہے. اس لئے جب ایکبار فصل کاٹ لی جاتی ہے، تو زمین کی طاقت کا ایک حصہ نکل جاتا ہے. کھاد اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے. یہ کھاد زیادہ تر ایسی چیز سے تیار کی جا سکتی ہے، جو یا تو پھینک دی جاتی ہے، یا برباد ہو جاتی ہے، یا سڑ کر بدبو پھیلاتی ہے، جو تندرستی کیلئے مضر ہو جاتی ہے. اسلئے ایسی سب چیزوں کو اس طرح جمع کرنا، کہ وہ کھاد کی شکل اختیار کر لیں اور انسانی سماج کیلئے نقصان دہ نہ رہکر غذائی چیزوں کے اگانے میں مدد کر سکیں، یہ گاؤں سدھار اور گاؤں پیشے کا ایک بہت بڑا کام ہے.

یہ دیکھا جاتا ہے، کہ انسان کا پیشاب پاخانہ گھر کا کوڑا وغیرہ، کسی حد تک کھاد کے کام میں یہ چیزیں لائی جاتی ہیں. لیکن اگر ٹھیک انتظام ہو تو کوئی بھی چیز برباد نہ ہونے پائے. ابھی تو گوبر بھی زیادہ تر جلانے کیلئے، اپلوں کی صورت میں خرچ کر دیا جاتا ہے. مویشی کا پیشاب بیکار سوکھنے دیا جاتا ہے. جس کسان کے پاس جلانے کا

کوئی دوسرا سامان نہیں ھے، اسکو گوبر سے اپلے پاتھنے کی ضرورت ہوتی ھے. لیکن یہ ممکن ھے، کہ اگر اس گوبر کی کھاد کیلئے، ٹھیك طور سے کوشش کی جائے، تو اس سے اتنا ایندھن پیدا کیا جا سکے. جتنا اپلے سے ملتا ھے. اور غلہ تو پھر مل ھی جائے. لیکن یہ صرف گائے کے پیشاب اور گوبر ھی کے متعلق نہیں ھے، انسان کے پیشاب پاخانے کا بھی اچھا استعمال ھو سکتا ھے. یہ کام اچھائی اور صفائی کے ساتھ کیا جا سکتا ھے. تھوڑی سی عقل سے کام لیکر ان سے کام لیا جا سکتا ھے. آجکل گاوئںمیں ایسا برا طریقہ ھے، کہ گھر کے قریب راستے پر اور پانی کی جگہ کے پاس ھی لوگ پیشاب پاخانہ کر دیا کرتے ھیں. اگر لوگ اس کا خیال رکھیں تو کھیت میں وہ کھاد بن سکتا تھا. اور گاؤںمیں گھر کے نزدیك یا کنویں پر گندگی بھی نہ پھیلے اور ساتھ کھیتوں کو بھی ایك اچھی کھاد مل جائے. یہ بات سمجھنے کی ھے کہ اگر پاخانہ یونہیں چھوڑ دیا جائے، تو اس کا عرق زیادہ تر سوکھ جاتا ھے، جس سے زمین کو جتنا فائدہ ھونا چاھئے اتنا نہیں ھوتا. لیکن اگر وہ مٹی کے نیچے ڈھك دیا جائے، تو اس کا سارا

حصہ کسی نہ کسی شکل میں کھاد بن جاتا ھے۔ اس لئے اسے مٹی سے ڈھك دینا سب سے اچھا ھوتا ھے۔ یہ آسانی سے کیا بھی جا سکتا ھے۔ ھوتے ھوئے کھیت میں تھوڑی مٹی ھٹا کر پاخانہ کرنا اور پھر سے مٹی ڈال کر اسے ڈھك دینا، کوئی مشکل کام نہیں، صرف تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ھے۔ شہر میں تو یہ کام میونسپلٹی کرتی ھے۔ شہر کی تمام گندگی کھیت میں گاڑ دیتی ھے، لیکن آج بھی کھاد بنانے کا انتظام جیسا چاھئے شاید ھی کہیں ھوتا ھو اس لئے یہ ایك ایسا انتہائی ضروری کام ھے، جسکی طرف سبکو دھیان دینا چاھئے۔ اسمیں میونسپلٹی اور گاؤں کے لوگوں کا دھیان دینا ضروری ھے۔ جتنی چیزیں کوڑے کی شکل میں پھینکی جاتی ھیں سب کھاد کی شکل میں تبدیل کی جا سکتی ھیں۔ کھڈ بنا دینا کچھ مشکل نہیں ھے، ایك دو فٹ گہرے گڈھے میں کوڑے کو تہ بہ تہ لگا کر درمیان میں گوبر لگا کر پورا بچھا دینا کافی ھے۔ اور کبھی کبھی تھوڑا پانی ڈال دینے سے بھی، چار چھ ماہ کے بعد یہ اشیاء کھاد بن جاتی ھیں۔ وہ اعلی قسم کی کھاد ھوتی ھے کیونکہ اسمیں سب چیزیں قدرتی ھوا کرتی ھیں۔ ان

چیزوں کو کھاد بنا دینے میں کسی خاص کیمیاوی چیز کے استعمال کی ضرورت نہیں ہوتی. قدرت ان چیزوں کو کھاد خود بناتی ھے. انمیں ایسے کیڑے ہوتے ھیں جو کھیتی کیلئے ضروری ھیں اور جو زمین کو غذائی چیزیں پہونچانے کے علاوہ اسکو اس قابل بناتے ھیں کہ وہ ضروری مقدار میں پانی اور ھوا، کھینچ سکے. اسلئے اس علم کے عالموں کے خیال سے اس طرحکی تیار کی ہوئی کھاد کھیتی کیلئے بہت مفید اور ضروری ھے. دیہی کاموں کی طرف سے اس مسئلہ میں کافی چھان بین کی گئی. اسکے پرچار کا انتظام بھی کیا گیا. اور گورنمنٹ کے محکمہ زراعت کی طرف سے بھی کیا جاتا ھے. لیکن اس میں شك نہیں، کہ یہاں اسکی ابھی کم گنجائش ھے. آج جو غلہ کی کمی ہو رہی ھے اگر ٹھیك انتظام ہو، تو بہت حد تك دور کی جا سکتی ھے.

ستائیسواں باب

غذائی چیزونمیں گائے کے دودھ کی بہت اهمیت هے۔ یه ایك طرحسے ان سبھی چیزوں کا داتا هے جو انسانی زندگی کیلئے ضروری هیں۔ عام لوگونمیں کئی ایسے هیں جو پیدائش کے بعد چند ماہ تك دودھ کے ذریعه هی زنده رهے اور پلے هیں۔ اس ملك میں دودھ کی اهمیت پرانے زمانه هی سے لوگوں نے اتنی سمجھی که اسے امرت کا مقام دیا۔ آج ملك کی بد قسمتی هے که بچے کیلئے بھی دودھ ملنا کٹھن هو گیا هے، ایسا معلوم هوتا هے که گویا اب دودھ نہیں ملیگا۔ دودھ گائے سے ملتا هے اور بھینس بکری وغیره سے بھی ملتا هے، لیکن کئی وجه سے، جنکی تفصیل آئنده آئیگی، گائے هی کو بہت اهمیت دی گئی هے۔

هندوستان کھیتی کا ملك هے، جہاں سو میں تقریباً ستر آدمی گاؤونمیں رهتے هیں، جو کھیتی سے هی کسی نه کسی شکل میں اپنا گزاره کرتے هیں۔ دوسرے ملکوں جیسے دکھنی افریقه، امریکه، اسٹریلیا وغیره میں آدمیوں کی آبادی کے

اعتبار سے زمین بہت ھے. اس لئے جو لوگ کھیتی کرتے ھیں ان کے پاس زمین کافی رھتی ھے. ایک ایک کا کھیت بہت بڑا ھوا کرتا ھے. ھندوستان میں آبادی زیادہ ھونے ارر بہت دنوں سے کھیتی جاری رھنے کی وجہ سے زمین بہت آباد ھو گئی ھے. لیکن چھوٹا چھوٹا کھیت ایک ایک گھر یا کنبے کیلئے رہ گیا ھے. ایسے کھیتوں کا دار و مدار زیادہ تر بیلوں پر ھی ھے. کیونکہ وھی کھیت جوتتے ھیں. فصل تیار ھونے پر اسے گاھتے ھیں، بوجھ ڈھونے کیلئے گاڑی میں جوتے جاتے ھیں. اس لئے بیل کے بغیر کسان کا ایک قدم بھی چلنا کٹھن ھے. گائے دودھ بھی دیتی ھے اور کھیتی کیلئے بیل بھی. اگرچہ بھینسا کھیت کا کچھ کام کر سکتا ھے، لیکن پھر بھی اس سے اتنا کام نہیں ھوتا جتنا بیل کر سکتا ھے. کہیں کہیں بھینسے کھیت میں لگائے جاتے ھیں، مگر وہ اتنا کام نہیں دیتے جتنا کہ بیل. گائے کی زیادہ اھمیت اسی وجہ سے ھے. اس کے علاوہ بھینس یا بھینسے گائے کے مقابلہ میں بہت کھاتے ھیں اور انکی پرورش میں بھی بہت خرچ ھوتا ھے. اس سے ظاھر ھے کہ گائے کا پالنا صرف دودھ یا دودھ سے

بنی ہوئی دوسری غذائی چیزوں کیلئے ہی ضروری نہیں بلکہ غلہ پیدا کرنے کیلئے بھی، جو انسان کی اہم غذا ہے، بے انتہا ضروری ہے۔

مہاتما جی نے گائے کی اہمیت کو خوب سمجھ لیا تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ہندو سماج اور ہندو مذہب میں اسکو یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے۔ اسلئے گائے سیوا کو وہ ایک بہت بڑا اہم کام سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے گاؤں سدھار کا کام شروع کیا اور گاؤں والوں کا حوصلہ بڑھایا تو اسمیں گائے سیوا کو بھی اونچا مقام قدرتی طریقہ سے مل گیا۔ جب اس کیلئے گئو سیوا منڈل کو سیٹھ جمنا لال بزاز کی ماتحتی میں قائم کرایا، اسوقت اسے آجکل کے رواجوں سے بچا کر، سچی خدمت کا انتظام کرانا اور اس کے متعلق ضروری تحقیقات کرانی، اس منڈل کا مقصد اور کام کا میدان قرار دیا۔

ہندو گائے کو ماتا سمجھتے ہیں اور اسکی پوجا بھی کرتے ہیں۔ «ہندو پورانوں» (کتابوں) میں دودھ کے سمندر کا بیان ملتا ہے۔ کرشن لیلا میں تو گائے کی پرورش، دودھ مکھن وغیرہ کا صاف بیان موجود ہے۔ ان دنوں جائداد اور مال

والا وهی کہلاتا تھا جسکے پاس گائیں زیادہ هوتی تھیں، اور یہی اسکی مالداری کا معیار تھا. بہت سی جنگیں گائے کی وجه سے هوا کرتیں. اب اس وقت کا طریقه تو محض ایک خیال رہ گیا ھے، پھر بھی بیسیوں خیراتوں میں گائے، اسکے دودھ اور اسکے گوبر کا مقام آج بھی هندو سماج میں بہت بڑا ھے. گائے کی خیرات کرنی ایک بڑے ثواب کا کام سمجھا جاتا ھے. کسی بھی مبارك تاریخ پر یا بڑی مذھبی رسم کے موقع پر گائے کا دان ھی ایک ضروری نیک کام مانا جاتا ھے. گوپا اسٹمی کے موقع پر خاصکر گائے کی پوجا کی جاتی ھے. لیکن ان سب باتوں کے باوجود آج جس قدر گائے کی بری حالت هندوستان میں هوتی ھے ویسی کہیں نہیں هوتی، اسکو پورا کھانے کو بھی نہیں ملتا، یه ٹھیك طرح سے رکھی بھی نہیں جاتی. نتیجه یه هوتا ھے که اگرچه مویشیوں کی تعداد هندوستان میں بہت زیادہ ھے مگر پھر بھی دودھ نہیں ملتا. بیل بہت کمزور هوتا جا رها ھے، جس سے کھیتی بہت کمزور هوتی جا رهی ھے. جیسے جیسے آبادی بڑھتی جاتی ھے مویشیوں کے چرنے کے میدان بھی آباد هوتے جاتے هیں.

گایوں کے چرنے کیلئے بہت سے مقامات پر بہت کم زمین رہ گئی ہے اور بیشتر جگہوں پر تو بالکل ہی نہیں ہے۔

گئو سیوا میں سدھار کرنا ان سب وجہوں سے بے انتہا ضروری ہو گیا ہے۔ بقر عید میں گائے کی قربانی سے کہیں کہیں ہندو، مسلمانوں سے جھگڑا بھی کرتے ہیں۔ لیکن گائے کس طرح آرام سے رکھی جائے، کس طرح زیادہ مفید بنائی جائے، اس پر ہندو غور نہیں کرتے۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جو گائیں قربانی کیلئے یا اور اسباب سے ذبح کی جاتی ہیں انہیں سے زیادہ تر تو لوگ ہندوؤں کے ہی گھروں سے مول لے کر ذبح کرنیوالے ذبح کرتے ہیں۔ یا یہ ہے کہ اسوقت جیسی گائیں ہمارے پاس زیادہ تر ہوتی ہیں ان کی پرورش کٹھن ہو گئی ہے، ان پر جو خرچ کیا جاتا وہ وصول نہیں ہو پاتا، مدد کرنے کے بدلے گائے ایک بوجھ ہو جاتی ہے۔ اسکا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ گائے رکھنے والے کیلئے اسے ذبح کرنیوالے کے ہاتھ بیچ دینا ہی بہت مفید ہوتا ہے۔ خاصکر کلکتہ جیسے بڑے شہر میں، ایک یا دو جھول سے زیادہ رکھنا اتنا خرچیلا کام ہو جاتا ہے کہ بہت قیمتی

گائے کو بھی ذبح کرنیوالے کے ھاتھ بیچ دینا، زندہ گائے رکھنے کے مقابلہ میں، بہت مفید ھوتا ھے. اس سے موجودہ گایوں کا ستیاناس تو ھوتا ھی ھے، ساری نسل بھی روز بروز خراب ھوتی جاتی ھے. آجکل کی کیفیت یہ ھے کہ اچھی نسل کی گائے کا ملنا مشکل ھوتا جا رھا ھے.

بہت سے مقامات پر ھندو بوڑھی، لنگڑی. اور بیمار گایوں کیلئے پنجراپول (گئو شالہ) کھولنا ایک مذھبی کام سمجھتے ھیں. اس میں رقم بھی کافی خرچ کرتے ھیں. کہیں کہیں ان گئو شالاؤں میں اچھی گائیں بھی رکھی جاتی ھیں لیکن زیادہ تر یہ گئو شالے بیکار جانوروں کیلئے ھی ھوا کرتے ھیں. مہاتماجی نے بہت ھی غور کے بعد گائے سیوا اور گائے رکھشا کے سارے طریقے بدلنے کا ارادہ کیا. اس لئے انہوں نے ایک مخصوص گئوشالہ اپنی نگرانی میں قائم کرایا. جس کے چلانے کا بوجھ سیٹھ جمنالال بزاز اور ان کے بھتیجے رادھا کشن بزاز سے اپنے اوپر لیا. اس کے بعد سبھی پڑھے لکھوں کا جو مسئلہ کا علم رکھتے تھے ایک جلسہ کیا گیا. وھاں اس قسم کی باتوں پر بحث اور غور کر کے ایک اصول

بنایا گیا. اس گئوشاله اور دوسری جگھونمیں جو کام کیا گیا اس کا نتیجه یه هوا که ایك کافی اچھا پروگرام بن سکا. اگر اس پروگرام کے اعتبار سے کام کیا گیا تو اس میں شك نہیں که گائے کی نسل کی اچھی ترقی هوگی اور هندوستان کو دودھ اور بیل دونوں هی بہتر ملیں گے.

ابتك برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بھی بہت سی گئوشالائیں قائم کی گئیں تھیں. خاصکر فوج کیلئے اور ان بڑے شہروں کے لئے جہاں خاصکر انگریز افسر رہا کرتے تھے. اچھا دودھ مکھن مہیا کرنے کے خیال سے یه گئوشالائیں قائم کی گئیں تھیں. اس لئے ان گئوشالاؤں پر قدرتی طور سے زیاده توجه اس بات پر بھی کی گئی که زیاده دودھ کے کیسے ملے. گایوں میں کچھ اچھی نسل کی گائیں هوتی هیں، جو زیاده دودھ دیتی هیں، لیکن ان کے بچھڑے ویسے اچھے محنتی اور کام کرنیوالے نہیں هوتے. دوسری گائیں ایسی هوتی هیں که دودھ تو دیتی هیں لیکن اتنی مقدار میں نہیں جتنی مقدار میں پہلی قسم کی گائیں دیتی هیں. البته ان کے بچھڑے بہت اچھے هوا کرتے هیں، جو زیاده کام کر سکتے هیں اور زیاده

بوجھ ڈھو سکتے ھیں. ایک تیسری قسم کی ایک ایسی گائے ھے جو دودھ تو کم دیتی ھے مگر ان کے بچھڑے معمولی طور سے اچھے ھوا کرتے ھیں. چوتھی قسم کی گائے ایسی قسم کی ھے جو نہ زیادہ دودھ ھی دیتی ھے اور نہ اچھے بچھڑے. انگریزوں کے زمانہ میں گئو شالاؤں میں چونکہ دودھ ھی کی زیادہ تلاش تھی، اس لئے پہلی قسم کی گایوں ھی کو زیادہ اھمیت دی گئی. ان کے پالنے پوسنے کا کام زیادہ کیا گیا. جہاں جہاں ایسی نسل کی گاییں ملیں وہ منگا کر ان گئو شالاؤںمیں رکھی گئیں. ان گئو شالاؤں میں انہیں کو مدد دیکر ان کی ترقی کی گئی. لیکن پھر بھی سرکاری، خاصکر فوجی گئو شالاؤں کا، خرچ کافی رھا. تقریباً سبھی ایسی گئو شالائیں نقصان اٹھا کر چلائی جاتی رھیں. کیونکہ ان کو اپنے سارے خرچ صرف دودھ ھی سے نکالنے پڑتے تھے. بچھڑے کسی کام کے نہیں ھوتے تھے. یہاں تک کہ بچھڑے رکھے بھی نہیں جاتے تھے. جو پیدائش کے تھوڑے ھی دنوں بعد گوشت کیلئے ذبح کر دئے جاتے تھے. اگر وہ بچ بھی جاتے تو ان کی نسل ایسی تھی کہ وہ بہت کام کے نہ ھوتے.

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان کو دودھ اور بچھڑے دونوں ہی کی ضرورت ہے. اسلئے یہ ظاہر ہو گیا کہ یہاں دوسری قسم کی گایوں کو، جہانتک ہو سکے، گاؤں ہاں بڑے شہروں میں، جہاں صرف دودھ ہی کی ضرورت ہو اور بچھڑوں کی نہ ہو، وہاں شاید پہلی قسم کی گائے ہی کچھ کام دے سکتی ہے. اگرچہ یہ بھی شاید مہنگی ہی پڑے گی کیونکہ صرف دودھ ہی سے سارا خرچ نکالنا پڑے گا. اگر انگریزی عملداری کے طریقہ کے خلاف بچھڑے زندہ رکھے جائیں تو ان کو کھلانا پڑے گا. لیکن ان سے بہت کام نہیں نکلے گا. اسلئے یہ فیصلہ ہوا کہ جو گئو شالہ قائم کی جائے اس میں زیادہ تر اسی قسم کی سب خصوصیت والی، یعنی جو دودھ اور بچھڑے اچھے دیں، گائیں رکھی جائیں اور ان کی نسل بھی سدھاری جائے.

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دودھ اچھا دیکھ کر لوگ گایوں کو دور دور سے بہت خرچ کر کے منگاتے ہیں. جب ریل نہیں تھی اس وقت جانوروں کا بہت دور آنا جانا نہیں ہوا کرتا تھا. اس طرح ملک بھر میں کئی نسلیں قائم ہو گئیں جو

کسی خاص مقام ھی میں پلیں اور بڑھیں. اس زمانہ میں بھی لوگ گائے کی پرورش اور نسل کی باتیں سمجھتے تھے، ان کے علاج کا ان کو علم بھی آتا تھا. جب جہاں جس طرح کے بیل کی ضرورت سمجھی جاتی، اس وقت وھاں اس قسم کے بیل نسل کی اصلاح کر کے تیار کئے گئے، جو آج بھی ملتے ھیں. اس ملك میں ایسے بیل ملتے ھیں جو آھستہ آھستہ تو چلتے ھیں لیکن بوجھ کافی ڈھو سکتے ھیں. ایسے بیل بھی بھی ملتے ھیں جو بوجھ تو کم ڈھوتے ھیں لیکن تیز دوڑ سکتے ھیں، تقریباً گھوڑے کے برابر رتھ کیساتھ تیزی سے دوڑ سکتے ھیں. معمولی طور سے اکثر بیل ایسے بھی ھوتے ھیں جو ھل چلاتے اور بوجھ ڈھوتے ھیں اور معمولی چال سے چلتے بھی ھیں. گائیں بھی ایسی تیار کی گئیں تھیں، وھی آج بھی ملتی ھیں، جو مختلف قسم کے بیلوں کو پیدا کر سکتی ھیں اور جو یا تو زیادہ مقدار میں دودھ دے سکتی ھیں یا اچھے بیل.

جو طریقہ دور دور سے گایوں کو لا کر رکھنے کا، خاص کر انگریزی عملداری کے گؤ شالاؤں کی وجہ سے، چل پڑا

تھا وہ کئی طرح سے نقصان دہ ثابت ہوا. ایک تو اپنے فطری مقام سے بہت دور لے جانیکی وجہ سے وہ گائے وہاں کی آب و ہوا میں ٹھیک نہیں رہتی. دوسرے اس وجہ سے کہ اسے وہ چارہ کھانے کو نہیں ملتا جو اپنے مقام پر ملا کرتا تھا. تیسرے اسی کے لائق سبھی جگہوں پر سانڈ بھی اچھے نہیں ملتے. اگر وہ گائے اپنی ھی جگہ پر رہ گئی ہوتی تو وہ اپنی نسل کے بہت سے گائے بیل پیدا کرتی، اور اسکو اپنے ھی مقام پر ترقی کرنے کا موقع ملتا تو وہ ایک ترقی یافتہ نسل پیدا کرتی. لیکن غیر ملک میں پہونچکر وہ خود بھی کچھ دنوں کے بعد خراب ہو جاتی ھے. اسکی نسل تو اچھی ہونے سے رھی. یہ ممکن نہیں کہ سوکھے پردیشوں یعنی پنجاب، راجپوتانہ یا سندھ کی گائیں بنگال یا بہار جیسے تر حصے میں اتنے ھی آرام سے رہ سکیں جتنا انہیں اپنے پیدائشی مقام پر آرام ملتا تھا. اسلئے یہ بات اصولی طور پر ثابت ہو گئی کہ کسی ایک جگہ کی نسل کی گایوں کو کہیں دوسری جگہ لیجا کر ان سے نسل بڑھانیکی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوگی. جہاں جس نسل کا جانور زیادہ ہوتا ھے وھیں کی آب و ہوا اس نسل

کیلئے مفید ھے. اگر اسے وھاں ترقی دینے کی تدبیر کی جائے تو وہ تدبیر زیادہ کامیاب ھو سکتی ھے. جو تھوڑے بہت تجربے کئے گئے ھیں ان کا نتیجہ بہت اچھا ھوا ھے. نسل سدھارنے کیلئے گائے اور سانڈ دونوں کی ترقی ضروری ھے. لیکن گائے خواہ کتنی ھی اچھی کیوں نہ ھو، اگر اسکو سانڈ اچھا نہ ملے تو صرف اسکا بچہ ھی خراب نہ ھوگا بلکہ اسکا دودھ بھی کم ھو جائے گا. اس لئے اگر کسی مقام پر معمولی طور سے سب خصوصیتوں کی گائیں موجود ھوں اور ان کے ساتھ دودھ دینے والی نسل کا ایک سانڈ لگایا جائے تو یہ دیکھا گیا ھے کہ دودھ بڑھ جاتا ھے. اس لئے اگر کہیں دوسری جگہ سے جانور لانا ضروری سمجھا جائے تو سانڈ لانا زیادہ مفید ھوگا.

«گائے سیوا سنگھ» کا یہ اصول سا بن گیا ھے کہ گائیں کہیں اور نہ لے جائی جائیں، سب جگہ اچھی مقامی نسل کی ترقی کی کوشش کی جائے. اگر فنی طریقہ سے غور کرکے یہ معلوم کر لیا جائے کہ فلاں قسم کا سانڈ زیادہ مفید ھوگا تو اسی قسم کا سانڈ وھاں منگایا جائے، گائے منگانے کی

ضرورت نہیں ھے. اس قسم کی مقامی نسل کو سدھارنا ھی وھاں کا بڑا سدھار مانا جائے. حقیقت میں نسل سدھارنے کا کام بڑا کٹھن ھے، اس میں علم اور تجربہ کی بڑی ضرورت ھے. اس لئے یہ کام ھر ایک آدمی نہیں کر سکتا. جہاں بھی اسکی کوشش کی جائے وھاں اچھے، لائق، تجربہ کار اور علم والے ھی لوگ اس کام کا بوجھ اٹھائیں. نہیں تو اس قسم کی کوشش سے نسل کے بے کار ھو جانے کا اندیشہ ھے.

گائے سیوا سے متعلق مہاتما جی نے ملک کے سامنے ایک اور نئی اصلاح رکھی تھی اور جو ھندوستان کے لئے ایک بڑی زبردست بات تھی. گائے جب تک جیتی رھتی ھے، ھندو اسوقت تک اس سے جو کچھ کام لے سکتے ھیں وہ لیتے ھیں، لیکن اسکے مرجانے پر اسے چھونا بھی پسند نہیں کرتے. اس لئے جس ذات کے لوگ مرے ھوئے جانور کو اٹھاتے اور اسکا چمڑا وغیرہ نکالتے ھیں وہ آج ھندو سماج میں اچھوت سمجھے جاتے ھیں. چمڑے کو کام میں لانے کے لئے ھندو ھچکچاتا ھے اور اس لئے وہ چمڑے کا کام نہیں کرنا چاھتا ھے. مہاتما جی نے دیکھا کہ مردہ گایوں کے چمڑے وغیرہ سے اگر کام نہ لیا جائے

تو گائے رکھنا بڑی حد تک شاید مفید نہ ہو. اس لئے انھوں نے سمجھایا کہ ایك مری ہوئی گائے کا چمڑہ، گوشت، ہڈی، چربی اور آنتیں وغیرہ سبھی چیزوں کو کام میں لانا چاھئے. اس لئے جو کچھ پیدا کیا جا سکے اس سے پیدا کرنا چاھئے. انھوں نے وردھا کے پاس نالواڑی میں چمڑے کا ایك کارخانہ کھلوایا، جہاں مرے ہوئے مویشیوں کا چمڑہ نکال کر پکایا اور تیار کیا جاتا تھا، گوشت اور ھڈی کی کھاد بنائی جاتی تھی. آنتوں سے تانت بنتی تھی. چربی نکال کر جن کاموں میں لائی جا سکتی ان میں لگائی جاتی تھی. اسطرح دیکھا گیا کہ اگر مردہ گائے کی سب چیزیں ٹھیك طور سے استعمال میں لائی جائیں تو وہ ایك رقم دیتی ھیں.

کلکتہ جیسے بڑے شہر میں تو بیوپاریوں نے یہ بھی تجربہ سے بتایا ھے کہ جب گائے بیمار ہو جاتی ھے، اگر اسوقت اسکو پالا جائے اور اسوقت تك کے لئے انتظار کیا جائے کہ جب وہ پھر دودھ دینے لگے اور اسکے بچھڑے کو بھی ضرورت کے موافق دودھ دیا جائے، تو اس طرح گائے پالنا اتنا مہنگا پڑتا ھے کہ اس میں نفع ہو ھی نہیں سکتا. اس لئے

وهاں بہت سے بیوپاری اچھا دودھ دینے والی گائے کو باھر سے لاتے ھیں اور جہاں تك ھو سکتا ھے اس پہلے جھول کے دودھ ھی سے رقم نکال لیتے ھیں اور بچے کو بیچ دیتے ھیں. اول تو بچہ اچھی قیمت میں بك جایا کرتا تھا، اور پھر بچہ جو دودھ پیتا تھا وہ بچ جاتا تھا اور رقم بھی نکل آتی تھی. ذبح کرنے والے اس قسم کی دبلی اور سوکھی گائے کو بہت کم قیمت میں خرید لیتے تھے، اور بیچنے والے کم قیمت پر بیچ کر بھی نفع میں رھتے تھے. کیونکہ سوکھی گائے کو کھلانے کا خرچ بچ جاتا تھا. صرف دودھ سے ھی اتنی رقم مل جاتی تھی کہ گائے کی قیمت اور اسکی پرورش کا خرچ کچھ نفع کے ساتھ واپس مل جاتا تھا. قصائی گوشت، چمڑہ اور چربی وغیرہ سے جتنی رقم نکال سکتا تھا اتنی ھی رقم میں وہ گائے کی قیمت سے زیادہ نفع حاصل کر لیا کرتا تھا. اس لئے اسکو اس قسم کی گائے مول لے کر ذبح کرنے میں فائدہ ھی رھتا تھا.

مہاتما جی کو یہ سب باتیں معلوم ھو گئی تھیں. اس لئے انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ گایوں کی حفاظت اسی

وقت ہو سکتی ھے جب کہ ان کی پرورش صرف بوجھ نہ ہو بلکہ کچھ فائدہ دینے والی ہو، یعنی مالی حیثیت سے نفع بخش ہو. اس کے لئے چار چیزیں ضروری تھیں: ۱۔ گائے زیادہ دودھ دے ۲۔ اس کے بچھڑے اچھے ہوں ۳۔ اس کا گوبر اسطرح کام میں لایا جائے کہ وہ کھاد بن کر کھیتی کیلئے مفید ہو ٤۔ اس کے مرجانے پر اس کے چمڑے وغیرہ سے جو کچھ نکالا جا سکتا ھے وہ نکالا جائے. اچھا دودھ اور بچھڑا دینے والی گائے نسل کی اصلاح ھی سے پیدا ہو سکے. اس لئے انہیں جانوروں کی نسل سدھارنے پر انہوں نے زور دیا. ان کے تجربہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام، جیسا اوپر بتایا جا چکا ھے، اگر فن اور عقل کے ساتھ کیا جائے تو مفید ہو سکتا ھے. کھاد کے متعلق تجربہ کرکے انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ اس سے کھیتی کی کافی ترقی ہو سکتی ھے. چمڑے کے کام سے، جو سماج کے پرانے دستوروں کی وجہوں سے سب سے زیادہ مشکل تھا، یہ ثابت ہوا کہ وہ بھی منافع ھی کا کام ھے. جیسا اوپر کہا جا چکا ھے چمڑا وغیرہ حاصل کرنا گندہ کام سمجھا جاتا تھا. اس کام کو ضروری کام بتا کر

ایسے لوگ اسمیں لگائے گئے جنکی ذات ایسے کام کے قریب بھی نہیں جاتی تھی۔ گندگی کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ کام بھی گندہ ہے۔ اس لئے اس کے کرنے کے طریقہ میں سدھار کر کے اسمیں صفائی پیدا کرنے کی تدبیر کی گئی۔ تا کہ اس کے خلاف جو جذبہ گندگی کی وجہ سے تھا وہ کم ہو جائے۔ معمولی طور سے جو جانور مرجاتا ہے اس کے چمڑے سے، گاؤں کے اچھوت طبقہ کے لوگ۔ جوتے وغیرہ یا اور قسم کی ضرورت کی چیزیں بناتے تھے۔ اور ہڈی پھینک دی جاتی تھی جسکو گدھ اور کوے نوچا کرتے تھے۔ اس طرح ایک بہت مفید چیز۔ جسکی اچھی کھاد بن سکتی، یونہیں برباد ہو جاتی تھی۔ جہاں وہ چیز پھینکی جاتی وہاں بہت دنوں تک بدبو پھیلا کر ہوا بگاڑتی رہتی تھی اور ہڈی بیکار پڑی رہ جاتی۔ اسے جمع کر کے کچھ بیوپاری غیر ملک میں بھیج دیا کرتے تھے۔ وہاں اس سے کھاد کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں بنائیں جاتیں تھیں جن سے اچھا کام نکل آتا تھا۔

مہاتما جی نے گوشت سے کھاد تیار کرائی ہڈی الگ سے کام میں لائی گئی۔ جس سے خاص کام کھاد کا ہوتا تھا۔ چربی الگ نکال لی جاتی تھی۔ یہ سب ایک ہی ترکیب سے

ہو جایا کرتا تھا. اسطرح اگرچہ یہ کام ہندومت کے خیال سے بہت گھناؤنا ہوتا، پھر بھی اس قسم کے انہوں نے بے انتہا مفید کام ثابت کرا دئے. اس کے ساتھ ہی گندگی کے جذبہ کو بھی دور کرا دیا. جتنی گئو شالائیں ہندوستان میں ہیں، اگر وہ سب صرف بیکار مویشیوں کی پناہ میں نہ رہ جائیں بلکہ تجارتی طریقہ سے چلائی جائیں، تو جتنا خرچ ان پر آج ملک میں ہو رہا ہے اتنا انہیں سے نکل سکتا ہے. بس اس طریقہ سے وہ کام بہت زیادہ مفید ہو سکتا ہے. اس لئے ضروری ہے کہ ان گئو شالاؤں میں اچھی نسل کی گائیں رکھی جائیں جو کافی دودھ دیا کریں اور جن کے پالنے سے نفع ہو، ایسا نہیں کہ بیکار جانور گئو شالاؤں میں رہیں. جانوروں کا خرچ تو نفع ہی سے نکل آیا کرے. اگر گئو شالاؤں میں اچھے اور بیکار جانوروں کا ٹھیک تناسب رکھا جائے. چارہ پیدا کرنے اور گائے کے چرنے کیلئے گئو شالہ کے پاس کافی زمین ہو. گائے کا دودھ بیچنے کا ٹھیک انتظام ہونا چاہئے، خواہ وہ دودھ کی شکل میں ہو یا اس سے اور چیزیں بنیں. گائے کے پیشاب، گوبر اور گئو شالہ کے کوڑے سے کھاد بنانے کا ٹھیک

انتظام ہو، اس کھاد کا بھی اچھا استعمال ہو. گائے کی نسل سدھارنے کی اچھی تدبیر ہو. مردہ جانوروں کے چمڑے وغیرہ کے استعمال کیلئے گئو شالہ کے ساتھ ہی چرم آلے (چمڑے کے کارخانے) بھی ہوں. اس سے ہر ایک گئو شالہ بے نیاز ہو جائے. ساتھ ہی اس سے ملک کا بھی فائدہ ہونے لگے گا.

اوپر کہا جا چکا ہے کہ گائے پالنے میں خرچ کی ایک مد ایسی ہوتی ہے جسکی وجہ سے بہت نقصان ہونے لگتا ہے. بیمار گائیں جب تک کام دینے کے قابل نہ ہو جائیں اسوقت تک گائے کی نسل کی پرورش کا خرچ بہت بڑے خرچ کی مد ہوتی ہے. اس کے لئے سوچا گیا کہ گئو شالہ سے کچھ ہی دور پر اگر زمین مل جائے، جہاں بیمار گایوں کے لئے چارہ کافی ملتا ہو، تو گئو شالہ میں صرف دودھ والے جانور ہی رکھے جائیں گے. جس سے دودھ کی بکری میں آسانی ہو. اس طرح کی بیمار گائے اور اس کے بچے، جب تک کام کے لائق نہ ہو جائیں، ایسی جگہ پر رکھے جائیں جہاں ان کے پالنے کا خرچ کم ہو، تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک بہت بڑی مد پر جو خرچ ہوتا ہے اسمیں کافی کمی

هو جائے.

نسل کے بگڑنے کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ کس گائے کو کس طرح کے سانڈ کے ساتھ لگایا جانا مفید ہوگا. بغیر سمجھے بوجھے کوئی بھی سانڈ کسی گائے کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے، بس وہ نسل بگاڑ دیتا ہے. اگر نسل کو ترقی دینی ہے تو یہ ضروری ہے کہ گائے اچھے سانڈ سے لگائی جائے. غیر ممالک میں گائے کے متعلق تقریباً کوئی مذہبی جذبہ نہیں ہے. وہاں جس جانور کو بیکار سمجھتے ہیں وہ مار ڈالا جاتا ہے. اس کے گوشت وغیرہ سے جو دام نکل سکتے ہیں وہ نکال لیتے ہیں. اس لئے نسل کے سدھار کا جو کام ایسے ممالک میں کیا جاتا ہے اس کے لئے بری نسل کے جانور ذبح کردئے جاتے ہیں. اس ملک میں ایسا نہیں ہو سکتا. اسلئے کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہئے جس سے بری نسل کے جانوروں کو بغیر مارے ہوئے ان کی نسل سدھاری جا سکے. اس کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ بری نسل کے سانڈوں کا کہیں بھی میل گایوں کے ساتھ نہ ہونے پائے. ہندو سماج میں ہی

یہ بات رائج ہو گئی ھے کہ بیل کو آختہ کرنا برا کام نہیں مانا جاتا ھے. اکثر بیل آختہ کئے ہوئے بھی ہوتے ھیں، اس لئے عام رائے آختہ کرنے کے خلاف نہیں ھے. اگر ایسی تدبیر کی جائے کہ بری نسل کے سب ھی بچھڑے آختہ کردئے جائیں اور اچھی نسل کے بیل ھی سانڈ کی حیثیت سے رکھے جائیں، تو نسل سدھارنے کا کام جاری ہو سکتا ھے. یہ کوئی نئی بات نہیں ھے. کیونکہ ہندوؤنمیں شرادھ[1] کے وقت بچھڑا آزاد کرنے کی رسم عرصہ سے چلی آتی ھے. ساشتروں میں اسکے لئے اچھے سے اچھا بچھڑا داغ کر چھوڑنے کی اہمیت بتائی گئی ھے. جو بیان ایسے بچھڑوں کے متعلق ساشتروںمیں آیا ھے اس سے صاف معلوم ہوتا ھے کہ بہتر سے کہ بہتر بچھڑا داغنا چاھئے. بچھڑے کو داغ کر اسے گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی جاتی ھے، اس کا مطلب یہ ھے کہ وہ کسی جگہ باندھکر نہ رکھا جائے بلکہ آزاد ہو کر گھومتا

---

۱ — یہ وہ مذھبی تقریب ھے جو کنوار کے پہلے پندرہ روز کے اندر، جسکو اندھیرا پاک کہتے ھیں، ہوتی ھے، اور جسمیں لوگ اپنے خاندان کے گزرے ہوئے لوگوں کو ثواب پہونچانے کیلئے برھمن بھی کھلاتے ھیں اور بچھڑے کو بھی آزاد چھوڑا جاتا ھے. (مترجم)

پھرے جب تک اچھی سے اچھی غذائیں چیزیں ملیں وہ ان
کو کھایا کرے اور اچھی سے اچھی نسل پیدا کرے. لیکن
اور باتوں کی طرف سے جو بہت اہم تھیں لوگوں کا دھیان ہٹ
گیا اور ان کے مطلب کو وہ بھول گئے. کسی نہ کسی طرح
سے بچھڑے کو شرادھہ کے دن داغ دینے کا رواج جاری
ہو گیا. آجکل لوگ ایسے سانڈ کو اپنے کھیت میں نہیں چرنے
دیتے، کیونکہ زمین ان کے پاس اتنی کم ہوتی ہے کہ اس کی
فصل سے کنبہ کی پرورش اس کیلئے کٹھن ہو جاتی ہے. نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ داغ دیا ہوا معمولی بچھڑا کسی نہ کسی طرح
گھر گھر جا کر چارہ کھاتا پھرتا ہے. اچھے سانڈ سے ہی
گائیں اچھی ہوا کرتی ہیں. یہاں سانڈوں کا یہ حال ہے تو ایسے
ملک میں نسل کے بگڑنے کے سوا اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے
اس لئے آجکل کی حالت کے اعتبار سے معمولی طور پر سبھی
بچھڑوں کو آختہ کرا دینا نہایت ضروری ہے. اس طریقہ کو
شدت سے چلانا چاہئے. ساتھ ہی اس کے اچھے سے اچھے
سانڈوں کو، خواہ وہ کہیں سے بھی ملیں، لا کر پالنا چاہئے.
جو لوگ مل جل کر اسے پالیں وہ اپنی ہی گائے کے لئے اس

سے کام لیں. اگر ایک گھر والا اسے نہیں پال سکتا تو کئی گھر والے اسے مل کر پالیں. جو اسکی پرورش میں شریک نہ ہو تو وہ جب کبھی اس سانڈ سے کام لے تو فیس دے کر لے. اس طریقے سے نسل کا سدھار تھوڑی تدبیر سے ہو سکتا ھے. لیکن اس کے لئے اچھی نسل کے سانڈ خاص نگرانی میں رکھنا اور احتیاط سے اسکی پرورش کرنی ضروری ھے. اتنا ھی ضروری یہ بھی ھے کہ دوسرے بچھڑے آختہ کر دئے جائیں.

ایک اور کام بھی ضروری ھے. نسل کے سدھار کے لئے گائے بھی اچھی ھونی چاھئے. اگر بوڑھی یا کم دودھ اور کمزور بچھڑے دینے والی گائے بھی بچے دیتی رھے تو نسل کے سدھارنے میں مشکل ھوگی. اس لئے اس طرحکی گایوں کو بھی کسی نہ کسی طرح سے بچہ جننے سے روکنا ضروری ھے. اس کا ایک ھی طریقہ ھے، وہ یہ کہ سانڈوں کے ساتھ ان گایوں کا تعلق نہ ھونے دیا جائے. اگر ایسی چراگاہ مل جائے، جھاں کم سے کم خرچ میں ایسی گائیں رکھی جا سکیں، جھاں کوئی سانڈ انمیں نہ جانے پائے، تو ایک نسل کے اندر

هی سب گائیں وقت پا کر خود مر جائیں گی اور اس طرح اپنی نسل کو ختم کر دینگی. اس میں کسی طرح سے گائے کے مار نے کی ضرورت یا خطرہ نہیں ھے، اور نہ اسمیں گائے کو تکلیف هی دینے کی ضرورت ھے. چراگاھونمیں ایسی نگرانی هو کہ سانڈوں کے ساتھ ان کا میل نہ هونے پائے. جب وہ مریں تو ان کے گوشت اور ھڈی سے جو کچھ نکالا جا سکے، اور ان کے جیتے جی گوبر اور پیشاب سے جو کچھ پیدا کیا جا سکے، وہ کر لیا جائے. دونوں طرحکی آمدنی ملا کر، ان پر جو خرچ هوا هوگا، اگر سب کا سب نہیں تو اس کا ایك بڑا حصہ ضرور نکل آئے گا.

مہاتما جی نے گئوشالہ کے مختلف تجربوں سے گائے سیوا کو ایسی شکل دے دی ھے کہ وہ سچ مچ ایك نفع بخش تجارت هو جائے. اور ان کے پروگرام کو ملك نے اپنا لیا تو اسمیں شك نہیں کہ، جہاں دودھ کی اتنی کمی هو وهاں، دودھ زیادہ ملنے لگے. گھی، مکھن جہاں کم هو رہا ھے وهاں وہ بڑی مقدار میں ملنے لگے. بیل نہ ملنے یا اس کے کمزور هونے سے کھیتی جو کمزور هوتی جا رهی ھے، اس

میں جان آ جائے. گائے کے پیشاب اور گوبر اور گوشت، هڈی کی کھاد سے پیداوار اور زیادہ بڑھ جائے. گایوں کے مارنے کی وجه سے جو اچھی نسلیں غائب سی هوتی جاتی هیں وہ بند هو جائے. نسل میں کافی ترقی هو جائے. گائے کی پرورش کا بوجھ بھی نه رهے. اور ایك فائده مند پیشه هاتھ آ جائے. اور دودھ کے ساتھ ساتھ غله کی زیادتی بھی ملك میں هو جائے. اس مسئله میں بھی مهاتما جی نے ایك نیا دستور اور خیال همارے سامنے رکھا هے. یه سب چیزیں صرف اٹکل اور قیاس هی کی نہیں لائی هوئی هیں بلکه استعمال کے ذریعه سے چھوٹے پیمانے پر ثابت بھی هو چکی هیں. اس کے ساتھ هی انهوں نے ایسی تدبیر کی که جو گنده کام سمجھا جاتا تھا اور جس سے دور رهنے میں عزت کی ایك وجه مانی جاتی تھی، وہ گنده کام نه رہ جائے اور عزت پانے کی جڑ بھی کٹ جائے.

اٹھائیسواں باب

وردھا میں رہتے رہتے مہاتما جی نے یہ ارادہ کیا کہ اگر گاؤں کا سدھار کرنا ھے تو گاؤں والوں کی زندگی کو اچھی طرح سمجھنا چاھئے، اور انمیں رھکر ان کی سبھی باتوں سے واقف ہونا چاھئے. اس کے علاوہ جہاں جہاں ان کو مشکل بات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہو. سبکو جان لینا چاھئے. یہ علم اسوقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک آدمی انہیں کی طرح رہنے نہ لگے اور ان کے تجربے کو اپنا تجربہ نہ بنا لے. اس لئے گاؤنمیں دیہاتی زندگی گزارنی بہت ضروری ھے. وہ زندگی ایسی نہیں ھے جو دوسروں پر ھی ایک قسم کا بوجھ ہو جائے اور دوسروں کا آرام کم کر کے اپنا آرام بڑھاوے. بلکہ وہ زندگی ایسی ھے کہ جہاں تک ہو سکے دوسروں کے سکھ اور آرام کے بڑھانے میں اس کے ذریعہ مدد پہونچ جائے.

وردھا ایک چھوٹا سا شہر ھے. اسوقت اسکی آبادی ۲۵ ہزار ہوگی، لیکن پھر بھی وہ ایک شہر ھی ھے. اسلئے انہوں نے وہاں سے چار میل کے فاصلہ پر "سے گاؤں" نام کے

72a

گاؤں میں جا کر رہنے کا فیصلہ کیا. یہ گاؤں یوں تو چار میل کے فاصلہ پر ہے، لیکن اس زمانہ میں وردھا سے وہاں تک کوئی سڑک ایسی نہیں تھی کہ موٹر وغیرہ وہاں جا سکے. بیل گاڑی کسی طرح سے سوکھے دنوں میں چلی جاتی. لیکن وردھا سے وہاں جانا مشکل ہو جاتا تھا. وہاں کی مٹی کالی ہے، اس لئے پانی برستا ہے تو وہ اتنی گیلی اور لیس دار ہو جاتی ہے کہ آدمی کے پیر بہت سی جگہوں پر پھسل جاتے ہیں اور دھنس بھی جاتے ہیں. وردھا سے «سیگاؤں» کے راستہ میں کہیں کہیں پتھریلی زمین بھی ملتی ہے. اور کانٹے دار جھاڑیاں بھی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ہیں. ایسے گاؤں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں «شریمتی میرا بہن» جا کر رہی تھیں. مہاتماجی نے جانے کا ارادہ کرلیا، وہاں ایک آدھ جھونپڑی اور تیار ہوگئی. کچھ دنوں تک تو مہاتماجی نے اس طرح کا اصول رکھا کہ وہاں دوسرے لوگ نہ رہیں. یہاں تک کہ انکو شری مہادیو بھائی ڈیسائی بھی وہاں نہیں رہتے تھے. روزانہ مگن واڑی سے «سیگاؤں» آنا جانا پڑتا تھا. صبح جا کر وہ دن بھر کا کام کرتے اور شام کو مگن واڑی واپس

آ جاتے، جو کام کرنا ہوتا وہاں کرتے۔ دوسرے لوگ بھی کم آ جا پاتے تھے، کیونکہ پانی میں کافی مشکل ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے بیل گاڑی میں آنا شروع کیا۔ کچھ دنوں بعد سیٹھ جمنالال جی نے موٹر کار کے پہئے لگا کر ایک چھوٹی بیل گاڑی بنالی، جس میں دو آدمی بیٹھ کر جا سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہاں سے وہاں تک ایک ایسی سڑک نکلی کہ اچھے دنوں میں تانگے بھی آنے جانے لگے۔ کئی سال کے بعد وہ پکی ہوگئی، اب تو آسانی سے موٹر آ جا سکتی ہے، ٹیلیفون بھی لگ گیا ہے۔ یہ سب کچھ کئی سال میں ہوسکا، لیکن جب صرف ہندوستان ہی کے دور دور کے صوبوں سے نہیں، غیر ملکوں سے بھی لوگوں کا آنا جانا ہونے لگا، اس وقت ان آسانیوں کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا تھا۔

گاؤں تو چھوٹا ہے، جس میں کچھ ہریجنوں کی آبادی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔ کچھ دنوں تک مہاتماجی کے جانے سے لوگوں پر کوئی خاص اثر پڑتا دکھائی نہ دیا۔ چھوت اچھت نہ ماننے کی وجہ سے لوگوں نے آشرم کے رہنے

والوں کا ایک قسم سے سماج بائیکاٹ کیا. لیکن جو لوگ آشرم میں رہتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح سے گاؤں والوں کی خدمت کرتے ہی تھے. کبھی کبھی گاؤں کی صفائی کر دینا، کوئی بیمار پڑجائے تو اسکی خدمت کر دینی وغیرہ وغیرہ. پرراتھنا (عبادت) سے بھی وہ آہستہ آہستہ اثر لینے لگے. پھر بچوں کو تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا. وہاں گئوشالہ قائم ہوجانے کے بعد بچوں کو دودھ بھی دیا جانے لگا. آشرم میں چرخے بہت باقاعدہ چلا کرتے تھے، اس کا بھی کچھ نہ کچھ اثر لوگوں پر پڑتا رہا. وہاں کی زندگی ٹھیک گاؤں والوں کی زندگی کی طرح بنائی گئی. مہاتماجی کیلئے جو جھونپڑی بنی وہ گاؤں کے رہنے والوں کی جھونپڑی کی طرح تھی، بانس پھوس اور مٹی کی دیواریں، کھپریل کی چھت، مٹی سے لپی پتی دیوار اور زمین. بس چٹائی بچھا کر اس پر چھوٹی سی گدی رکھ کر مہاتماجی بیٹھا کرتے تھے. ایک چھوٹا سا پنکھا چھپر میں لٹکایا گیا تھا. جب کوئی آ جاتا تھا تو اسکو کھینچا کرتا تھا یا وہ خود بھی ضرورت کے وقت کھینچ کر تھوڑی بہت ہوا لے لیا کرتے تھے. سب سے بڑھکر صفائی کا خیال بہت تھا،

آبدست وغیرہ کے بعد اس کا برتن صاف کرنا، پاخانے کو کھیت میں اسطرح پھینکنا، کہ اسکی گندگی دیکھنے میں نہ آئے، اسکی بدبو نہ پھیلے اور اس سے اچھی کھاد بن کر کھیت کو طاقت دے. یہ سب آشرم کے رهنے والے خود کیا کرتے تھے. کھانے کے متعلق اسی سبزی ترکاری سے، جو زیادہ تر وهاں ہوتی تھی. کام چلایا جاتا تھا. آٹا وهیں پیس لیا جاتا. چاول بھی وهیں بنا لیا جاتا تھا. آهستہ آهستہ مکان بڑھنے لگے. کام بڑھنے لگے اور آشرم والوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی، بہت سی انجمنوں کے مرکز اس گاؤں میں قائم ہو گئے. اس طرح کہ اس کا نام «سیگاؤں» سے بدل کر سیوا گرام ہوگیا، جو بہت جلد مشہور ہوگیا. مہاتماجی کی خواهش تھی کہ جسطرح گاؤں کے لوگ رهتے هیں اسی طرح رہا جائے. وهاں جو آسانیاں مل سکتی تھیں اسی بنیاد پر وهاں رہا جائے. جتنی صفائی سے دن گزارا جا سکتا هے گزارا جائے، اسطرح دیہاتوں کے رهن سهن اور ان کی زندگی میں اصلاح کی جائے.

مثال کے لئے ان کی ان تکلیفوں کا ذکر کرنا اچھا ہوگا. گاؤں میں سانپ اکثر ہوا کرتے هیں. چنانچہ وهاں بھی تھے.

کس طرح سانپوں سے لوگوں کی حفاظت کی جائے، یہ ایک سوال تھا جو سامنے آیا. شروع میں جب کوئی وہاں مہاتماجی کے پاس جاتا تو ایک بکس دیکھنے میں آتا، جس کے چاروں طرف شیشے کی دیوار ہوتی اور سرے پر ڈھکن دار تختہ ہوتا. وہاں جو سانپ ملتے وہ نمونے کیلئے پکڑ لئے جاتے کہ کون سانپ زہریلا ہوتا ہے اور کون نہیں؟ یہ جاننا ضروی ہوگیا اس لئے اس مسئلہ کا مطالعہ پہلے پہل شروع ہوا. جگہ جگہ سانپوں کے نمونے دیکھ دیکھ کر تیار رکھے گئے. کس طرح سانپ پکڑ کر بکس میں رکھے جائیں یہ بھی لوگوں نے سیکھ لیا. ایک بانس کے اوپری سرے پر سوراخ کر کے دوسرے قسم کے بانس کے ساتھ رکھ کر ایک لمبی رسی لگا دیتے، جس کا ایک کنارہ سرے پر اس طرح بندھا ہوا ہوتا کہ اسمیں سے نہ نکل سکے اور دوسری طرف مرضی کے موافق ڈھیلی بھی کی جا سکے. سانپ پکڑنے میں وہ بہت کام دیتی ہے. جدھر سے سانپ آتا ہو ادھر کے راستہ میں رکھ دی جائے، سانپ جب لنگر اور رسی کے بیچ میں آ جاتا تو وہ باندھ دیا جاتا، اس طرح سانپ پکڑا جاتا تھا. ان باتوں کا مطلب یہ تھا

که گاؤں کے لوگوں کو بتلا دیا جائے که وه سانپوں کو پہچانیں اور جو زهریلے هوں ان سے بچے رهیں اور جسے پکڑنا چاهیں پکڑ بهی لیں. جوسانپ آشرم میں هوتے وه مارے نہیں جاتے تهے بلکه پکڑ کر رکھ لئے جاتے، پهر گاؤں سے دور جنگل میں لے جائے جاکر چهوڑ دئے جاتے.

مہاتما جی کو اس بات کا خود تجربه کرنا پڑا که گاؤں کے لوگ ملیریا (صفراوی بخار) کے ذریعه کسطرح تکلیف اٹهاتے هیں. وهاں ملیریا کا زور برسات کے زمانه میں اور اس کے کچھ بعد تك بهی رها کرتا تها. مہاتما جی کو خود ملیریا هوگیا. وردها کے ڈاکٹر وهاں جایا کرتے تهے لیکن مہاتما جی ان سے بهی اپنا علاج نہیں کراتے تهے. اس وقت تك ان کی حالت زیاده خراب نہیں هوئی تهی. ان کو شهر کے اسپتال لیجانے کیلئے گفتگو چلی. مہاتما جی کا خیال تها که جو آسانی «سے گاؤں» کے لوگوں کو نه ملتی هو اسے وه «سیگاؤں» هی میں ره کر کیسے لے لیں، اسلئے وه «وردها» جاکر اپنا علاج کرانا نہیں چاهتے تهے کیونکه سیگاؤں کے لئے وه آسانی دشوار تهی.

اگرچہ «سیگاؤں» ایک گاؤں تھا، پھر بھی وہاں دودھ کی کمی تھی. اسلئے وہاں صرف آشرم والوں کیلئے ھی نہیں بلکہ گاؤں والوں کیلئے بھی گئوشالہ قائم کرنا ضروری ہوگیا. مہاتما جی کے اصول کے مطابق وہاں بھی ایک گئوشالہ جاری ہوگئی جس سے وہاں کے بچوں کو بھی دودھ دیا جاتا تھا.

انھوں نے «سیگاؤں» میں رہتے ہوئے نئی تعلیم کا پروگرام دیش کے سامنے رکھا. نئی تعلیمی سنگھ کا مرکزی دفتر بھی وہیں قائم کیا گیا. جہاں نئی تعلیمی سنگھ کے طریقے سے چلنے والی ایک پاٹھ شالہ قائم ہوئی اور چلنے لگی. چرخہ سنگھ کی طرف سے ایک کھادی کا بھی اسکول قائم ہوگیا جس میں چرخہ وغیرہ سے تعلق رکھنے والی سبھی ترکیبوں کی تعلیم مختلف صوبوں سے آئے ہوئے طالب علموں کو دی جاتی ھے. چرخہ سنگھ کا دفتر بھی اٹھا کر وہاں لایا گیا. اب وہاں جاکر دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ وہاں بہت سے مکان بن گئے ھیں. آشرم کے قبضہ میں کافی زمین بھی ھے جسمیں کھیتی ہوتی اور گنا بویا جاتا ھے. لوگوں کو اس بات کی بھی تعلیم ملتی ھے کہ کھیت کی ترقی کس طرح کی

جا سکتی ہے۔ جیسا اوپر کہا گیا ہے، جو چیزیں وردھا میں نہیں ہو پاتیں ان کی بھی کھیتی کی جاتی۔ اسلئے وہاں اچھا اور موٹا گنا، بڑے بڑے پپیتے (ارنڈ خربوزہ)، جوار اور کافی سبزی و ترکاری پیدا کی جاتی ہے۔ جتنی انجمنیں وہاں چلتی ہیں سب کا اپنا اپنا انتظام ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ع کے جھگڑے چھڑنے کے پہلے وہاں ایک خاص بستی بس گئی تھی، جس میں باہر کے لوگ بھی اکثر ہوا کرتے تھے آکر ٹھہرتے۔ وہ لوگ مہاتماجی کی زندگی کو دیکھتے اور جو تبدیلیاں وہاں ہو رہی تھیں ان کا مطالعہ کرتے۔ ایک اچھا اسپتال بھی برلا کے خاندان نے وہاں بنوا دیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سیوا گرام کو شہر نہیں کہہ سکتے، وہاں کی رہن سہن اور سب باتیں گاؤں کی طرحسے ہیں۔

جس وقت سڑک وغیرہ نہیں بنی تھی اور آنا جانا پیدل ہی ہوا کرتا تھا، میرے دوست سورگباشی شری متھرا پرشاد جی وہاں پہونچے۔ میں بھی وہاں تھا، شام ہوگئی، تھوڑی بہت گھٹا بھی آگئی۔ میں «وردھا» چلا آیا لیکن ان کی خواہش ہوئی کہ وہ شام کی پرارتھنا کے بعد «وردھا»

لوٹیں گے. پرارتھنا کے بعد وہ چلے، اسوقت تک بارش شروع ہوگئی. ہم لوگ « وردھا » میں سمجھتے تھے کہ وہ اب نہیں واپس ہونگے. لیکن بھلا وہ کب ماننے والے تھے. سڑك صاف دکھائی بھی نہیں دیتی تھی، کہیں کہیں انکا پیر تقریباً گھٹنے تک مٹی میں دھنس گیا. نتیجہ یہ ھوا کہ پیر کسی طرح نکلا بھی تو ایك پاؤں کا جوتا وھیں رہ گیا، دوسرے پاؤں کے جوتے کی کیفیت بھی وھی رھی. رات کے دس گیارہ بجے کے قریب وہ لوٹے، سارے کپڑے بھیگے ہوئے کیچڑ میں لت پت، پیر میں کانٹے چبھے، عجیب صورت. اس وقت سیوا گرام سے لوٹنے میں ھی سب نقصان اور مشکلیں ھوتی تھیں. ان وجہوں سے ضلع بورڈ نے « سے گاؤں » تک پکی سڑك بنوا دینی مناسب سمجھی، چنانچہ کچھہ دنوں بعد وہ بن گئی.

« سے گاؤں » میں شری پرچورے ساشتری رہتے تھے، مہاتماجی جیل میں ان سے واقف ہو چکے تھے. وہ سنسکرت کے اچھے عالم تھے، لیکن وہ کوڑھہ کی بیماری میں مبتلا تھے، کہیں دوسرا آشرم نہ پا کر یہاں آئے تھے. یہ ایك

سوال تھا کہ وہ کہاں رکھے جائیں اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے. مہاتماجی نے ان کو اپنے ساتھ رہنے دیا. ان کے لئے ایک جھونپڑی بنوادی، اسی میں وہ رہنے لگے. مہاتما جی خود ان کی دیکھ بھال کرتے، جب ٹہلنے کیلئے نکلتے تو ان کی جھونپڑی کی طرف ضرور چلے جاتے، خود ھی ان کی خدمت بھی کرتے. کچھ دنوں وھاں رھکر ساشتری جی مر گئے.

مجھے بھی سیوا گرام آشرم میں رہنے کا فخر حاصل ھوا. یوں تو میں وردھا میں سیٹھ جمنا لال بزاز کے مہمان خانہ میں ٹہرا کرتا اور سیوا گرام آیا جایا کرتا. کئی بار دن اور رات کا کھانا وھیں کھالیا کرتا اور کافی وقت وھیں گزارتا تھا. رات کو «وردھا» میں جا کر سویا کرتا تھا.

مہاتماجی ھر سال جاڑے کے موسم میں کچھ دنوں کے لئے باردولی جا کر وھاں کے آشرم میں ٹہرا کرتے تھے. ایک دو بار مجھے بھی باردولی جا کر ان کیساتھ خوش قسمتی سے رہنے کا اتفاق ھوا. مجھے مہاتماجی کے قدموں پر بیٹھنے اور جو کچھ وہ باتیں کرتے اسکو سننے اور ان کی زندگی

کو نزدیک سے دیکھنے کا بہت موقع ملا. بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے پاس ان کے بہت سے خطوط ہونگے یا ان کے متعلق تحریریں ہونگیں. اکثر لوگ ڈائری لکھا کرتے ہیں، لیکن میں اتنا سست آدمی ہوں کہ ڈائری وغیرہ کی شکل میں بھی میں نے کچھ نہیں لکھا. مہاتما جی کو خط میں نے بہت کم لکھے. جب کوئی بات ہوتی تو پوچھ لیا کرتا، بس اسی سے اطمینان کرلیا کرتا. بہت سی باتوں کے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی، کیونکہ اکثر جب مجھے ضرورت ہوتی اور میرے دل میں کسی بات کے متعلق کوئی سوال آتا اور مجھے پوچھنے کی ضرورت معلوم ہوتی تو میں سوچتا ہی رہتا کہ پوچھوں یا نہ پوچھوں. اس وقت تک دوسرے ہی پوچھنے والے ان سے پوچھ لیتے. بس ان کے جواب سے مجھے اطمینان ہو جاتا یا کم سے کم یہ معلوم ہو جاتا کہ مہاتما جی اس سوال کا یہ جواب دیتے، زیادہ پوچھ گچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی فائدہ. اس طرح اتنے سال کے گہرے تعلقات کے بعد بھی ان کے متعلق کوئی سامان یا لٹریچر میرے پاس نہیں ہے.

جس وقت ایکبار ہم باردولی جا رہے تھے. میں نے ان سے کہا کہ تعمیری پروگرام کا بہت چرچا ہوتا ہے، لیکن اس سے تعلق رکھنے والا، تھوڑے میں سب باتیں بتا دینے والا لٹریچر نہیں ہے. مخصوص تجربے پر ہریجن اخبار سے تلاش کرکے مضمونوں کو پڑھنا مشکل اور بے فائدہ ہو جاتا ہے. اسلئے اگر کتاب ہو جاتی. جس میں اس پروگرام کے سبھی اجزا پر روشنی ڈالی جاتی اور سبھی باتیں ایك جگہ مل جاتیں تو بہت اچھا ہوتا. انہوں نے اس بات کو بہت پسند کیا. باردولی کے راستے میں ریل پر ھی یہ کتاب لکھ دی. جو ابھی تك مشہور اور چل رھی ہے. مجھ سے بھی انہوں نے کہا کہ تم بھی اپنے خیالوں کو لکھ ڈالو. میں ریل پر تو نہیں لیکن باردولی پہونچکر لکھ سکا. وہ تعمیری پروگرام کے متعلق کتاب ہے جو «نوجیون پرکاش مندر» (احمد آباد) کے ذریعہ شائع ہوئی ہے.

انتیسواں باب

غذائی چیزوں کے متعلق مہاتماجی کی گذشتہ کوششوں کا تھوڑا سا ذکر پہلے آیا ھے۔ جب وہ انگلستان میں پڑھتے تھے اسی وقت انھوں نے یہ کوشش شروع کی تھی۔ کیونکہ ان کو وھاں گوشت نہیں کھانا تھا، ترکاری ملنے میں دقت ہونے کی وجہ سے انھوں نے خود اپنا کھانا پکانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ھی یہ خیال ھوا کہ سادہ سے سادہ کھانا کیسے پک سکتا ھے اور کافی ھوسکتا ھے۔ انھوں نے گوشت نہ کھانے والوں کا سنگھٹن قائم کیا، جس کے وہ عرصہ تک سکریٹری رھے۔ ایسی کوشش کا تعلق تندرستی کے ساتھ تھا۔ ساری زندگی میں انھوں نے تندرستی کیلئے کوششیں جاری رکھیں۔ دکھنی افریقہ سے ھندوستاں تک ایسے مواقع آئے جبکہ ان کو بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے غذا اور فطری علاج کے متعلق کئی مضمون لکھ ڈالے جو مشہور ھوچکے ھیں۔ ان کی برھم چاریت کے متعلق ان کے مضمونوں کا مجموعہ کتاب کی شکل میں الگ چھپ چکا ھے۔ اگر ان سب کو

ملا کر دیکھا جائے تو ان سبھوں کا بنیادی اصول سچائی اور عدم تشدد پر مبنی ھے. انسان کی زندگی میں تندرستی ایک انمول چیز ھے، اسے انسان اپنے غیر فطری کھانے اور رھن سہن سے بگاڑتا ھے. جیسا چاھئے اگر کھانا ویسا ھی ھو، اور اسی مقدار میں کھایا جائے جتنا زندگی اور تندرستی کیلئے ضروری ھے، لیکن مزے کیلئے نہیں بلکہ صرف تندرستی کیلئے کھایا جائے تو صرف صحت ھی ٹھیک نہ رھے بلکہ اسکا اثر کردار پر بھی پڑتا ھے. بیمار جسم ھی غیر فطری حالت ھے. جسم کے بیمار ھو جانے پر اسے فطری حالت میں لانے کیلئے فطرت خود تدبیر کرتی رھتی ھے. وھی علاج سب سے اچھا ھے جو فطرت کے اس کام میں مدد دے، اسلئے دوا کا استعمال زیادہ تر مدد کرنے کے بجائے نقصان دیا کرتا ھے. اسی لئے مہاتماجی قدرتی علاج پر زور دیتے تھے، اس پر ان کا بہت زبردست بھروسہ تھا. ان کے بھروسے کا مشکل امتحان بھی ھوا تھا. انہوں نے اپنے لڑکے کی سخت بیماری میں خدا کا نام لیکر اور دوسرا علاج نہ کر کے فطری علاج ھی کا سہارا لیا تھا. خدا کی مہربانی سے وہ اچھے

بھی ہوگئے. ان کے دھیان میں اس کے متعلق ایک بات اور بھی رہا کرتی تھی، آجکل کے زیادہ خرچ کے طریقے. جو خاصکر ڈاکٹری خرچ کے نام سے جاری ہیں، غریبوں کیلئے فائدہ مند نہیں ہیں. ہندوستان کے لاکھوں غریبوں کا اسطرح کا قیمتی علاج ہونا ناممکن ہے. فطری علاج جس کا یہ مطلب ہے کہ فطری زندگی کے ذریعہ سے اپنے کو بیمار ہونے ہی نہ دینا، اگر یہ جاری ہو جائے تو امیر اور غریب سب کے لئے وہ ایک مفید اور بیحد فائدہ مند چیز ثابت ہو.

ہمارے علوم نے کچھ ایسا سکھایا ہے اور ہماری تہذیب کچھ ایسی بنی ہے کہ ان دونوں سے سچی خوشی پیدا ہوتی ہے. آجکل اکثر لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مذہب کے ساتھ سیاست کا کوئی تعلق نہیں، عام زندگی کا ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے وغیرہ وغیرہ. یعنی زندگی کے ہر پہلو کو ہم دوسرے پہلوؤں سے الگ مانتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ایک کا اثر دوسرے پر کیسا پڑتا ہے. ہماری تہذیب اسکے خلاف بتاتی ہے. انسان کا جسم اس کے دل سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے، یعنی تندرست دل کے ساتھ تندرست

جسم ہوسکتا ھے اور تندرست جسم کے ساتھ تندرست دل بھی۔ اصلی پاك غذا کے بغیر نہ تو جسم ھی تنـدرست رہ سکتا ھے نہ دل. اگر ذاتی تندرستی نہیں ھے تو اس شخص کی جماعت بھی تنـدرست نہیں رہ سکتی. جسم، دل اور عمل کی بھی تندرستی ہونی چاھئے. اس حیثیت کے زندگی کے سبھی پہلو یعنی خیال اور خصلت تین قسموں میں تقسیم کئے گئے ھیں. ۱۔ صداقت ۲۔ غصہ ۳۔ خواھش نفسانی. ان میں سے جسکا جس انسان پر غلبہ ہو جاتا ھے. جس کا یقین جسطرح کے کام اور سماج میں ہوتا ھے، وہ اسی کے مطابق سچا، غصہ ور اور نفس پرست کہا جاتا ھے. اسی طرح غذا، جسم، تندرستی، دماغی قوت اور خیال کی پاکیزگی کا ایك دوسرے سے اسطرح کا تعلق ھے کہ ایك دوسرے کا ایك دوسرے پر اثر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا. خواھش کے اعتبار سے قوت والا کھانا کھاکر سچائی کو قائم رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ھے. اسی طرح نفس پرست جسم کے ساتھ غصہ ور لاپرواھی یا سچا عمل بھی مشکل ہوتا ھے. اسلئے ھمارے شاستروں کے متعلق زندگی میں خوراك اور ورزش کو داخل

کیا گیا ھے، جس سے انسان اپنی اعلی قوت توجه کو حاصل کرسکے.

مہاتماجی کے بتائے ہوئے گیارہ عہد اسی اصول کے مطابق بنے. وہ عہد سب کے سب نئے نہیں ھیں، وہ زیادہ تر ھمارے شاستروں ھی میں پائے جاتے ھیں. ان پر عمل کرنا بچپن سے ھی سکھایا جاتا ھے، یا یوں کہیے که پیدائش کے پہلے ھی سکھایا جاتا تھا تو یه مبالغه نه ہوگا. کیونکه پرھیزگاری پیدا کرنے کیلئے بھی اصول اور قاعدے بنائے گئے ھیں. مرد عورت کا تعلق صرف وقتی جسمانی سکھ کیلئے ھی نہیں بلکه دنیا چلانے کیلئے بھی ضروری مان کر وہ قاعدے کے ذریعه سے منظم کیا گیا تھا. اسلئے جو پرھیزگاری پیدا ہوتی تھی وہ قاعدوں اور اصولوں کے ساتھ پاکیزہ اور مکمل ہوتی تھی. اس پرھیزگاری کی تکمیل ایك طرح سے پیدائش سے پہلے ھی ماں باپ کے تعلق کے وقت ھی شروع ہوجاتی تھی. پیدائش کے وقت سے مرنے تك اور مرنے کے بعد بھی بہت سے تکمیلی مدارج ہوا کرتے ھیں، جن کا آئین زندگی کو مکمل بنانے کے مقصد سے ہوا کرتا تھا. اس طرح چاھے انسان

برھمچاری حالت میں تعلیم حاصل کرتا ہو اور چاھے خانگی آشرم میں خانگی زندگی گذارتا ہو، خواہ راھب ہوکر دنیا کی خدمت کرتا ہو، خواہ وہ آخری حالت میں خدا کی عبادت کرتا اور اسکے دھیان میں لگا رھتا ہو، وہ اپنی ساری سماج کی زندگی مکمل بنانے میں لگا رھتا تھا. آج ہم ان اصولوں کا صحیح مطلب بھول گئے، زیادہ تر تو انھیں سمجھتے بھی نہیں ھیں. اسکا یہ نتیجہ ہوتا ھے کہ یا تو یہ اصول ہمکو زندگی کا سکھ پہونچانے میں رکاوٹ معلوم ہوتے ھیں یا ہم ان کی ضرورت ھی محسوس نہیں کرتے، یا ہم انھیں پرانی لکیر مان کر چھوڑ دینا ھی ترقی پسندی کی علامت سمجھتے ھیں. مہاتماجی نہ تو یہاں تک اندھی تقلید سے کام لینا چاھتے تھے اور نہ انھیں پسند کرتے تھے. لیکن انمیں جو حقیقی ھیں انھیں مانتے تھے. انھوں نے اس اصلیت اور صداقت کو آجکی جدید حالت کے مطابق اپنے گیارہ عہدونمیں شریک کر دیا ھے. اس لئے غذائی چیزوں کے متعلق اور صحت کی خاطر علاج کے متعلق تجربے، ترک لذات اور زندگی کے بنیادی اصول یعنی سچائی اور اہنسا کا باھمی تعلق ھے. کوئی ایک دوسرے سے

علحدہ کرکے ان کو سمجھ نہیں سکتا ھے۔ تو پھر زندگی میں ان کو داخل کرنے کا کوئی سوال ھی نہیں رھتا۔ انھیں حقیقتوں پر سماج کی تنظیمی تعمیر بھی ان کا مقصد تھا۔ اسلئے ان کی سیاست، جسے ھم دھرم کہتے ھیں، اس سے الگ نہیں تھی۔ اس طرح انفرادی زندگی اجتماعی زندگی سے الگ نہیں کی جاسکتی۔

اس مسئلہ کو کچھ مثالوں کے ذریعہ سمجھ لینا اچھا ھوگا۔ یہ اکثر لوگ کہہ رھے ھیں کہ اگر کسی آدمی کا ذاتی حال اچھا نہیں ھے لیکن اسکی پبلک زندگی اگر اچھی ھے تو وہ پبلک کام ٹھیک ھی کرے گا۔ مہاتماجی اس بات کو نہیں مانتے تھے۔ جو آدمی روپے پیسے کے بارے میں اپنے نجی کاروبار میں پہلے صاف نہیں ھے وہ اجتماعی زندگی میں کیسے صاف رہ سکتا ھے، جو اپنے لئے غلط طریقے سے کمانا برا نہیں سمجھتا اور جو اپنے نجی کاروبار میں ناقابل اعتماد ھے وہ کیا سبھی اجتماعی زندگی میں جیسا چاھئے وہ اچھا ھوسکتا ھے؟ اگر مالدار ھونے کا سیدھا اور آسان راستہ کچھ چھوٹی موٹی باتوں میں سچ اور جھوٹ کا خیال نہ رکھنا ھی ھے تو ایسا

دولتمند کبھی سچی خدمت نہیں کرسکتا. اس طرح سے پیدا کی ہوئی دولت اگر خدمت کے کام میں لگائی بھی جائے تو وہ اتنی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی. کیونکہ ضرورت سے زیادہ دولت پیدا کرنی نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ مضر بھی ہے. اسلئے اپنے لئے ضرورت سے زیادہ پیدا کرنے کا بھی مہاتماجی نے ایک عہد مان لیا. اپنے عہدوں کا وسیع بیان اور انکا ٹھیک امتحان انہوں نے اپنے مضمونوں میں ظاہر کردیا، جنکا مجموعہ «منگل پربھات» کے نام سے چھپا ہے. اس کا پڑھنا اور مطالعہ بھی لازم ہونا چاہئے. اس لئے یہاں چند لفظوں میں ہی فطری علاج اور کھانے وغیرہ کی بنیادی حقیقت بتا دی گئی ہے.

تیسواں باب

اوپر کہا جاچکا ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں مختلف مذہبوں میں اعتماد اور صحیح جذبہ پیدا کرنے کو، مہاتماجی نے تقریباً ابتدا سے ہی، اپنی پبلک زندگی کا بڑا مقصد اور اسکو لازمی ضرورت بنا رکھا تھا. ان کو ایک مسلمان بیوپاری کے مقدمہ کی پیروی کے لئے دکھنی افریقہ جانا پڑا. وہاں ہندوستانیوں کے ساتھ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جو برا برتاؤ ہوا کرتا تھا، وہی ان کے وہاں ٹھہرجانے کا سبب بنا. وہاں زیادتیوں اور ناانصافیوں کو دور کرنیکی تدبیر میں ستیہ‌گرہ کی ایجاد ہوئی، صرف ستیہ‌گرہ لفظ کا ہی نہیں بلکہ ستیہ‌گرہ کے پورے پروگرام کا بھی. وہاں ستیہ‌گرہ میں ہندو مسلم دونوں نے پورے جوش سے حصہ لیا. وہاں ہندو اور مسلمان میں کسی طرح کا اختلاف ہونے کا سبب پیدا نہیں ہوا. غیر ملک میں، جہاں اپنے ملک کے تھوڑے ہی لوگ ہوں اور جہاں سب کے ساتھ ایک ہی قسم کا برتاؤ ہوتا ہو اور جہاں کی جنتا یا گورنمنٹ سبھی ہندوستانیوں کو ایک

لاٹھی سے ھانکتی ھو، اس قسم کا اتحاد تعجب خیز نہیں بلکہ ایک طریقہ سے قدرتی ھے. مہاتماجی نے وھاں یہ دیکھا اور سمجھا تھا کہ ھندوستان میں، جہاں بہت سے مذھبوں کے ماننے والے اور بہت سی زبانوں کے بولنے والے اور بہت قسم کے رسم و رواج پر چلنے والے لوگ بستے ھیں، اس اتحاد کے بغیر نہ تو غیر ملکی سرکار سے ھی لڑا جاسکتا ھے اور نہ ایک دن کے لئے بھی لوگ چین سے زندگی گزار سکتے ھیں. اس لئے انھوں نے ھندو مسلم اتحاد کو جسکا مطلب یہ تھا کہ ھندوستان میں بسنے والے سبلوگوں کی ایکتا یعنی اتحاد، خواہ ان کا مذھب کچھ بھی ھو، یہاں کی اجتماعی زندگی کا ایک لازمی اور ضروری جز شاید مان لیا.

اوپر کہا جاچکا ھے کہ اسی طریقہ کے مطابق انھوں نے ھندوستان میں برابر کام کیا. خلافت کے معاملہ میں مسلمانوں کا دگنے جوش کے ساتھ انھوں نے ساتھ دیا اور مسلمانوں نے بھی اسوقت کی سیاست میں پورا حصہ لیا. لیکن بدقسمتی سے ایسا بلوہ اور فساد شروع ھوگیا کہ جو اتحاد دیکھنے میں آنے لگا تھا وہ آھستہ آھستہ کم ھوتا دکھائی دینے لگا. اسکو بچانے

کے لئے انہوں نے سنہ ۱۹۳٤ع میں اکیس دنوں کا روزہ رکھا. اور فضا کچھ سدھری ہوئی معلوم ہونے لگی، مگر وہ قائم نہ رہی اور جلد ہی فنا ہوگئی. سیاسی وجوہ سے جیسے ملک میں بیداری بڑھتی گئی مسلمانوں میں بیداری پھیلتی گئی، ان کی مانگیں بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں. برٹش گورنمنٹ بھی ان کے حوصلے بڑھاتی رہی. گول میز کانفرنس کامیاب ہوگئی. مہاتماجی بمبئی پہونچتے ہی گرفتار کر لئے گئے. یہ لڑائی انہوں نے خود نہیں مول لی تھی. برٹش گورنمنٹ کی سیاست نے ان کو مجبور کرکے ملک کو اسمیں شریک کرایا تھا. مسلمان تو بہت کم شریک ہوئے تھے، لیکن جو شریک ہوئے تھے وہ علانیہ شریک ہوئے تھے. صوبہ سرحد سارا کا سارا شریک تھا اور جمعیۃ العلماء جیسی مسلمہ اور مضبوط جماعت بھی سیاسی معاملوں میں کانگریس کا ساتھ دیتی رہی اگرچہ اس کے مذہبی خیالات ہمیشہ سخت رہے.

سنہ ۱۹۳۷ع تک جب نئے آئین کے اعتبار سے پہلا انتخاب ہوا تھا اس وقت ملک میں مسلم لیگ کا اتنا زور نہیں تھا. سنہ ۱۹۲۹ع کے بعد مسلمانوں کی نئی جماعت بن گئی تھی.

جس میں سبھی پرانی انجمنیں شریک ہوگئیں تھیں یا کمزور پڑگئیں۔ خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کا مقام ایک طرح سے ماتحتانہ ہوگیا تھا، اگرچہ دونوں نے اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کی لیڈری کی۔ اسلئے جب سنہ ۱۹۳۷ع کا چناؤ ہوا تو مسلم لیگ بہت کم جگہوں کو جیت سکی، اکثر جگہوں پر تو اس نے امیدوار بھی نہیں کھڑے کئے۔ انتخاب کے بعد نئے قانون کے مطابق جب وزارتیں بنی تھیں اسوقت مسلم لیگ کو کوئی خاص جگہ نہیں ملی۔ اور بنگال میں، جہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہے اور جہاں کی کونسلوں میں بھی ان کو زیادہ جگہیں ملی تھیں، مسلم لیگ اپنی وزارت نہ بنا سکی، کیونکہ اس کی طرف سے بہت کم لوگ منتخب ہوئے تھے۔ مسلمان بھی، خواہ ذاتی طور سے یا دوسری جماعتوں کی طرف سے، زیادہ تر اسمبلی میں آئے تھے۔ پنجاب میں (یونینسٹ پارٹی) بنی تھی، جسمیں ہندو مسلم زمیندار ایک ساتھ ہوکر کانگریس اور دوسری پارٹیوں سے انتخاب میں لڑے تھے۔ بنگال میں زیادہ مسلمان نمایندے «کرشک پرجا پارٹی» کی طرف سے چنے گئے تھے اس لئے

لیگی وزارت کہیں نہیں بنی۔ صوبہ سرحد میں سب سے بڑی پارٹی، جس میں سب سے زیادہ تعداد والی پارٹی مسلمانوں ھی کی تھی، اور وہ کانگریس کی تھی۔ جب کانگریس نے وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا اسوقت وھاں بھی کانگریس وزارت قائم ھوئی، جس کے وزیر ڈاکٹر خان صاحب ھوئے۔

اس طرح انتخاب کے وقت تک مسلم لیگ کا کوئی خاص اثر دیکھنے میں نہ آیا۔ لیکن جب کانگریسی وزارتیں بن گئیں اسوقت لیگ نے ان وزارتوں کے خلاف ھندوؤں کے بارے میں مخالفت اور نفرت کا جذبہ شدت سے پھیلانا شروع کیا اور طرح طرح کی جھوٹی اور بے بنیادی شکایتوں کا پل باندھ دیا اور ان کا پرچار کرنا اپنا بڑا مقصد بنا لیا۔ مسٹر «جنا» سنہ ۱۹۳۵ع کے آئین کی اس لئے مخالفت کرتے تھے کہ اس میں سارے ملک کی ایک یونین بنانے کی اسکیم تھی۔ ھندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اس لئے صرف مسلمان ھونے کی حیثیت سے وہ اس یونین کی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کی امید کبھی کر ھی نہیں سکتے تھے۔ وہ چاھتے تھے کہ صوبوں کو جس طرح ھوسکے اتنا زیادہ

اختیار دیا جائے تاکہ کم سے کم صوبوں میں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، وہ اپنے اسلامی اصول جاری کرسکیں. کانگریس نے بھی سنہ ۱۹۳۵ع کے آئین کی مخالفت کی تھی. لیکن اس کی مخالفت اس لئے تھی کہ خفیہ طریقہ سے برٹش گورنمنٹ اپنے ہاتھوں میں اختیار رکھنا چاہتی تھی اور کانگریس ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دینا چاہتی تھی. یہ ایک طرح سے ظاہر تھا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اختیار نہ آئے تو نہ سہی، لیکن اگر آئے تو اس میں مسلمان کی حیثیت ہندوؤں کے برابر ہو، جو تعداد میں کم سے کم ان سے تگنے مسلمانوں کو اختیار ملنا چاہئے. اسلئے ان کا جھگڑا برٹش گورنمنٹ کے ساتھ اتنا نہیں تھا جتنا کانگریس کے ساتھ تھا. برطانوی پالیسی اسلئے ان کو مدد دے رہی تھی کہ وہ اختیاروں کو جہاں تک ہوسکے اس بہانہ سے ہی اپنے ہاتھ میں رکھے کیونکہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہے اور دونوں مل کر ایک ہی مطالبہ پیش نہیں کرسکتے. وزارتوں نے، جہاں تک ممکن تھا، انصاف سے کام لیا اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی یا نا انصافی نہیں کی. لیکن لیگ کی طرف سے

بہت نفرت پھیلائی گئی، بہت جھوٹے الزام کانگریس وزارت کے خلاف لگائے گئے. لیگ کی طرف سے دو رپورٹیں چھاپی گئیں تھیں، ایک پیرپور کے راجہ کی لکھی ہوئی، دوسری پٹنہ کے بیرسٹر مسٹر شریف کی لکھی ہوئی، جس میں بہار کی وزارت پر الزام لگائے گئے تھے. ان الزاموں کے متعلق کونسل میں بھی بحث ہوئی، وزارتوں نے ان کو بے بنیاد بتلایا. لیکن یہ باتیں چلتی ھی رہیں، طرفداری سے بھری رپورٹوں کا پرچار لیگ کی طرف سے برابر ہوتا ھی رہا.

کانگریس کی طرف سے مسٹر «جنا» کو اس بات کا چیلنج دیا گیا تھا کہ لیگ کی سبھی شکایتوں کی جانچ غیرجانبدارانہ، منصف مزاج انگریز «سر مارس گوایر» کے ذریعہ، جو ہندوستان کے چیف جسٹس تھے، کرالی جائے، کانگریس ان کے فیصلے کو مانے گی. لیکن مسٹر «جنا» نے انکار کر دیا لیکن پھر بھی لیگ کی طرف سے برابر شکایت ہوتی رہی. نتیجہ یہ ہوا کہ آپس کی نفرت بڑھتی گئی. سنہ ۱۹۴۰ع میں لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس کے موقع پر یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہونا چاہئے، جس میں ہندو اکثریت کے

صوبے ایك طرف اور مسلم اکثریت کے صوبے دوسری طرف الگ الگ کر دئے جائیں اور یہ دونوں حصے ہر طرح سے ایك دوسرے سے آزاد رہیں. اس طرح سنہ ۱۹٤۱ع میں لیگ نے پاکستان کے قیام کو اپنا مقصد بنا لیا. لیکن ابھی تك تعجب کی بات یہ تھی کہ اس بٹوارہ کے معاملے میں لیگ کو اتنا سہارا مسلمان اکثریت کے صوبوں سے نہیں مل رہا تھا جتنا زیادہ مسلمان اقلیت کے صوبوں سے. تھوڑی سی بھی سمجھ رکھنے والے آدمی کے لئے یہ بات صاف تھی کہ اگر بٹوارہ ہو جائے تو پاکستان اور مسلمانوں کی، خواہ کچھ اختیار دیا جائے، لیکن دوسرے حصوں میں ان کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی. تو پھر وہ صرف ایك اقلیت ھی میں ہوکر نہیں بلکہ ایك چھوٹی اقلیت ھی کی شکل میں رہ جائیں گے. لیکن. یا تو ان کا ارادہ یہ تھا کہ اس طرح الگ پاکستان قائم کرکے وہ کسی نہ کسی دن باقی ہندوستان پر بھی پاکستانی راج قائم کرلیں گے. یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو کبھی ہوگا ھی نہیں اسلئے اس طرح کی باتیں کرکے ہم لوگوں کو دبا کر اس سے زیادہ اختیارات مسلمانوں کے لئے

حاصل کرلیں گے. ان میں کچھ مسلمانوں نے بیانوں اور پمفلٹوں کے ذریعہ سارے ہندوستان پر اسلامی حکومت کے قیام کی امید ظاہر کی تھی. اسلئے ہندوؤں کے دل میں یہ اندیشہ رہتا ہی تھا کہ مسلمان بھائی اپنا اثر جمانا چاہتے ہیں.

لڑائی شروع ہونے کے بعد ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ع میں کانگریس کی طرف سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن برٹش گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اختیار دینے کے لئے تیار نہیں تھی. مسٹر جنا نے اپنی طرف سے کانگریس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا، وہ اپنے تئیں مسلمانوں کا تنہا نمایندہ مانتے، اور کہتے تھے کہ اسی طرح کانگریس بھی اپنے کو ہندوؤں کا نمایندہ مان کر ہم سے گفتگو کرے تو ہم گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں. کانگریس کی ساری تاریخ اور عقیدے نے اپنے تئیں فرقہ واریت سے الگ رکھا تھا. کانگریس میں مسلمان اور دوسرے مذہب والے سبھی ذاتوں کے لوگ شروع سے ہی شریك تھے. اگرچہ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا تعاون برابر ایك طرح کا نہیں رہا لیکن پھر بھی

کانگریس مسلمانوں سے کبھی خالی بھی نہیں رھی. خلافت تحریك کے زمانہ میں تو کانگریس ھی تقریباً سارے مسلمانوں کی لیڈر تھی، لیکن مسٹر جنا کانگریس کو بھی لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت بنانے پر تلے ہوئے تھے. مہاتما گاندھی نے ان سے بات چیت کرنے کی مسلسل کوشش کی کہ کسی طرح آپس میں سمجھوتہ ھو جائے. لیکن مسٹر جنا نے ان کو ہمیشہ ٹھکرا دیا.

مسٹر جنا کا کہنا تھا کہ ھندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ھیں، دونوں کبھی ایك ساتھ نہیں رہ سکتے، اس لئے ھندو ھندستان میں راج کریں اور مسلمان پاکستان میں. مہاتما گاندھی اور کانگریس دونوں ھی دو قومی نظریہ کو کبھی نہیں منظور کرتے تھے، کیونکہ تقریباً ایك ھزار سال کی تاریخ یہ بتاتی تھی کہ ھندو اور مسلمان دونوں کی کوشش یہی رھی ھے کہ وہ ایك دوسرے کی تہذیب، رھن سہن، بول چال اور لباس وغیرہ کا باھم تبادلہ کرتے رھیں. دونوں نے مل کر ھندستان میں ایك ھندستانی قوم پیدا کی ھے، وہ نہ تو بالکل ھندو اور نہ بالکل مسلمان. اگرچہ مذھبی عقیدوں اور طریقوں

میں دونوں اپنے اصول کے مطابق چلتے رہے، اور ان میں بھی بہت باتیں ایك دوسرے سے مل گئی ھیں. اسلئے اب اسی بنیاد پر، که دونوں دو قومیں ھیں، بٹوارہ نا مناسب ھوگا. اور اسلئے یه کسی طرح سے بھی ماننے کے قابل نہیں ھے. مہاتماجی. بٹوارہ یعنی ھندستان کی ایسی تقسیم جس میں اس کے دو حصے ایك دوسرے سے بالکل آزاد ھوں، کبھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے. البته وہ صوبوں کو ھر طرح سے صوبائی کاموں میں آزاد بنانے کیلئے تیار تھے، اس کے لئے جو کچھ کرنا پڑے وہ کرنے کے لئے آمادہ تھے. اس کا مطلب یه ھوتا که سارا ھندوستان ایك ملك رھتا اور اس کی ایك حکومت ھوتی. مسٹر جنا اس کے لئے تیار نہیں تھے. برطانوی حکومت بھی شاید بٹوارہ پسند نہیں کرتی تھی لیکن مسٹر جناح کو اس سے مدد ملتی ھی گئی. نتیجه یه ھوا که وہ اپنے مطالبوں پر شدت سے اڑے رھے. مہاتماجی اپنے خیالات میں بہت مضبوط تھے اسلئے لیگ نے ان کو ھی اپنا سب سے بڑا مخالف سمجھا. لیگیوں کی طرف سے کہا جانے لگا، اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ

گاندھی جی ہیں.

لڑائی شروع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد برطانوی حکومت نے اپنا رخ بدل دیا جو اس وقت اس کوشش میں تھی کہ سنہ ۱۹۳۵ع کے آئین کے اعتبار سے ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے جس میں برطانوی صوبے اور رجواڑے بھی شریک ہو جائیں. اور جو ریاستوں سے اس وقت تک ان شرطوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی، جن شرطوں پر رجواڑے ہندستانی یونین میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوتے. لیگ یا مسٹر جنا کی بات مان کر اس نے اعلان کر دیا کہ سنہ ۱۹۳۵ع کے آئین کا وہ حصہ جس کے مطابق یونین بنتی، اسکو کام میں نہیں لایا جائے گا لہذا وہ منسوخ کر دیا گیا. مسٹر جنا کی مخالفت سنہ ۱۹۳۵ع کے آئین کے بارے میں اسی حصہ کی وجہ سے تھی. اس طرح ان کی خواہش پوری کر دی گئی. جب تک صحیح معنوں میں اختیار نہ مل جاتا کانگریس لڑائی میں مدد کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاھتی ھے، اسلئے برطانوی حکومت کے ساتھ اس کا سمجھوتہ نہ ہوسکا. سمجھوتے کی آخری کوشش سنہ ۱۹۴۲ع میں «کرپس مشن»

کے ذریعه کی گئی لیکن وہ بے نتیجه ثابت ہوئی ، اس کی ناکامی کا خاص سبب مسٹر جنا کی ضد تھی. اس کے بعد کانگریس کے لئے کوئی علاج نہیں رہ گیا تھا اسلئے برطانوی حکومت سے کہنا پڑا :

« ہندوستان چھوڑو »

یہ حالت اتنی جلد اور آسانی سے پیدا نہیں ہوئی جیسا چند واقعات کے ذریعه اوپر بتا دیا گیا ھے . کانگریس کے اندر بھی کافی اختلاف تھا ، کچھ لوگ چاھتے تھے که کانگریس کو برطانوی حکومت کی مدد کرنی چاھئے اور اپنے مطالبه کو ایك طرح سے لڑائی کے زمانه میں پیچھے ڈال دینا چاھئے . کچھ ایسے تھے جو اتنی دور تك جانے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن پھر بھی برٹش گورنمنٹ کے ساتھ جھگڑا کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکه کسی نه کسی طرح سے سمجھوته کرنا ھی چاھتے تھے . مہاتماجی کو برٹش گورنمنٹ کی کارروائیاں دیکھ کر یه یقین نہیں ہوتا تھا که وہ ہندستان کے مطالبه کو کسی طرح صحیح معنوں میں ماننے کے لئے تیار ھے یا ہوگی . اس کا بہت بڑا ثبوت اسی بات سے ملتا تھا که اسکی طرف سے لیگ کو

مدد ملتی جا رهی تهی یا لیگ کو وہ اپنا هتهیار بنا کر کام نکال رهی تهی.

اس کے علاوہ اور کانگریس کے اصول کی بهی بات تهی. مهاتماجی نے لڑائی شروع هوتے هی "لارڈ لنلتهگو" سے کهدیا تها کہ هندوستان کی همدردی برطانیہ کے ساتھ هے اور اسے بغیر کسی شرط کے برطانیہ کی مدد کرنی چاهئے. اس بات سے جنتا اور کانگریس میں کچھ بیچینی تهی، کیونکہ مهاتماجی کا خیال تها کہ انگلستان کی سب سے بڑی مدد هندوستان کی همدردی هی هوگی. اگر دنیا کو یہ معلوم هو جائے کہ انگلستان کے سامراج کے نیچے رهتے هوئے بهی هندوستان کی سچی همدردی انگلستان کو حاصل هے تو اس کی سیاست کا اثر ساری دنیا پر پڑے گا، خاصکر بڑی لڑائی میں اس قسم کا اثر کچھ کم قیمتی نهیں هوتا هے. اس واقعہ کو ایک طرح سے هندوستان کے لوگوں نے ٹهیک نہ سمجها اور بهت سے لوگ کهنے لگے کہ بغیر شرط کے هم مدد نهیں کرسکتے، هم کو تو جب برطانوی سرکار آزادی دے گی اسی وقت هم اس کے ساتھ سودا کرسکیں گے. ادهر جب گاندهی جی نے اپنے لفظوں کا مطلب

سیاسی ہمدردی نکالا اس وقت انگریزوں نے ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی بات سے ہٹ گئے۔ بات یہ تھی کہ مہاتماجی کی زندگی میں اس قسم کے اور بھی موقع آئے جب ان کو اس غلط فہمی کا شکار ہونا پڑا تھا۔ کانگریس نے اہنسا کو اپنے عقیدے میں ایک مقام دے رکھا تھا۔ مہاتماجی کی زندگی کا تو سچ اور اہنسا مقصد ہی رہا ہے، کیا وہ اس لڑائی میں، جہاں سب قسم کے نئے نئے اور مہلک ہتھیار استعمال میں لائے جا رہے تھے، اپنی زندگی کے اصولوں کو چھوڑ کر ہتھیاروں کے ذریعہ مدد کرنے کا خیال کرسکتے تھے؟ ساتھ ہی انھوں نے پچھلی لڑائی میں رنگروٹوں کو بھرتی کرانے میں مدد دی تھی، جس پر زبردست نکتہ‌چینیاں دوسرے ملکوں کے زبردست امن پسند لوگوں نے کی تھی۔

بہرحال کچھ ہو، جب یہ معاملہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے آیا، تو بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ برطانوی سرکار اگر ہندوستان کی سچی ہمدردی اور مدد لینی پسند کرتی ہے تو اسے دو باتیں کرنی چاہئیں۔ ایک، ہندوستان کی کامل آزادی کے مقصد کو صاف صاف مان لینا اور کھلے لفظوں

میں آزادی دینے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کر دینا. دوسرے، فوری کام کے لئے هندستانیوں کو گورنمنٹ میں بلا تاخیر اختیار دینا، تاکه وہ سچ مچ مدد کرسکیں. اور آئندہ کے متعلق انکا اعتماد قائم ہو جائے. برطانوی گورنمنٹ کہتی تھی که اس کو اس لڑائی میں آزاد قوموں کی حفاظت کے لئے شریك ہونا پڑا ہے، اس لئے اس کو اس بات کا اختیار ہے که وہ سب آزادی پسند لوگوں سے ہمدردی اور مدد پائے. ورکنگ کمیٹی نے جو فیصله کیا اس میں اسی بات پر زور دے کر کہا گیا که برطانیه اگر واقعی آزاد قوموں کا حامی ہے تو اس کو چاہئے که ہندوستان کے ان مطالبوں کو منظور کرکے اس بات کا ثبوت دے. جب اس نے ان باتوں کو نامنظور کر دیا تو کانگریس کو مجبور ہوکر وزارتوں سے. جہاں جہاں اسکی اکثریت تھی، ہٹ جانا پڑا. برطانوی حکومت کو ان صوبوں کی حکومت کی باگ گورنمنٹ کو دینی پڑی. اس میں جو جھگڑا چلا تھا اس کی تفصیل یہاں دینی غیر ضروری ہے. مہاتماجی کے ساتھ میرا نجی تعلق کس قسم کا رہا، میں یہاں صرف یه بتا دینا کافی سمجھتا ہوں.

لڑائی کے شروع میں کانگریس ورکنگ کمیٹی میں جو تجویز ہوئی تھی جس میں مندرجہ بالا دو مطالبے پیش کئے گئے تھے. اس میں یہ واضح نہیں کیا گیا تھا کہ اگر برطانوی حکومت ان مطالبوں کو مان لے تو آیا کانگریس اس کی مدد ہتھیاروں سے کریگی یا نہیں. لیکن اس میں شک نہیں کہ اس میں یہ بات آجاتی تھی کہ برطانوی حکومت اگر بات مان لیگی تو وہ جس طرح سے جس قسم کی مدد چاہیگی کانگریس کو دینی پڑے گی، اس میں فوج کے لئے آدمیوں کی بھرتی اور مالی مدد بھی شامل ہوگی. لیکن اس وقت یہ بات صاف طور پر نہیں کہی گئی. کیونکہ لارڈ لنلتھگو نے مانگ پوری نہیں کی اس لئے مدد دینے کا سوال ہی نہیں اٹھا. جیسے جیسے لڑائی بڑھتی گئی اور جرمنی ایک ملک کے بعد دوسرے ملک پر حملہ کرکے اسے فتح کرتا گیا اور یہ ظاہر ہوتا گیا کہ وہ کسی کمزور ملک کو جو اس کی بات نہیں مانتا آزاد نہیں رہنے دیتا. ویسے ویسے انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کی ہمدردیاں بڑھتی گئیں. ہم میں سے بہت سے اس وقت کانگریس کے اہنسا کی حقیقت بھول ہی گئے، لیکن مہاتماجی اس کو کیسے بھول سکتے تھے.

کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پھر جب اس پر غور ہونے لگا تو اختلاف ظاہر ہوگیا۔ مہاتماجی کا خیال تھا کہ ہم اپنے اصول چھوڑ کر لڑائی میں ہنسا کے (تشددی) سامان کے ذریعہ مدد نہیں کرسکتے۔ وہ یہ مانتے تھے ہمارا عدم تشددی طریقہ دو ہی مسئلوں کو بنیاد مان کر تیار ہوا ہے، ایک تو یہ کہ ہمکو اگر انگریزوں کے خلاف سوراج لینے کے لئے لڑنا پڑے تو آیا اس وقت ہم عدم تشدد پر قائم رہیں گے یا نہیں، دوسرا یہ کہ ہندستانیوں کے آپس کے جھگڑوں میں ہم کبھی تشددی طریقوں سے کام نہیں لیں گے۔ مہاتماجی اپنی اہنسا میں کوئی بندھن یا پابندی نہیں مانتے تھے۔ بات یہ ہے کہ اگر اس طرح پابندی مان لی جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اور ایک طریقہ سے ہمارے اہنسا اور دوسرے ملکوں کے ہنسا میں کوئی فرق بھی نہیں رہ جاتا۔

دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو ہنسا کو اپنا مقصد بناتا ہو یا اس کو مفید سمجھتا ہو۔ جو ہولناک سے ہولناک تشددی کام کرتے ہیں وہ بھی یہ کبھی نہیں کہتے کہ تشدد (ہنسا) ٹھیک ہے، بلکہ وہ یہی کہتے ہیں کہ اہنسا مفید ہے،

لیکن اس کی پابندی بھی ھے، سب جگھوں پر اس سے کام
نہیں چلتا، اس لئے ان کو مجبور ھوکر اھنسا کو چھوڑنا پڑتا
ھے. اگر کانگریس بھی اس قسم کی پابندی اور موقع پسند
اھنسا کو ھی مانتی تو اس میں اور دوسرے ملکوں میں کوئی
فرق نہ رہ جاتا. اگر فرق ھے تو اتنا ھی ھے کہ کن کن
خاص کاموں میں ھنسا (تشدد) سے کام لینا چاھئے اور کن میں
نہیں؟ اس مسئلہ میں دو رائے ھونیکی گنجائش رہ جاتی ھے.
یعنی کسی خاص حالت میں کانگریسی کہہ سکتے ھیں، جیسا کہ
وہ کہتے ھیں، کہ اھنسا ھی سے کام لینا چاھئے تھا. دوسرے
لوگ کہتے ھیں وہ حالت ایسی ھی تھی کہ جس میں مجبوراً
ھنسا سے کام لینا پڑتا ھے. مثال کے لئے سوراج حاصل کرنے
کے مسئلہ ھی کو لے لیجئے. جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ
کانگریس کے اندر یہ بات مان لی گئی تھی کہ سوراج کے
حاصل کرنے کے لئے ھم کو تشددی طریقے کام میں نہیں
لانے چاھئیں. لیکن دوسرے لوگ یہ مانتے تھے کہ کوئی
وجہ نہیں کہ جس ملک کو دوسرے ملک نے اس قسم سے
دبا کر مجبور کر رکھا ھے، وہ حصول آزادی میں اس طرح اپنے

تئیں کیوں مجبور سمجھے، اور کوئی سیاسی وجہ بھی نہیں کہ وہ تشددی طریقہ کا استعمال نہ کرے. اگر جرمنی کے مقابلہ میں کانگریس ہتھیاروں کے ذریعہ سے برطانوی حکومت کی مدد کرسکتی ھے تو وہ اسی لئے کہ برطانوی حکومت آزاد قوموں کی مدد کے لئے لڑ رھی ھے، تاکہ دوسرے آزادی پسند ملکوں کو دباکر جرمنی اپنے قبضہ میں نہ کرلے. پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی قومی آزادی کو ہندستان میں قائم کرنے کے لئے ہندوستان برطانوی حکومت کے ساتھ ہتھیاروں کے ذریعہ نہ لڑے. اس طرح کا اصولی اختلاف کانگریس ورکنگ کمیٹی میں دیکھنے میں آیا.

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اگر اسکا مطالبہ پورا ہو جائے تو کانگریس علانیہ طور پر برطانوی حکومت کو مدد دے گی. جب یہ ظاہر ہوگیا تو گاندھی جی کے لئے یہ ایک بڑا مشکل مسئلہ بن گیا. انھوں نے کسی وقت کہا تھا کہ جھوٹ کے ذریعہ اگر سوراج بھی ملے تو وہ اسے نہیں لیں گے. اس لئے کیا اس وقت تشددی مدد دیکر برطانوی حکومت سے سوراج لینا مناسب ہوگا؟ اس مسئلہ پر بہت دنوں تک چھان بین

ہوتی رہی۔ لیکن یہ ظاہر ہوگیا کہ ایک طرف گاندھی جی کا اصول تھا، دوسری طرف ان لوگوں کا جو سوراج کے لئے ہتھیاروں کے ذریعہ برطانوی حکومت کی مدد کرنی چاہتے تھے۔ دھلی اور پھر وردھا میں بہت دنوں تک غور ہوتا رہا۔ میں مہاتماجی کے اصول کو مانتا ہوں اور اس وقت بھی مانتا تھا۔ اگرچہ مجھ میں نہ تو وہ سچائی ہے نہ اتنی ہمت کہ جسطرح وہ بضد ہوسکتے تھے اس طرح میں بھی ہو سکوں۔ پھر بھی جب ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ ہوگیا تو میں نے استعفا دینا مناسب سمجھا، کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو میں اپنے تئیں بڑی مشکل میں پاتا۔ فرض کیجئے اگر برطانوی حکومت ورکنگ کمیٹی کے مطالبہ کو منظور کرلیتی تو میرا اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کا یہ فرض ہو جاتا کہ ہم اسکی مدد کرینگے۔ خواہ وہ تشددی طریقہ سے ہو یا عدم تشدد کے طریقے سے۔ اس وقت یہ کہنا نہ تو مناسب ہوتا نہ ممکن کہ ہم تو عدم تشدد پسند ہیں، اس لئے ہم تشددی جنگ میں، اگر برٹش گورنمنٹ ہمارے مطالبوں کو مان بھی لے، تشددی مدد نہین دیسکتے۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم تشددی مدد دینے کو

تیار نہیں ھیں تو ھم کو پہلے ھی الگ ھو جانا چاھئے، اسلئے میں نے پہلے سے استعفاء دے دیا. لیکن جب مجھسے یہ بتایا گیا که ابھی مدد دینے کا سوال ھی نہیں اٹھتا ھے، یہ اس وقت اٹھیگا ھے جب برطانوی حکومت ھمارے مطالبات مان لیگی، جس کا ابھی کوئی قرینـه نہیں تھا، ایسی حالت میں کانگریس کے اندر نفاق کا مظاهرہ کرکے اسے کمزور کر دینے سے کوئی فائدہ نہیں، اس وقت میں نے استعفے کو ملتوی رکھا. لیکن عبد الغفار خاں، جنکی رائے بھی وھی تھی، اپنے ارادے پر قائم رھے اور انھوں نے اپنا استعفاء واپس نہیں لبا.

جب ورکنگ کمیٹی کی تجویز آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں منظوری کے لئے پیش ھوئی تو اس وقت مہاتماجی اس میں شریك نہیں ھوئے، لیکن میں جاکر شریك ھوا. وھاں میں نے دیکھا که کمیٹی میں بھی بہت سے لوگ ایسے ھیں جو مہاتماجی سے متفق ھیں. میں نے ان لوگوں کی طرف سے ایك بیان دیکر، جس میں اپنی حالت ظاھر کر دی تھی، الگ رھنا ھی مناسب سمجھا. مگر کانگریس کو یه مشکل مسئله حل نہیں کرنا پڑا، کیونکه برطانوی حکومت نے اپنے طریقه سے اسے بہت

جلد حل کر دیا. اس نے کانگریس کا مطالبہ منظور کرلیا، اسلئے رائے دینے کا کوئی سوال ھی نہیں رہ گیا تھا. اور اس طرح سے کانگریس میں جو اختلاف دیکھنے میں آرھا تھا اس پر پردہ پڑگیا. مہاتماجی جو علیحدہ ھوگئے تھے پھر کانگریس کی لیڈری کرنے لگے اور اس کو اپنے طریقہ سے چلانے لگے. ھم لوگوں کو بہت اطمینان ھوا. کیونکہ ھم کو کانگریس جیسی جماعت سے الگ ھونے کے لئے سوچنے کی اب ضرورت نہیں رہ گئی تھی، جس طرح دوسروں کے ساتھ کام کرتے چلے آرھے تھے اسی طرح سے کر رھے تھے. مگر اس میں شك نہیں کہ وہ ایك ایسا موقع تھا جس میں ھم کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا. آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اسی اجلاس میں اتفاق رائے سے یہ بھی فیصلہ ھوا تھا کہ جہاں تك سوراج حاصل کرنے اور ملك میں آپس کے جھگڑے طے کرنے کا سوال ھے وہ اھنسا کے اصول پر ابھی قائم ھے. اتفاق رائے سے تجویز تو منظور ھوگئی لیکن پانی کی دھار روکنے کے لئے جو بند بندھا رھتا ھے اور جو مشکل سے ھی پانی کو روك سکتا ھے، اگر اس میں ایك چھوٹا سا بھی سوراخ ھو

جاتا ہے تو ہم یہ کہہ کر اس کی روك تھام نہیں کرسکتے کہ یہ چھوٹا سا سوراخ ہم نے ہی کر دیا ہے، اور بند کے باقی حصہ کو ہم اب بھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں. اس لئے جب اهنسا کے بند میں، جو آجتك ملك کو هنسا (تشدد) کی طغیانی سے محفوظ رکھتا آیا تھا. چھوٹے سے سوراخ سے بھی تشدد کا اثر ہونے لگا. جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے، ہمارے اور دوسرے ملکوں کے عدم تشدد اور تشدد کے درمیان شاید ہی کچھ فرق رہ گیا ہو.

اسکے اور بھی کئی تکلیف دینے والے ثبوت ملے ہیں جنکو یہاں مختصر طور پر بیان کیا جائے گا. ہم اس چکر میں اس طرح پڑگئے کہ ہمارے لئے اب اس میں سے نکلنا بھی دشوار ہوگیا. مہاتماجی نے اپنی جان بھی دیکر طوفان کو روکنا چاہا اور ان کے عدم تشدد نے کرامت بھی دکھلائی لیکن ملك اب بھی پوری طرح نہیں سنبھلا تھا.

گورنمنٹ کے کانگریس کے مطالبہ کو نا منظور کر دینے کے بعد کانگریس کو انفرادی ستیہ گرہ شروع کرنی پڑی، جسکی رہنمائی مہاتماجی نے کی. اب کانگریسیوں میں کوئی اختلاف اس

مسئله میں نہیں رہ گیا ۔ یعنی یه که ان کو برٹش گورنمنٹ کی مدد کرنی چاهئے یا نہیں؟ بلکه تقریباً سب کے سب اس مسئله پر ایك رائے هوگئے که برٹش گورنمنٹ کی مدد اس جنگ میں کانگریسی نہیں کرسکتے. مہاتماجی جیسے غور و فکر کرنے والے لوگ تو اس وجه سے مدد کرنی نہیں چاهتے تھے که یه تشددی جنگ کی مدد کرنی هے. بہرحال هم اپنے کو عدم تشدد پسند مانتے هوئے ایسا نہیں کرسکتے تھے. جو لوگ دوسرے خیال کے تھے انهوں نے یه سوچا که برٹش گورنمنٹ کا جب ایسا رخ هے تو اس کی مدد کیسے کی جاسکتی هے. اسلئے اس انفرادی ستیه‌گره کی اب یه شکل هوئی که هم اس لڑائی میں مدد نہیں کرسکتے. برٹش گورنمنٹ اس قسم کے پرچار کو چونکه برداشت نہیں کرسکے گی تو وہ ایسے پرچار کرنے والوں کو ضرور روکے گی. بس اس طرح ستیه‌گره شروع هوگئی. یه ستیه‌گره اس شہری اختیار کی حفاظت کے لئے تھی جو هر ایك شہری کو ملنا چاهئے تھی. وہ اختیار، خواہ وہ فوری اختیارات کے خیالوں کے مخالف هی کیوں نه هوں، اپنے خیالوں کو پوری آزادی سے ظاهر کرنے کے لئے هے.

ستیہ گرہ شروع تو ہوگئی، لیکن اس بات کی بھی پوری کوشش کی جانے لگی کہ اس کی وجہ سے کوئی ہلچل اور فساد نہ ہونے پائے، اور لوگ اپنی طرف سے عدم تشددی بنے رہیں. اس کو انفرادی شکل نہ دےکر اجتماعی دی جاسکتی تھی. لیکن مہاتماجی نے ایسا نہ کیا، کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اسوقت فساد ہو جاتا. اور اس کے علاوہ یہ بھی دکھانا تھا کہ سارا ملك اس ستیہ گرہ کے ساتھ ہے. یہ بات صرف چند آدمیوں کے انفرادی ستیہ گرہ کرنے سے ثابت نہیں ہوتی، اسلئے مہاتماجی نے فیصلہ کیا کہ تھوڑے ہی لوگ اس ستیہ گرہ میں ایك ہی بار حصہ لیں، اور ایسے لوگ شریك ہوں جو سارے ملك کی نمایندگی اور لیڈری کا دعوی رکھتے ہوں. اس سے دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ اگرچہ تھوڑے ہی لوگ اس ستیہ گرہ میں شریك ہوئے ہیں لیکن اس کو چند لوگوں کی ستیہ گرہ نہیں کہا جاسکتا، بلکہ سارا ملك اپنے نمایندوں کے ذریعہ اس میں شریك ہے. اس طرح ایك طرف منتخب نمایندوں کو ستیہ گرہ میں شریك ہونے کی ہدایت دیکر اسکو پورے ملك کے لوگوں کی ستیہ گرہ ثابت کیا گیا. اور دوسری

طرف زیادہ شور و غوغا نہ ہونے دے کر صرف ایسے ہی لوگوں کو اس میں اجازت دی گئی جو گاندھی جی کے اصولوں پر چلنے والے تھے. اس لئے جہاں تک ہوسکا اس کو عدم تشددی رکھا گیا.

اکتیسواں باب

انفرادی ستیہ گرہ میں میں نہیں شریك ہوا کیونکہ میری تندرستی خراب تھی. مہاتماجی نے مجھے روك دیا، ان کا خیال تھا کہ میرے جیل جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے علاج کا بوجھ میں گورنمنٹ پر ڈالتا ہوں، اگر وہ مجھے یونہیں پکڑ لے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی، لیکن اگر سرکار کو مجبور کرکے میں اپنے تئیں گرفتار کراؤں تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ گورنمنٹ کو میں اس دبدھا میں ڈالتا ہوں کہ یا تو وہ مجھے گرفتار کرکے میری دیکھ بھال کا بوجھ اپنے اوپر لے، اور یا قانون توڑنے پر بھی میری بیماری کی وجہ سے مجھے گرفتار نہ کرے. اور یہ ٹھیك نہیں ہے اس لئے مجھے شریك نہیں ہونا چاہئے. اسی طرح ان لوگوں کو بھی جو بیماری یا دوسری وجہ سے شریك نہیں ہوسکتے تھے ان کو ستیہ گرہ سے بری کر دیا. اس دفعہ کی ستیہ گرہ میں وہ بہت چھان بین کرکے لوگوں کو جانے دیتے تھے، ان کی اجازت کے بغیر کوئی جا بھی نہیں سکتا تھا. جس طرح ستیہ گرھی کے انتخاب میں

78a

سختی ہوتی تھی اسی طرح امن قائم رکھنے کی بھی سخت تاکید تھی. مہاتماجی کا خیال تھا کہ وہ برطانوی حکومت کو یہ دکھلا دیں کہ ان کا مطالبہ سارے ملک کا مطالبہ تھا اور اسی لئے جنتا کے نمائندے اپنے اوپر تکلیف جھیلنے کو تیار تھے. لیکن اس کے ساتھ ھی وہ گورنمنٹ کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاھتے تھے.

کانگریس کے سبھی بڑے لوگ جیل چلے گئے، اسلئے کانگریس چلانے کا بوجھ بھی ایک طرح سے گاندھی جی پر ھی رہ گیا تھا. اگرچہ کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی جیل کے باھر ھی تھے. لیکن ان کو اور مجھے زیادہ تر سیوا گرام یا وردھا ھی میں رہنے کی ھدایت کی. چنانچہ میں زیادہ تر یعنی تقریباً ایک سال تک وھیں رہا.

ادھر جنگ زور پکڑتی گئی. کیونکہ جرمن کی جیت چاروں طرف ھوتی ھوئی دکھائی دینے لگی. جاپان بھی لڑائی میں شریک ھوگیا، سنگاپور، ملایا. جاوا، سماٹرا وغیرہ کے جزائر پر اس نے قبضہ بھی کرلیا تھا، چین کے بہت بڑے حصے پر وہ پہلے ھی قبضہ جما چکا تھا. ایسا معلوم ھونے لگا تھا کہ ھندوستان

کے دروازوں پر خطرہ آپہونچا۔ یوروپ کے تقریباً سبھی ملک یا تو جرمنی کے قبضہ میں آگئے یا اس کے اثر میں تھے۔ انگلستان کو فرانس کے ہار جانے کے بعد قریب قریب اکیلے ھی لڑنا پڑ رہا تھا۔ انگلستان کے ساتھ دو بڑی طاقتیں شریک ہوچکی تھیں یعنی یوروپ میں روس اور دوسری امریکہ۔ روس نے جرمنی کو اپنی ساری طاقت لگا دینے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ امریکہ کے پاس جنگی سامان کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا اور اس کے کارخانے بھی ان اشیاء کی تیاری میں اتنی شدت سے لگے ہوئے تھے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی سمندری، زمینی اور ہوائی فوجوں کی ضرورتوں کو بہت حد تک پورا کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی فوج کو بھی ایک طرف یوروپ اور دوسری طرف جاپان سے لڑنے کے لئے بھیجنا شروع کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی سنہ ۱۹۴۱ع کے آخر سنہ ۱۹۴۲ع کے شروع میں ایسی حالت ہوگئی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جرمن اور جاپانی سب کو ہلا کر ھی رہیں گے۔

جب فرانس پر جرمنی کا دھاوا ہوا تھا اس وقت وزیراعظم

چرچل نے، حالات کی نزاکت دیکھ کر، یہ تجویز کی تھی کہ انگلستان اور فرانس مل کر ایك قوم بن جائیں. یہ تجویز اس وقت ہوئی تھی جب فرانس ہار چکا تھا اور اس میں ایسی طاقت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اتنے بڑے سوال پر غور بھی کرسکتا. اب جب ایشیا کی بھی حالت ویسی ھی خراب ہوئی تو اس وقت بھی چرچل کی حکومت نے ہندوستان کو کسی نہ کسی طرح راضی کرنا ضروری خیال کیا. شاید امریکہ نے بھی اس بات پر زور دیا. اس وقت پھر سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندستان کے نیتاؤں سے ملنے کے لئے بھیجا گیا. تاکہ وہ کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ ہندستان راضی ہو جائے اور دل کھول کر جنگ میں مدد کرے. ہندستان میں، خاصکر امریکہ کی مدد سے، لڑائی کی تیاریاں بہت زور سے ہو رہی تھیں. لیکن لاکھ تیاری ہو، اگر جنتا مخالف ھے یا کم سے کم الگ بھی رھے، پھر بھی صرف غیر ملکی فوج کہاں تك دشمن کا مقابلہ کرسکتی ھے. اس لئے شری کرپس حالات کو سلجھانے کے لئے بھیجے گئے. وہ ایك بہت ھی ہوشیار اور کارگزار بیرسٹر تھے اور مزدور جماعت میں بہت اونچا مقام رکھتے

تھے. لیکن اپنے خیالوں کی تیزی کی وجہ سے وہ اس پارٹی سے الگ ہوچکے تھے. لڑائی شروع ہونے پر وہ ایک بار نجی طور پر ہندوستان آئے تھے. یہ وہ وقت تھا جبکہ وردھا میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی جنگ کے متعلق اپنی پالیسی متعین کرنے میں لگی ہوتی تھی. اس وقت وہ وردھا آ کر نیتاؤں سے ملے. روس اور جرمنی میں اس وقت تک ان بن نہیں ہوئی تھی بلکہ دونوں میں ایک قسم کا سمجھوتہ ہوچکا تھا. انگلستان کا مفاد اس میں تھا کہ روس جرمنی کے ساتھ نہ ہو. اس لئے انگلستان نے شری کرپس کو سفیر بنا کر روس بھیجا تھا. انہوں نے وہاں جا کر بہت اچھا کام کیا. جب روس اور جرمنی میں جنگ شروع ہوگئی تو گویا ان کا وہاں کا کام پورا ہوگیا. اس لئے انگلستان نے ان کو اب ہندوستان بھیجا. ہندوستان پہونچنے کے پہلے وہ یہ اعلان کرتے رہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا راستہ ضرور نکالیں گے اور ہندوستان کو خوش کر دیں گے.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ کانگریس میں اس مسئلہ پر اختلاف تھا کہ آیا لڑائی میں سامان جنگ سے مدد دے یا

نہ دے۔ لیکن اس اختلاف کی وجہ سے لارڈ لنلتھگو سے جو وقتاً فوقتاً گفتگو ہوئی وہ ختم ہوچکی تھی. ختم ہونے کا سبب یہ تھا کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستان کے مطالبوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی. اس میں سے ایک مطالبہ تو مکمل اختیار دینے کا تھا اور دوسرا. ہندوستان کے مرضی کے موافق آئین بنانے سے متعلق تھا. اگر پہلا مطالبہ کھلے دل سے منظور کرلیا گیا ہوتا تو دوسرے کے متعلق لوگ لڑائی کے ختم ہونے تک ٹھہرنے کے لئے تیار تھے. مگر لارڈ لنلتھگو پہلے ہی مطالبہ کو منظور کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے اسلئے سمجھوتہ نہ ہوسکا. اور اس پر جھوٹا پرچار یہ کیا گیا کہ ہندوستان، مہاتما گاندھی کے اہنسا کی اصول کی بنا پر، جنگ میں مدد دینے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا. سر کرپس کے پہونچنے پر بھی یہی بات سامنے آئی.

شری کرپس کئی جگہ چکر لگائے ہوئے ہندوستان پہونچے، کانگریس اور مسلم لیگ کے نمایندوں سے ملے، اسکے علاوہ وہ اور لوگوں سے بھی ملے. جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، کانگریس کا مطالبہ دو قسم کا تھا، ایک تو یہ کہ ہندوستانی

نمایندوں کو ابھی سے حکومت میں پورا اختیار دے دیا جائے تاکہ وہ کھلے دل سے لڑائی میں مدد کرسکیں، اور دوسرے مطالبہ کے متعلق اوپر کہا جاچکا ھے کہ جو مستقل آئین بنے گا اس میں وہ کہاں تک ہندوستانیوں کو حصہ دینے کے لئے تیار ھیں. کانگریس کی طرف سے کسی ایك ذات یا فریق یا پارٹی کے لئے اختیارات نہیں مانگے جارہے تھے. اس کی ساری زندگی کی تاریخ یہ بتاتی ھے کہ وہ کسی خاص ذات یا پارٹی کی انجمن کبھی نہیں رھی. اس وقت بھی سب کی طرف سے ھی اختیار مانگا گیا تھا. اس کے برخلاف، مسلم لیگ اس بات پر راضی نہیں تھی کہ ہندو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ھمیشہ اکثریت میں رھیں. اس لئے مسلمان اس پر راضی نہ ھوسکے کہ مرکز میں ہندوستانیوں کو اختیار دیا جائے. یہ بات کچھ عرصہ تك چلتی رھی. آخر میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایك مسودہ تیار کیا جس میں، اور سب مسئلوں میں تو اختیار دیا گیا تھا لیکن، فوج اور لڑائی کے انتظام کے بارے میں بات صاف نہ ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے متعلق بھی کچھ اختیار دئے گئے ھیں. لیکن اس بات کی بھی چھان بین

کی گئی اور آخر میں پتہ چل گیا کہ فوج اور لڑائی کے بارے میں اختیارات قریب قریب نفی کے برابر دیئے گئے ھیں. لڑائی کے زمانہ میں تقریباً سبھی دوسرے ڈپارٹمنٹ لڑائی کے کام میں لگ جاتے ھیں، اسلئے ان کے متعلق بھی جو کچھ اختیارات مل سکتے تھے وہ بھی ایک طرحسے نہ ھونے کے برابر ھو جاتے تھے. کیونکہ جنگی اور فوجی محکمے جس طرح سے چاھتے اس طرح دوسرے محکموں کو استعمال کرسکتے تھے. اسلئے کانگریس نے ان کے مسئلہ کو نا منظور کر دیا. آخر میں جب کانگریس کی طرف سے یہ بات ظاھر ھوگئی تو اس وقت مسٹر جنا نے بھی اس کو نامنظور کر دیا. کیونکہ بہرحال وہ اختیارات کو تنہا نہیں لے سکتے تھے. اور اگر لیتے بھی تو وہ بغیر کانگریس کے کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے. ادھر انگلستان میں وھاں کے وزیر اعظم چرچل اتنے زیادہ دئے جانے والے نکمے اختیارات کو بھی دینا ناپسند کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس کو واپس بلا لیا، اور وہ چلے گئے.

مہاتماجی نے شروع ھی میں سمجھ لیا تھا کہ اس میں کچھ ھونے والا نہیں ھے، اس لئے ان کو ان باتوں سے کوئی

دلچسپی ھی نہیں تھی. لیکن پھر بھی وہ کئی دن تک دلی میں رھے اور بات چیت میں بھی شریک ھوئے. لیکن کچھ دنوں شریمتی کستوربا کی بیماری کی وجہ سے انہیں سیوا گرام جانا پڑا. اس پر مخالفوں نے مشہور کر دیا تھا کہ سمجھوتہ ھو جانے پر چونکہ ھندستان کو لڑائی میں انگلستان کی مدد کرنی ھوتی اور یہ مدد اھنسا کے اصول کے خلاف ھوتی اس لئے یہ بات ناکام ھوئی. جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ شری کرپس کی ناکامی کی وجہ مہاتماجی کی اھنسا نہیں تھی. کیونکہ اگر اختیار دینے کے متعلق کانگریس کا مطالبہ پورا ھو جاتا تو وہ کھل کر لڑائی میں مدد کرتی. بلکہ حقیقت میں، ان کی ناکامی کی وجہ، ھندوستان کو اختیار دینے کی انگلستان کی ناپسندیدگی تھی.

بتیسواں باب

سر اسٹیفورڈ کرپس کے واپس جانے کے بعد ملک کے سامنے بڑا مشکل سوال آیا. جاپان تیزی سے برما کی طرف آگے بڑھ رہا تھا. امریکہ کی مدد ابھی تک ہندوستان میں پوری نہیں پہونچی تھی، اگرچہ بڑی تیزی کے ساتھ فوج اور جنگی سامان آرہا تھا. انگلستان کی ایسی طاقت نہیں تھی کہ وہ برما کو بچاسکتی، ہندوستان کو بچانا تو اور بھی مشکل تھا. بچانے کا اگر کوئی ذریعہ نکل سکتا تھا تو وہ جنتا کا وعدہ ھی ہوسکتا تھا، جو ان کو حملہ کرنے والوں سے مورچے لینے اور مقابلہ کرنے کے لئے مدد دیکر حوصلہ بڑھا سکتا تھا. ایسا وعدہ اسی وقت ہوسکتا تھا جبکہ جنتا کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ اب اپنے ملک کی حفاظت کی تدبیر میں لگ گئی ھے، جس کے لئے اس کو ہر طرح کی قربانی خوشی کرنی چاھئے. لیکن برطانوی حکومت جھگڑا طے کرنے کے لئے کمزور ثابت ہوچکی تھی. اور وہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ملک کے متعلق محبت کے جذبہ کو، جو قربانی کروا سکتا تھا، بیدار ہونے دینا

نہیں چاہتی تھی. مہاتماجی نے سوچ لیا تھا کہ ایسی حالت میں آزاد طریقہ سے اپنی حفاظت کی تدبیر سوچنی چاہئے، وہ تدبیر اہنسا کے طریقہ ھی سے ہوسکتی تھی. دوسرے لوگ جو اہنسا میں اتنی طاقت نہیں دیکھتے تھے وہ اسی وجہ سے تشدد کی. جنگ میں تشدد کے طریقہ سے اپنی تیاری ظاہر کرچکے تھے. لیکن جب گورنمنٹ نے مدد لینے سے انکار کر دیا تو وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ پھر مہاتماجی کی لیڈری میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے.

وقت نازك تھا. کانگریس کے یا دوسرے لوگ اگر کوئی ایسی بات کہتے جس سے جنگ جاری رکھنے میں رکاوٹ پڑتی تو باغی سمجھے جاتے. اگر ملك کی حفاظت کے لئے کوئی آدمی آزاد تدبیر سوچتا تو وہ بھی باغی سمجھا جاتا. کیونکہ برطانوی حکومت تو یہ مانے ہوئے بیٹھی تھی کہ ہندوستان کی حفاظت کا بوجھ، چاھے سامان ہو یا نہ ہو، اسکے سر پر تھا، کسی دوسرے کے ساتھ مل کر وہ اس بوجھ کا بٹوارہ نہیں کرسکتی.

مہاتماجی اس زمانہ میں بہت شدت سے دیش کو توجہ دلا

رہے تھے کہ سب کو اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھانے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ ورکنگ کمیٹی میں اسی بات پر بہت زبردست بحث ہوئی تھی۔ مہاتماجی اس اجلاس میں نہیں آئے تھے مگر انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے لئے اپنے خیالات کے مطابق تجویز کا ایك مسودہ بھیج دیا تھا، جس کو کمیٹی کے کچھ لوگوں نے پسند بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی سب باتوں کو چھوڑ کر اگر ہم ایك رائے ہو جائیں تو بہتر ہو۔ لیکن ایسا بھی نہ ہوسکا۔ آخر میں ورکنگ کمیٹی کے سامنے تجویز کی دو شکلیں آئیں، ایك وہ جو میں نے مہاتماجی کی تجویز میں کاٹ چھانٹ کر، جہاں تك ہوسکا اس کی بنیادی باتوں کو قائم رکھتے ہوئے، تیار کی تھی اور ورکنگ کمیٹی میں رائے لینے پر اکثریت میرے موافق ہوگئی۔ لیکن اسکا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ کانگریس دو جماعتوں میں بٹ جاتی۔ مہاتماجی بھی وہاں نہیں تھے کہ ان سے رائے لی جاسکتی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تجویز کا انتظار کر رہے تھے، اس لئے اس کی

بیٹھك ایك دن کے لئے ملتوی ہوچکی تھی۔ انہیں سب باتوں پر غور کرکے میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی تجویز واپس کرلی اور کمیٹی سے کہدیا کہ میں دوسری تجویز کی مخالفت نہ کروں گا اور خاموش رہوں گا۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ معلوم نہیں مہاتماجی میری اس تجویز کو کہاں تك پسند کرینگے کیونکہ یہ تجویز ان کے مسودہ میں بہت کاٹ چھانٹ کے بعد بنائی گئی تھی، مگر تھی اسی کے مانند۔ بہرحال میں نے اسکو بھی چھوڑ دیا۔ پھر بعد میں مجھے یہ معلوم ہوکر اطمینان ہوا کہ اگر مہاتماجی نے منظور شدہ تجویز کو زیادہ پسند نہیں کیا، پھر بھی اس میں سے اپنے کام چلانے کے قابل مسالہ نکال لینا مناسب سمجھا۔ کانگریس کو ایسے نازك وقت پر مختلف رائے نہ ہونے دینے کا میرا خیال بھی ان کو ناپسند نہیں ہوا۔

اب ظاہر ہوگیا کہ حکومت کے ساتھ اختلاف ہو جائے اور لڑائی کے زمانہ میں گورنمنٹ کسی قسم کی سیاسی تحریك یعنی مخالف کارروائی کو برداشت نہیں کرسکے گی۔ لیکن ابھی تك یہ واضح نہیں تھا کہ مہاتماجی جو کچھ کرنا چاہیں گے، یعنی برطانوی اور ملك پر حملہ کرنیوالوں کی مخالفت ایك ھی

ساتھ کرنے کے لئے جو پروگرام ملک کو بتائیں گے، وہ کانگریس کے لوگوں کو کہاں تک پسند آئے گا. پروگرام چاھے کچھ بھی ھو اور دوسرے لوگ کچھ بھی کریں، ھم نے تو ارادہ کرلیا تھا کہ اب وقت آ گیا ھے کہ ھم سب کو مہاتماجی کے پیچھے چل کر ملک کو انگریزوں کے راج اور باھری حملے سے بچانے کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا ھے کرنا چاھئے.

کوئی متعین پروگرام نہیں تھا. لیکن میں نے جنتا میں بیداری پیدا کرنے کے لئے اپنے صوبہ (بہار) کا دورہ شروع کر دیا. اور بڑی تیزی کے ساتھ بہت سے حصوں میں جا کر پوری قوت سے مہاتماجی کے خیالات کو دور دور تک لوگوں کے پاس پہونچا دیا. اور اس کے ساتھ ھی ان کا آنے والے خطرے سے ھمت کے ساتھ مقابلہ کرنے اور تیار ھو جانے کے لئے حوصلہ بڑھایا. مجھے جہاں تک یاد ھے. میں نے جتنی زوردار اور زبردست تقریریں اس دورے میں کیں، اپنی زندگی میں کبھی اتنی نہیں کیں. الہ آباد کے اجلاس کے بعد میں مہاتماجی سے جا کر ملا. انہیں کی وجہ سے میں ھمت کرکے دورے پر نکلا تھا. میں خود بھی سمجھ گیا تھا اور مہاتماجی

نے بھی یہ کہا تھا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری جھگڑا ہوگا. اس وقت تک میں نے کبھی اپنی تقریر میں یہ نہیں کہا تھا کہ لوگوں کو مرنے کے لئے بھی تیار ہو جانا چاھئے، بلکہ میں تو برابر یہی کہا کرتا تھا کہ ملک کے لئے لوگوں کے مرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ھے. ملک کا تو یہی مطالبہ ھے کہ لوگ اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس کی خدمت میں لگانے کے لئے تیار ھوں. میں اتنا ھی کہا کافی سمجھتا تھا. اگر ستیہ گرہ میں بہت سے لوگوں نے اپنی جان دینے کی بابت بہت زوروں سے آمادگی ظاہر کی تھی، اور کہتے تھے کہ اب وقت آگیا ھے اسلئے مرنے کے لئے تیار ہو جانا چاھئے، اس وقت میرا یہ عقیدہ تھا اور ایسا میں سمجھتا بھی تھا کہ اگر ہم اب چوك گئے تو نہ معلوم کب تك ہم گرے رھیں گے.

تینتیسواں باب

تھوڑے دنوں بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا. اور ۸ اگست سنہ ۱۹۴۲ع کو "ہندوستان چھوڑو" کی تجویز منظور ہوئی. یہ کانگریس اور ہندوستانیوں کی طرف سے ایک چیلنج تھا. مہاتماجی نے اپنی تقریر کو "کرو یا مرو" کے منتر کے ساتھ ختم کیا تھا. رات ختم ہونے کے پہلے ہی مہاتماجی اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبر گرفتار کر لئے گئے. فوراً وہ مختلف جگہوں پر بھیج دئے گئے. بہت دنوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مہاتماجی پونا کے پاس آغا خان کے محل میں لیجا کر رکھے گئے، جہاں وہ تقریباً ڈھائی برس تک رہے. وہاں پہونچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد شری مہادیو ڈیسائی کا انتقال ہوگیا. مہاتماجی کے چھوٹنے سے کچھ دنوں پہلے شریمتی کستوربا بھی چل بسیں. ورکنگ کمیٹی کے ممبر احمد نگر کے قلعہ میں نظربند رکھے گئے. میں بیماری کی وجہ سے بمبئی کے اجلاس میں شریک نہ ہوسکا، لیکن مجھے بھی ۹ اگست کی صبح کو بیماری کی حالت میں گرفتار کرکے پٹنہ

جیل میں رکھا گیا، جہاں میں ۲٤ جون سنہ ۱۹٤۳ع تک رہا. مہاتماجی کے مضمونوں سے سارے ملک میں بڑی بیداری تھی. بہار میں میرے دورے نے بھی کچھ اثر پیدا کر دیا تھا. لیکن یہ کہنا صحیح نہیں، جیسا کہ بعد میں کہا گیا. کہ توڑ پھوڑ کا پروگرام پہلے سے طے کرکے لوگوں کو بتا دیا گیا تھا. اور جنتا نے اسی پروگرام کے مطابق ریل کی پٹریوں کو اکھاڑا اور ریلوے اسٹیشنوں کو بیکار کر دیا اور ٹیلیفون کے تاروں کو کاٹ ڈالا، اسٹیمر کے جٹیوں کو بہا دیا، اور سڑکوں پر درختوں کو کاٹ کر اس طرح ڈال دیا کہ ان پر ہر سواری کا آنا جانا ناممکن ہوگیا.

سنہ ۱۹۳۰ع کی ستیہ گرہ کے زمانہ میں یہ چرچا ہوا تھا کہ تار کاٹ دیئے جائیں، تاکہ گورنمنٹ کی بھیجی ہوئی خبر جلد سے جلد ایک مقام سے دوسرے مقام تک نہ پہونچ سکے. ستیہ گرہیوں کے لئے تو تار کام آتے ھی نہیں تھے. کانگریس کے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ لوہا لکڑی تو بیجان چیز ھے اس کے توڑنے اور کاٹنے میں تو کوئی ہنسا کی بات نہیں ہوئی. لیکن سب باتوں پر غور کرکے یہ پروگرام منظور کر دیا گیا تھا.

مہاتماجی اس وقت دهلی میں تھے، یہ فیصلہ ان سے بغیر پوچھے ہوئے ہی کر دیا گیا تھا. بمبئی کے اجلاس سے کچھ پہلے وردھا میں ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک ہوئی تھی. وهیں پر بمبئی میں اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا. انہیں دنوں میں جب ورکنگ کمیٹی کا کام ختم کر کے بہت سے لوگ ادھر ادھر چلے گئے تھے تو میں کچھ دنوں وهیں ٹھہرا رہا. ایك دن کسی نے مہاتماجی سے یہ سوال پوچھ لیا کہ تار کاٹنا هنسا (تشدد) ھے یا نہیں. انھوں نے جواب دیا کہ لکڑی اور اور لوھا کاٹنے میں هنسا (تشدد) یا اهنسا (عدم تشدد) کا سوال پیدا ھی نہیں ھوتا. لیکن یہ کام کون کرتا ھے، اور کس خیال سے کرتا ھے، اور اس کا کیا نتیجہ ھوتا ھے؟ ان باتوں سے اس کام کا تشدد یا عدم تشدد والا ھونا منحصر ھوتا ھے.

جب میں پٹنہ واپس آیا تو بمبئی کے اجلاس کے پہلے صوبائی کانگریس کمیٹی کے تقریباً سبھی لوگوں کو میں نے بلایا. اور اس بات کا ذکر کیا. ساتھ ھی ساتھ توجہ دلائی کہ یہ کام مہاتماجی کی اجازت کے بغیر نہیں کرنا چاھئے. کیونکہ اس سے

بڑی دقتیں پیدا ہوسکتی ہیں، اور اسکا اثر بھی بہت برا پڑ سکتا ہے. جب بمبئی جانے کا وقت آیا تو میں نے سوچا کہ ممکن ہے کہ وہاں ہم سب لوگ گرفتار کرلئے جائیں اور لوگوں کو ہدایت دینے کا موقع نہ ملے. اسلئے میں نے صوبائی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری سے کہا کہ ایک پروگرام تیار کر لینا چاہئے، جس کے مطابق اگر کوئی لڑائی چھڑگئی اور ہم میں سے کوئی پروگرام دینے والا نہ رہا تو کام چلتا رہیگا. میں بیمار تھا اور خود بہت نہیں لکھ سکتا تھا، اسلئے میں نے صرف باتیں بتا دی تھیں. چنانچہ میرے سامنے پروگرام لکھ کر رکھا گیا. میں نے اس میں جو ترمیم مناسب سمجھی کر دی. اس میں ایک بات ریل تار وغیرہ کے توڑنے اور کاٹنے وغیرہ کے متعلق بھی تھی، لیکن میں نے اسے اپنے قلم سے کاٹ دیا. میں نے اس پرچہ کو چھپوا کر رکھنے کی ہدایت کر دی. میں امید کر رہا تھا کہ میں بمبئی جاسکوں گا. لیکن جب نہ جاسکا تو میں نے ہدایت کر دی کہ وہ پرچہ ابھی نہ چھاپا جائے اور بمبئی کے فیصلے کا انتظار کیا جائے. میں سمجھتا تھا کہ وہ ابھی تک چھاپا نہیں گیا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، وہ چھپا کر تیار کیا

جاچکا تھا۔ جب ۹ اگست کو میری گرفتاری کے لئے لوگ آگئے تو میں نے سوچا کہ اب وقت آگیا ھے کہ اب پرچہ چھپوا کر تقسیم کروا دیا جائے، ورنہ جنتا یہ نہ سمجھ سکیگی کہ اسے کیا کرنا چاھئے۔ لیکن مجھے معلوم ھوا کہ پرچے چھپ کر تیار ھوگئے ھیں۔ جیل جانے سے پہلے ھی میں نے ھدایت دے دی تھی۔ کہ وہ فوراً پورے صوبہ میں بٹوا دئے جائیں۔ میرے جیل جانے کے بعد یہ معلوم ھوا کہ بانٹ دئے گئے۔ زیادہ تر اسی کے مطابق لوگوں نے کام بھی کیا۔ لیکن اس میں، جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، ریل اور تار توڑنے اور کاٹنے کے متعلق کوئی ھدایت نہیں دی۔ یہ کام بہت زوروں سے بہار میں ھوا۔ جیل میں میں سوچا کرتا تھا کہ یہ خیال کیوں اور کیسے پھیلا۔ لیکن اسکا سبب بہت جلد معلوم ھوگیا۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ کانگریس کی طرف سے یہ پروگرام دے دیا گیا تھا کہ کم از کم بہار کے لئے، جہاں سب سے زیادہ توڑ پھوڑ ھوئی تھی، بالکل بے بنیاد ھے۔ پھر بھی میں کہتا ھوں کہ میں نے، سیواگرام میں جو باتیں ھوئی تھیں، ان کا ذکر کر دیا تھا، لیکن ساتھ ھی ساتھ یہ تنبیہ بھی کر دی تھی۔ چھپے پرچے

میں، جو میری گرفتاری کے دن هی بہار کے کونے کونے میں پہونچ گئے، اس کا کوئی ذکر نہیں تھا. لیکن اس پروگرام کے چلانے میں گورنمنٹ کا بھی مخصوص هاتھ تھا. ۸ اگست کی رات کو مہاتماجی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی گرفتاری کے پہلے هی ایك اعلامیہ نکالا گیا تھا. جس میں سرکار نے کانگریس کے پروگرام کا ذکر کیا تھا، اور گرفتاریوں کو اسی پروگرام کی وجہ سے ضروری اور مناسب بتایا گیا تھا. گورنمنٹ کے هی اعلامیہ میں شائع شدہ پروگرام میں ریل تار وغیرہ کا توڑنا بھی ایك پروگرام بتایا گیا تھا.

یہ اعلامیہ ۹ اگست سنہ ۱۹٤۲ع کے سویرے هی سارے ملك میں چھپ گیا تھا. میں اس اعلامیہ کو پڑھ رها تھا، جب میری گرفتاری کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پہونچے تھے. اسی دن یا ایك دن کے بعد وزیر هند مسٹر ایمری نے انگلستان میں بیان دیا، اس میں بھی اس کا ذکر تھا، وہ بھی هندوستان میں شایع هوا. مجھے یقین هے کہ جنتا نے گورنمنٹ کے اعلامیہ سے هی یہ معلوم کرلیا کہ کانگریس کے پروگرام میں یہ سب باتیں داخل هیں. اور جب کانگریس کی کوئی بڑی

شخصیت اسے روکنے کے لئے باهر نہ رہ گئی تو لوگوں نے اپنا فرض سمجھا کہ جہاں تك هوسکے یہ پروگرام پورا کرنا چاهئے. بہار کے متعلق میں کہہ سکتا هوں کہ لوگوں کا یہی اعتقاد تھا. کیونکہ مجھے دو باتیں جیل میں معلوم هوئی تھیں جن سے اس بات کی تصدیق هوتی هے.

میری گرفتاری کے تھوڑے هی دنوں بعد ایك دوسرے دوست گرفتار هوکر آئے. جنہوں نے مجھ سے ایك بات کہی، جس کا ذکر کرنا یہاں مناسب هوگا. میرے گرفتار هو جانے کے بعد کچھ نوجوان ان کے پاس پہونچے. انہوں نے ان سے پوچھا کہ میں ان کی گرفتاری کے پہلے کوئی پروگرام بتا گیا هوں یا نہیں. انہوں نے جواب دیا کہ کئی روز سے مجھ سے ان سے ملاقات نہیں هوئی، اسلئے وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے کوئی پروگرام دیا هے یا نہیں. اس پر ان نوجوانوں میں سے ایك نے گورنمنٹ کے اعلامیہ کو جو اخباروں میں چھپا تھا انہیں دکھایا اور کہا کہ کانگریس کا پروگرام تو چھپ گیا هے. انہوں نے جواب دیا کہ مجھے تو معلوم نہیں. لیکن جب گورنمنٹ خود کانگریس کا پروگرام بتاتی هے، تو هم سب کو

اسی کے مطابق کام کرنا چاھئے. اس سے مجھے یقین ھوگیا کہ اب یہ پروگرام چلے گا. میرے اس یقین کی تصدیق ایک واقعہ سے دوسرے ھی روز ھوگئی. پٹنہ میں لوگوں نے تار اور ٹیلیفون جگہ جگہ کاٹ دئے. یہاں تک کہ اب جیل سے کسی سرکاری دفتر میں یا کسی افسر کے پاس ٹیلیفون کے ذریعہ خبر نہیں دی جاسکتی تھی. سارے شہر میں بہت دھوم تھی. جلوس بنا کر لوگ سکریٹریٹ تک گئے وھاں ایک دو نوجوان کسی طرح چھپ کر چھت پر جا پہونچے. اور اوپر ھی قومی جھنڈا لہرا دیا. کچہریاں بند ھوگئیں. راستہ پر گاڑیاں چلنا مشکل ھوگیا. سکریٹریٹ کے سامنے گولی چلی. کئی نوجوان ھلاک ھوئے. بہت سے گرفتار ھوکر پٹنہ جیل میں لائے گئے. جیل میں اتنے آدمیوں کے لئے جگہ بھی نہیں تھی اس لئے لوگ وھاں چاروں طرف احاطہ کے اندر پھرتے رھے. وہ جیل کے دو منزلہ کوٹھے پر چڑھکر، جو سڑک کے کنارے کی طرف ھے، سڑک پر چلتے ھوئے لوگوں کا حوصلہ بڑھا رھے تھے. جیل کے افسروں نے آکر ھم لوگوں سے کہا کہ ھم اگر ان کو نہیں سنبھالیں گے تو ممکن ھے کہ

دوسرے بڑے افسر آکر سختی کریں اور یہ لوگ، جن میں تقریباً سب طالب علم ھی ھیں، گولیوں کا نشانہ بنیں.

اس وقت تک بہار کے بڑے کانگریسیوں میں سے بہت سے پٹنہ جیل میں پہونچ چکے تھے. ان لوگوں نے بھی لڑکوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی. وہ جب ان کے نزدیک آجاتے تو ان کی بات مان لیتے تھے، لیکن آنکھوں سے اوجھل ہوتے ھی پھر اپنا کام شروع کر دیتے تھے. جو باتیں وہ خاصکر سڑك پر چلتے ہوئے لوگوں کو چلا چلا کر سناتے تھے، ان میں سے خاص طور سے ریل اور تار وغیرہ توڑنے پھوڑنے کی باتیں ھی ہوتی تھیں. آخر میں جیل کے افسروں نے ایسے چالیس لڑکوں کو لاری میں بٹھا کر کیمپ جیل میں، جو اس جیل کے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا، بھیج دینے کا ارادہ کیا. دو لاریوں پر کچھ لڑکے سوار کرائے گئے اور لاریاں روانہ ہوگئیں. باقی لڑکے جیل کے اندر ھی تھے اور لاری تک نہیں پہونچے تھے. اتنے میں جنتا کا مجمع، جو جیل کے قریب پہلے ھی سے موجود تھا، ان پر ٹوٹ پڑا. اور لاریوں میں سے لڑکوں کو اتار لیا اور لاریوں

میں آگ لگادی، جو جیل کے سامنے ھی جل گئیں. کچھ لڑکے اس بھیڑ میں مل گئے اور اس مجمع کے ساتھ باھر چلے گئے، لیکن بعض جیل میں خود واپس آگئے. اب گورنمنٹ کی طرف سے دوسری تیاری ھونے لگی. فوج اور پولیس کو بڑی تعداد میں بلا کر دوسری لاریوں میں باقی لوگوں کے لیجانے کا انتظام کیا جائے گا. میں تو بہت بیمار ھی تھا اسلئے زیادہ انتظام نہیں کرسکتا تھا، لیکن پھر بھی میں نے ان لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کی که اس طرح سے لاریوں کو جلا دینا یا اس طرح پولیس پر حمله کرکے قیدیوں کو چھڑا دینا کچھ ٹھیک نہیں ھے. باوجودیکه وہ میرا بہت لحاظ کرتے تھے اور شانتی کے ساتھ باتیں بھی کرتے رھے. لیکن پھر بھی ان کو میں یه نه سمجھا سکا که توڑ پھوڑ کا کام غلط ھے، اور اگر ایسا کرنا ھی ھے تو اس کو طریقه سے کرنا چاھئے. میں جانتا ھوں که ستیه گرہ میں چھپ کر کسی کام کو کرنے کی گنجائش نہیں ھے. ستیه گرھی جو کچھ کرتا ھے ھمیشه بے خوف ھوکر کرتا ھے، ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ھے. اور اپنے کئے کا نتیجه بھگتنے کے لئے تیار رھتا ھے. اس لئے اسے چھپنے چھپانے

کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ چھپنے چھپانے کا مطلب تو سزا سے بھاگنا ہے اور جو کچھ کیا جائے اس کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیکر دوسرے کے سر تھوپنا ہے۔

اس تحریک میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ریل کے آس پاس کے لوگوں پر بڑی سختی کی گئی۔ اس کا کسی نے پتہ نہ لگایا کہ کس نے تار کو کاٹا اور ریل کو توڑا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایسے لوگوں کو سختی کا شکار بننا پڑا جو توڑ پھوڑ میں کبھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ میں نے یہی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی اور کہا کہ اگر یہ کرنا ہے تو کھلم کھلا اور ممکن ہو تو اطلاع دیکر اس طرح کام کرنا چاهئے۔ ایسا نہ کرنے سے تو بے قصور لوگ پس جائیں گے۔ اسوقت تو یہ سبھی جانتے تھے کہ چاھے جس طرح سے ہو، گورنمنٹ کے کام کو بند کرا دینا چاهئے۔ لوگوں نے ایسا کیا بھی ہے۔ کم از کم بہار میں جو توڑ پھوڑ کا کام اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنی کامیابی کے ساتھ ہوا اس کا الزام میں کانگریس کو نہیں دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ جنتا کی اپنی حرکت تھی، لوگوں نے اس میں کوئی هنسا (تشدد) نہیں دیکھا، بس اسے شدت سے

چلتا ہوا دیکھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا الزام کسی دوسری جماعت کے لوگوں پر بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ سبھی جماعتوں کے بڑے لوگ اس کام کے پھیلنے سے بہت پہلے تقریباً گرفتار کر لئے گئے تھے، وہ کوئی تنظیم بھی نہیں کرنے پائے تھے۔ بلکہ یہ تنظیم خود جنتا کی تھی۔ جنتا نے اپنی عقل کے مطابق اسے کانگریس کا پروگرام سمجھ کر جہاں تک ہوسکا پورا کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دنوں کے بعد تحریک کچھ دھیمی پڑ گئی۔ باہر بچے ہوئے لوگ کوشش کرنے لگے کہ یہ کام جاری رہے۔ لیکن ان کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جنتا کا جوش ہی اس کی ایک حد تک وجہ تھا۔

بہار میں یہ تحریک بہت زوروں سے چلی۔ ریلوں کا چلنا، بڑی (ای۔آئی۔آر) اور چھوٹی (او۔ٹی۔آر) لائن بہت دنوں تک بند رہیں۔ تار وغیرہ تو رک ہی گئے تھے۔ بہت سے پولیس تھانوں پر جنتا نے قبضہ کرلیا تھا۔ کئی اضلاع میں برطانوی راج کا حکم صرف ضلع کے شہروں تک یا سڑکوں کے اس حصہ تک باقی رہ گیا تھا جہاں پولیس یا فوج کی ٹولیاں

گذر رهی هوں۔ فوج نے بھی جس جگہ لوگوں کو پایا وهاں ان کو بے تحاشہ گولیوں کا نشانہ بنایا. گاؤوں کو خوب لوٹا اور جلایا. لوگوں نے بھی ریل کے مال گوداموں اور مال سے لدے ہوئے ڈبوں سے، جو لائنوں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے جگہ جگہ پڑے ہوئے تھے، کافی مال لوٹا. اس لوٹ میں پولیس کا بھی هاتھ اور حصہ رها کرتا تھا. کیونکہ یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی تھی کہ لوگ لوٹ لئے گئے هیں. فوج نے چاروں طرف پھیل کر بڑی سختی سے قوت استعمال کی. کئی هفتوں کے بعد آهستہ آهستہ ریل کی پٹریاں دوبارہ ڈالی گئیں، اس وقت ریلوں کا چلنا پھر سے شروع ہوا. بہار میں گنگا سے اتر کے تقریباً جملہ ضلعوں میں اور صوبہ متحدہ (یو۔پی) کے پوربی ضلعوں میں بھی او۔ٹی۔ریلوے (چھوٹی لائن) زیادہ تر تباہ ہوگئی تھی. گنگا سے دکھنی ای۔آئی۔ریلوے (بڑی لائن) تقریباً مغل سرائے سے (پٹنہ ہوکر) آسن سول تک بہت سی جگہوں پر توڑ پھوڑ دی گئی تھی. لیکن گرینڈ کورڈ لائن، جو مغل سرائے سے آسن سول تک (سہسرام۔گیا ہوکر) جاتی هے، بہت حصوں میں محفوظ رہ

گئی. اس لئے ای.آئی.آر کا کام اتنا نہیں رکا جتنا او.ٹی.
ریلوے کا.

جنتا نے صرف ریل اور تار ھی کو خراب نہیں کیا بلکہ لوگوں نے اسٹیمر چلنے کی بھی ایك طریقه سے روکنے کی تدبیریں کی تھیں. گنگا میں جگه جگه اسٹیمروں کے ٹھہرنے کے لئے جو لوھے کی بڑی بڑی کشتیوں کے گھاٹ بنے تھے، جن کو «جیٹی» کہتے ھیں، ان کو بھی لوگوں نے برباد کر دیا. جیٹیوں کو کھول کر گنگا میں ڈبو دیا یا بہا دیا. کئی اسٹیمروں کے اندر گھس کر ان کے پرزوں کو اس طرح توڑ ڈالا که وہ کچھ عرصه کے لئے بیکار ھوگئے. سڑکوں پر بڑے بڑے درختوں کو کاٹ کر گرا دیا، تاکه ان پر کوئی گذر نه سکے. میں نے سنا که پلوں کو توڑنے کی بھی، چاھے ریل کی لائنوں پر ھوں یا سڑکوں پر، تدبیریں کی گئیں، لیکن ڈائنامیٹ نه ھونے کی وجه سے یه نه ھوسکا. یه سب لوگوں نے اس وجه سے کیا تاکه فوج اور پولیس جلد ھی سب جگه نه پھونچ سکے اور گورنمنٹ کا کاروبار بند ھو جائے، اسطرح ایك قسم کی بدامنی پھیل جائے. یه تعجب کی بات ھوئی که

اس زمانہ میں جنتا کے گھروں میں ایک طرح سے چوری اور ڈکیتی بند ہوگئی. اگر ریل یا سرکاری دفتروں پر جنتا کی طرف سے لوٹ مار کی گئی تو جنتا کے گھروں پر پولیس اور فوج کی طرف سے بھی لوٹ مار کی گئی. جگہ جگہ فوج اور پولیس کے کچھ آدمی بھی مارے گئے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، البتہ جنتا میں مرنے والوں کی تعداد بہت تھی.

اس عمل کا نتیجہ اس وقت یہ نہیں دیکھنے کو ملا کہ برطانوی حکومت دفعتاً ہندوستان سے اٹھ جائیگی. کچھ دنوں کے لئے چند جگہوں پر، خاصکر بہار میں، انگریزی راج اٹھ گیا. لیکن یہ بات نہ تو عام طو پر پھیلی ہوئی تھی اور نہ مستقل تھی. بعد میں فوج اور پولیس نے حالت پر قابو پالیا. لیکن یہ دو باتیں ظاہر ہوگئیں. پہلی یہ کہ اگر جنتا ایک ساتھ سبھی جگہوں پر بگڑ جائے اور انگریزی حکومت کو ماننے سے انکار کر دے تو انگریزی راج نہیں چل سکتا ھے. اور دوسری یہ ھے کہ جنتا اگر بگڑ جائے تو گورنمنٹ کی ساری فوج بھی اسے دبا نہیں سکتی. اس دفعہ اگر لڑائی کے لئے اتنی بڑی تعداد میں فوج بہار میں نہ ہوتی اور اس کے پاس

جاپان سے لڑنے کے لئے اتنا سامان موجود نہ ہوتا تو کم از کم بہار کو دوبارہ فتح کرنا آسان نہ ہوتا، اور اگر ہوتا بھی تو اس میں وقت بہت لگتا. لیکن لڑائی کی وجہ سے انگریزی اور امریکی فوج بڑی تعداد میں بہار میں موجود تھی اور اسکے پاس بڑی تعداد میں سامان جنگ بھی موجود تھا. اور آمد و رفت کے ذرائع بھی تھے، جسکو اس نے جنتا کی اس بغاوت کو دبانے میں خوب استعمال کیا. جنتا نے اپنی طرف سے توڑ پھوڑ خواہ کتنی بھی کی ہو لیکن اس نے آدمی کی زندگی پر حتی الامکان حملہ نہیں کیا. بعض جگہوں پر جو کچھ خون ہوئے وہ لوگوں کے پریشان ہو جانے کی وجہ سے ہوئے، کیونکہ پولیس اور فوج کی طرف سے ظلم اور سختی بہت ہو رہی تھی. برسات کے دن تھے، ندیوں میں طغیانی آئی ہوئی تھی، فصل کھڑی تھی. برسات میں یونہیں آنا جانا مشکل ہو جاتا ہے، اور اسوقت تو اس کے ذرائع بھی تقریباً بہت برباد کر دئے گئے تھے. جنتا میں زبردست اعتماد پیدا ہوچکا تھا. میں نے یہ بھی سنا کہ فوج والے بھی کھیتوں کے، خاصکر گنے اور مکے کے کھیتوں کے پاس ہوکر گذرنے

سے ڈرتے تھے، کیونکہ ایک دو جگہوں پر چھپے ہوئے لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا. ان سب باتوں سے ظاہر ہوگیا کہ اگرچہ اس دفعہ برٹش گورنمنٹ نے اس تحریک کو دبانے کی پوری پوری تدبیر کی، پھر بھی اس بات کو سمجھ گئی کہ اب وہ بھارت (ہند) کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکیگی. اسے ہندوستان کے ساتھ کچھ نہ کچھ سمجھوتہ کرنا ھی ہوگا. لڑائی کی وجہ سے اس کو جان و مال دونوں بہت خرچ کرنے پڑ رہے تھے، اس لئے دنیا کی طاقتوں میں ایک بڑی طاقت ہوتے ہوئے بھی وہ کمزور پڑتی جارھی تھی، جس سے اس کو سنبھالنا اور بھی مشکل ہوگیا تھا. اور یہ مشکل روز بروز بڑھتی جا رہی تھی. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کو وہ قبضہ میں نہ رکھ سکی. ایسا ھی ہوا بھی. لڑائی ختم ہونے کے پہلنے ھی مسٹر چرچل نے بھی، جنہوں نے لڑائی کے جیتنے میں اپنی جرأت دکھائی تھی اور جو ہندستان کو سوراج دینے کی بڑی مخالفت کرتے چلے آئے تھے، لارڈ ویول کو وائسرائے بنا کر یہاں بھیجا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ کانگریسیوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرلیں.

چونتیسواں باب

کچھ دنوں تک حالت کا مطالعہ کرنے کے بعد لارڈ ویول نے جون سنہ ۱۹۴٤ع میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو چھوڑ دیا. گاندھی جی پہلے ھی چھوڑ دئے گئے تھے. ایک کانفرنس سنہ ۱۹٤۵ع میں بمقام شملہ طلب کی گئی اس میں تمام صوبوں کے وزیر اعظم، جو اس وقت تک کام کر چکے تھے اور جو کر رھے تھے یا جنہوں نے لڑائی شروع ہونے پر کانگریس کے حکم سے عہدے چھوڑ دئے تھے، بلا لئے گئے. مہاتماجی اور مسٹر جینا کو بھی دعوت دی گئی. ان کے علاوہ مرکزی اسمبلی کی مختلف جماعتوں کے لیڈر بھی بلائے گئے. کانفرنس ۱٤ جولائی سنہ ۱۹٤۵ع میں ہوئی. لارڈ ویول نے اعلامیــہ نکال دیا کہ وہ برطانوی سرکار کی خواھش سے یہ کانفرنس کر رھے ھیں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں اور صوبہ کے دوسرے لیڈروں کو چھوڑنے کا حکم دے رھے ھیں. برٹش سرکار کی یہ تجویز تھی کہ وائسرائے کی کونسل میں، جس میں اب تک زیادہ انگریز ھی ہوا کرتے تھے

اور بڑے محکمے جیسے ہوم ڈپارٹمنٹ (محکمہ داخلہ) فینانس
ڈپارٹمنٹ (محکمہ مال) اور فوجی محکمہ جو انگریز ممبروں کے
پاس رہا کرتے تھے. اب دو، یعنی وائسرائے اور کمانڈر
انچیف (سپہ سالار)، کے علاوہ سارے ممبر هندوستانی هی
ہونگے. کونسل کے ممبروں کے اختیارات میں کوئی فرق نہوگا
بلکہ وہ ختیارات وهی رهیں گے جو سنہ ۱۹۳۵ع کے آئین کے
مطابق ان کو دئے گئے تھے. لارڈ ویول نے اپنے بیانوں سے
اس کو اور صاف کر دیا کہ اس اسکیم کے مطابق سب سے
پہلے فینانس ڈپارٹمنٹ (محکمہ مال)، هوم ڈپارٹمنٹ (محکمہ داخلہ)
اور غیر ملکوں سے تعلق رکھنے والا محکمہ، یہ تینوں محکمے
هندستانیوں کے هاتھ میں رهیں گے. انهوں نے یہ بھی بتا دیا
کہ ان کے خیال سے اس کونسل میں، سوائے هریجن کے،
هندو اور مسلمان تعداد میں برابر ہونگے. انهوں نے امید ظاهر
کی تھی کہ اگر کانفرنس کامیاب ہوگئی اور کونسل بھی بن گئی
تو آئندہ اس پر غور کیا جائے گا کہ آئین کیسے بنے. مسلم
لیگ کی وجہ سے کانفرنس کسی ایک رائے پر نہ پهونچ سکی.
اسوقت لارڈ ویول نے ساری جماعتوں سے درخواست کی کہ

وہ ایسے لوگوں کا نام لیں جن کا کونسل میں آنا وہ مناسب سمجھتے ہیں. اور ان باتوں سے وہ خود ھی ممبروں کے نام چن لیں گے. لیکن مسلم لیگ نے ایسی فہرست دینے سے بھی انکار کر دیا، اسلئے کانفرنس بغیر کسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے ختم ہوگئی. لیکن لارڈ ویول نے کانفرنس ختم ہو جانے پر بھی امید نہ چھوڑی، بلکہ انہوں نے کہا کہ پھر کسی موقع پر یہ تدبیر کی جائے گی، اسوقت جیسے کام چل رہا ھے ویسے ھی چلتا رہے گا.

اگرچہ سنہ ۱۹۴۲ع میں اور اس کے بعد بھی گورنمنٹ کی طرف سے قوت کی پالیسی کا کانگریس کے خلاف برابر استعمال ہوتا رہا، لیکن پھر بھی جب لارڈ ویول نے یہ کانفرنس بلائی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو جیل سے رہا کر دیا. اسوقت سے مہاتماجی کے دل میں ایسا جذبہ پیدا ہوگیا کہ برٹش گورنمنٹ واقعی ہندوستان کے ساتھ کچھ نہ کچھ سمجھوتہ کرنا چاہتی ھے. یہی جذبہ کانگریس کے دوسرے بہت سے لوگونکے دل میں بھی تھا. اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو کانگریس کا اس میں شریك ہونا اور اس کے بعد جتنی کاروائی ہوتی رہی

ان سب باتوں کو ناپسند کرتے ھی رھے ، پھر بھی مہاتماجی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ھمیشه یه کوشش رھی که اگر ھوسکے تو سمجھوته ھو جانا چاھئے. اس جذبه کا ایك سبب یه بھی تھا که لڑائی تقریباً ختم ھونے پر آچکی تھی. جرمنی اور اٹلی ھار چکے تھے. جاپان ابھی لڑ رھا تھا لیکن وہ بھی ھارتا جا رھا تھا، جس حصه زمین کو اس نے اپنے قبضه میں کرلیا تھا اس سے آھسته آھسته ھٹایا جا رھا تھا. سنه ۱۹٤۲ع کی تحریك ایسے وقت میں شروع ھوئی تھی جب جرمنی اور جاپان جیت رھے تھے اور انگریز اس وقت تك ھار رھے تھے. اب جبکه وہ قریب قریب فتحیاب ھوچکے تھے تو انھوں نے سمجھوته کرنے کی تجویز کی، اس لئے واقعی وہ سمجھوته چاھتے ھونگے. یه جذبه صحیح ثابت ھوا، کیونکه آخر میں ھندوستان آزاد ھوکر رھا.

مندرجه بالا کانفرنس کے ختم ھونے کے تھوڑے ھی دنوں کے بعد انگلستان میں نیا انتخاب ھوا. مسٹر چرچل کی جماعت ھار گئی، مزدور جماعت کی وزارت بن گئی. اس جماعت نے پہلے ھی سے زبان دے رکھی تھی که وہ ھندوستان کو آزاد

کر دے گی. اس وعــدہ کو وہ بھولی نہیں تھی. تھوڑے ھی دنوں کے بعد اس کی وزارت نے تین ممبروں کو ھندوستان سے بات چیت اور سمجھوتہ کرنے کے لئے بھیجا. یہاں ان سب لوگوں کے متعلق کوئی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں. انھوں نے یہاں پہونچ کر کانگریس اور مسلم لیگ کے نمایندوں سے گفتگو کی. آخر میں انھوں نے یہ خیال ظاھر کیا کہ ھندوستان کا آئین بنانے کے لئے ایک کونسل بنائی جائے جو ھندوستان کا آئین تیار کرے. اس کے ساتھ ھی اس وقت یہاں کی حکومت چلانے کیلئے وزارت بھی بنائی جائے. جس میں کانگریس اور لیگ کے نمایندے ھوں. بہت بحث و مباحثہ کے بعد ایسی وزارت بن سکی. لیگ کے لوگ پہلے اس میں شریک نہیں ھوئے لیکن بعد میں وہ بھی آگئے. مسلم لیگ اس پر تلی ھوئی تھی کہ پاکستان بن جائے اور وہ ھندوستان جیسا آزاد ملک ھو. اسی کے لئے مسلمانوں میں بہت زبردست اور زھریلا پرچار ھوتا رھا، جسکا نتیجہ یہ ھوا کہ کانگریس کے وزارتی عہدے قبول کرنے کے چند ھی روز قبل کلکتہ میں مسلمانوں نے بڑا زبردست بلوہ کر دیا. جس میں بہت

سے ہندو مارے گئے اور ان کے گھر اور مال کو لوٹا گیا، جس سے ان کی بہت بربادی ہوئی. بنگال میں اسوقت لیگی گورنمنٹ تھی، اس لئے اس کی طرف سے ہندوؤں کو کچھ مدد نہیں پہونچی. آخر میں ہندوؤں نے بھی اپنی آزاد جماعت بنالی اور اپنے بچاؤ کے لئے وہ مستعد اور تیار ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسلمان بھی مارے گئے. کئی دن تک یہ خونی ڈرامہ چلتا رہا. کچھ دنوں کے بعد پوربی بنگال میں، جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ھے یعنی نوا کھالی اور اور آس پاس کے مقاموں میں، بہت زور سے اور بڑے پیمانے پر بلوہ شروع ہوگیا. اس میں بہت سے ہندوؤں کے گھر لوٹے اور جلائے گئے. بہت سے ہندو زبردستی مسلمان بنائے گئے. مہاتماجی نے جب ان سب واقعات کی خبر پائی تو انھوں نے بنگال جانے کا ارادہ کیا. تاکہ وہ ہندوؤں کو اطمینان دلا سکیں اور مسلمانوں کو سمجھا سکیں. وہ نوا کھالی گئے. انکا وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہاں جانا مناسب سمجھا. نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں ہمت آگئی. اور مسلمان ان کے وہاں

جانے کو پہلے تو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے. لیکن آہستہ آہستہ لوگ ان کی طرف جھکنے لگے. یہ اہنسا کی کراماتوں میں سے ایک کرامت تھی، جو آئندہ چل کر کچھ اور بھی دیکھنے میں آئے گی.

بنگال میں بہار کے لوگ بہت جایا کرتے ہیں اور وہاں محنت کرکے روزی کماتے ہیں. ان میں پڑھے لکھے بہت کم ہوتے ہیں اور وہ چھوٹی موٹی نوکریوں سے بہت مطمئن ہو جاتے ہیں. کلکتہ میں بھی یہ تعداد بہت زیادہ ہے. سارے بنگال میں، جس میں پوربی بنگال بھی شامل ہے. بہار کے آدمی ہر گاؤں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں. کلکتہ کی خونیں لڑائی میں بہت سے بہاری بھی کام آئے، اور بہت سے بھاگ کر اپنی جان بچانے کے لئے اپنے صوبہ کے گاؤں میں واپس چلے آئے. ان کے ساتھ جو ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اور کلکتہ میں مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا تھا، ان سب باتوں کو انھوں نے بہار کے گاؤں میں پھیلا دیا. نتیجہ یہ ہوا کہ بہار میں مسلمانوں کے خلاف بہت غصہ پیدا ہوگیا. چنانچہ موقع پاکر وہاں بھی بڑی شدت

سے بلوہ اور فساد شروع ہوگیا. بنگال کی حالت بہار کی حالت سے بالکل جدا ہے. یعنی بہار میں ہندوؤں کی آبادی بہت ہے. اگرچہ مسلمان بھی منظم اور دولتمند ہیں لیکن پھر بھی ان لوگوں کی بڑی تعداد کے سامنے وہ منظم ہوتے جب بھی انکا مقابلہ میں ٹہرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگیا تھا. ان کی بستیاں زیادہ تر الگ ہیں، لیکن پھر بھی سبھی جگہوں میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے پڑوس میں بسے ہوئے ہیں.

کلکتہ اور نواکھالی کی خبروں نے بارود میں چنگاری کا کام کیا، کیونکہ مسلم لیگ کے ادھم اور بے لگام پرچار سے لوگ پہلے ہی عاجز تھے. پٹنہ، مونگیر اور گیا کے کچھ حصوں میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کا پورا ارادہ کرلیا. چنانچہ بہت سے مسلمان مارے گئے ان کی دولت اور گھروں کو لوٹا گیا. بنگال اور بہار کے بلوے میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ بنگالی سرکاری ملازم اور پولیس کے لوگ تقریباً الگ ہوکر بیٹھ گئے اور ہندوؤں کو خوب لٹنے اور پٹنے دیا. لیکن بہار میں گورنمنٹ اور پولیس نے بڑی تندھی کے ساتھ بلوائیوں کو روکنے کی کوشش کی. یہاں تک کہ فوج کو بھی

اس کام میں لگا دیا گیا. ہم لوگ حکومت ہند میں کام کر رہے تھے. پنڈت جواہر لال جی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، کانگریس کے صدر کرپلانی جی اور مسلم لیگ کے مرکزی وزیر اور میں سب دوڑ کر بہار پہونچے. اور وہاں فساد کو روکنے میں مستعدی سے لگ گئے. ادھر مہاتماجی نے بہار کے بلوہ کی خبر پاتے ھی بہاریوں کے نام ایك اپیل بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر بلوہ نہ رکا تو ان کو روزہ رکھنا پڑے گا. انھوں نے روزہ کی تیاری کے لئے اپنا کھانا کم کرکے بتا دیا تھا کہ ان کے روزے کی اطلاع پاتے ھی بہار گھبرا گیا اور بلوہ فساد رك گیا. بہار کے ساتھ مہاتماجی کا جو پرانا تعلق تھا اور بہار پر ان کا جو بھروسہ رھا کرتا تھا، اس کے بل پر انھوں نے روزہ کی دھمکی دی تھی. چنانچہ بہار کی جنتا نے ان کی بات سنی اور بلوہ ٹھنڈا ھوگیا. بنگال میں بھی بلوہ پھیلنے کا جو کچھ اندیشہ رہ گیا تھا وہ اس وقت تك کے لئے ختم ھوگیا.

لیکن یہ جھگڑے اسی پر طے نہیں ھوئے. مسلم لیگ پاکستان لینے پر تلی ھوئی تھی، اس کے لئے سبھی جگھوں پر بلوہ اور فساد ھونے کا اندیشہ رھتا تھا. کچھ دنوں کے بعد

پچھمی پنجاب اور صوبہ سرحد میں بھی بڑے پیمانے پر بلوے شروع ہو گئے. وہاں کے سکھ اور ہندو مارے پیٹے اور لوٹے جانے لگے. ان کی ایک بہت بڑی تعداد سنہ ۱۹٤۷ع کے مارچ اپریل میں جان بچانے کے لئے اپنا دھن دولت وہیں چھوڑ کر ہندوستان میں بھاگ آئی، اس لئے اس طرح کے جھگڑے کہیں کہیں اکثر ہوتے رہے.

پینتیسواں باب

ہندوستان کی مرکزی حکومت میں بھی کانگریس اور لیگ کی وزارت کا مل جل کر کام کرنا ناممکن تھا، وھاں بھی برابر جھگڑا ھی رھا کرتا تھا. برٹش گورنمنٹ بھی اس حالت سے مطمئن نہیں تھی، اس لئے لارڈ ویول کو واپس بلالیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے کرکے بھیجدیا گیا. لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان آتے ھی حالت کا مطالعہ کرنے لگے. تھوڑے ھی دنوں کے بعد مشورہ کے واسطے پھر لندن واپس گئے. برٹش گورنمنٹ نے ان کے تقرر وقت ھی یہ اعلان کر دیا تھا کہ سنہ ۱۹۴۸ع کے جون تک وہ سارا اختیار ہندوستان کے سپرد کر دے گی. وائسرائے کے ہندوستان واپس آنے پر اس نے ایک اور اعلان کیا، جس میں اس نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ سنہ ۱۹۴۸ع تک نہیں بلکہ سنہ ۱۹۴۷ع میں ھی ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ھاتھوں میں دے کر وہ الگ ھو جائے گی. اس کے ساتھ ھی اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ ہندوستان کے دو حصے کر دئے جائیں گے. ایک میں

سندھه، بلوچستان، صوبہ سرحد اور پنجاب کے وہ حصے
رهیں گے جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ھے. دوسرے
میں پوربی بنگال اور آسام کے ضلع سلہٹ کا وہ حصہ جہاں
جہاں مسلمانوں کی کثرت ھے. اس طرح پاکستان بنے گا
اور باقی کا سب ھندوستان ہوگا. وہ دونوں آزاد حکومتیں
هونگی، جن کی الگ الگ آئین ساز کونسلیں هونگی، جن
میں اس صوبہ کے رهنے والے هی ممبر هونگے. ان کونسلوں
کو اختیار هوگا کہ وہ اپنے لئے جیسا چاهیں قانون بنالیں.
برطانوی پارلیمنٹ نے انڈیا ایڈمنس ٹریس ایکٹ (قانون انتظام
هند) کے نام سے ایك قانون پاس کر دیا ھے، جس کے
مطابق ھندوستان کے یہ دونوں حصے الگ الگ آزاد ملك
مان لئے گئے. دونوں ملك کی کونسلوں کو اپنے طریقہ سے
آئین بنانے کا پورا پورا اختیار دے دیا گیا. اس کے ساتھ
ھی یہ بھی اختیار دیا گیا کہ اس وقت تك جو قانون جاری
ھیں، خواہ وہ پارلیمنٹ کے بنائے هوئے هوں یا ھندوستانی
کونسلوں کے، بہرحال جیسے بھی هوں، ان میں ترمیم بھی
کرسکتے ھیں. آئین ساز کونسلوں کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ

اگر وہ چاہیں تو برطانوی سامراج سے اپنے اپنے ملکوں کو پوری طور سے آزاد رکھ کر علیحدہ کرسکتے ہیں. لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس وقت لندن واپس گئے تھے اسی وقت وہ اس بٹوارے کے لئے کانگریس اور لیگ کی مرضی لیتے گئے تھے. اسی کے مطابق برٹش گورنمنٹ نے بٹوارہ منظور کرلیا تھا.

یہاں پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس بٹوارے کی ذمہ داری کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اور خاصکر ان لوگوں نے جو اس وقت ہند سرکار کے وزارتی عہدوں پر تھے اپنے اوپر لے لی. مہاتماجی نے نہ تو اس بٹوارہ کو اچھا سمجھا اور نہ کبھی اس اصول کو مانا جس کے بل پر مسلم لیگ بٹوارہ چاہتی تھی. مسلم لیگ کا یہ دعوی تھا کہ ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں اس لئے وہ کبھی ایک سرکار کے ماتحت نہیں رہ سکتے. مسلمانوں کو پوری آزادی سے اس علاقہ میں حکومت کرنے کا اختیار ہونا چاہئے جہاں وہ بڑی تعداد میں ہیں، اور ہندوؤں کو ان علاقوں میں جہاں ان کی آبادی زیادہ ہے. مہاتماجی اس دو قومی نظریہ کو نقصان دہ سمجھتے تھے اس لئے وہ اس کو نہیں مانتے تھے. لیکن جن لوگوں

نے بٹوارہ منظور کیا وہ اس وقت کی حالت سے عاجز آچکے تھے، اور وہ دیکھتے تھے کہ فساد اور بلوے ہوتے جاتے ہیں اور اسی طرح ہوتے رہیں گے. اور حکومت جس میں کانگریس بھی تھی کچھ نہیں کر پاتی تھی. کیونکہ مسلم لیگ کے وزیر سبھی جگہوں پر رکاوٹیں ڈالتے اور جو محکمے ان کے سپرد تھے ان میں وہ اپنی من مانی کرکے انکو اپنے ہاتھوں میں کرتے جا رہے تھے. خواہ اس سے سارے ملک کو نقصان ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی پرواہ نہ کرکے اپنی جماعت کو مضبوط کرتے، اور جہاں موقع ہوتا وہاں ہندوؤں کو دباتے. ان سب باتوں کی وجہ سے ایک طرحسے حکومت چلانی ناممکن ہوتی چلی جا رہی تھی. ہم نے سوچا کہ بٹوارہ ہو جانے سے کم از کم، جن حصوں میں ہمارا اختیار رہے گا ان میں، ہم جیسی چاہیں گے حکومت چلا سکیں گے. اور اس طرح حکومت کے بہت بڑے حصہ کو محفوظ اور منظم رکھ سکیں گے، جس سے ہندوستانی قوم کی مکمل خدمت ہوسکے گی. یہ صاف تھا کہ اس بٹوارے سے ہندو مسلم مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا. کیونکہ دونوں حصوں میں اقلیت کے لوگ رہ

جاتے تھے اور جو کچھ ان کے لئے کیا جاسکتا تھا وھی سارے ہندوستان کے لئے بھی کیا جاسکتا تھا. لیکن یہ بات چل نہ سکی، مجبور ھوکر بٹوارہ ماننا ھی پڑا.

مہاتماجی کو اس بات کا ڈر تھا کہ اس بٹوارے کا نتیجہ اچھا نہ ھوگا. کیونکہ جو ہندو اور سکھ کروڑوں کی تعداد میں پاکستان میں رہ جائیں گے، اور مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہندوستان میں رہ جائیں گے، ان کے ساتھ معلوم نہیں کیسا برتاؤ ھوگا. اسلئے وہ آخر تک بٹوارے کو ناپسند کرتے رھے. لیکن جب انہوں نے دیکھ لیا کہ جن لوگوں پر حکومت چلانے کا بوجھ ڈالا جا رہا ھے وھی جب محسوس کرتے ھیں کہ اب علانیہ طور پر یا تو لیگ کے ساتھ لڑائی ھو یا بٹوارہ ھو، اس وقت انہوں نے چپ رھنا ھی مناسب سمجھا اور بٹوارہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالی. جس زمانہ میں دھلی میں بٹوارہ ھو رہا ھے، یعنی گورنمنٹ ہند کی سبھی چیزوں کا بٹوارہ گورنمنٹ کے کانگریسی اور لیگی ممبر آپس میں مل کر کر رھے تھے، اس زمانہ میں مہاتماجی دھلی ھی میں تھے. ایک بٹوارہ کمیٹی مقرر کر دی گئی تھی. جس میں میں اور

سردار ولبھ بھائی پٹیل کانگریس کی طرف سے تھے. ایك ایك چیز لیکر، مثلا گورنمنٹ ھند کے لئے ھوئے یا دئے ھوئے قرض، نقدی روپے، سامان، فوج، فوجی سامان، عمارتیں، عمارتوں کا سامان، ریل وغیرہ. یہاں تك کہ میز، کرسی، ٹائپ رائٹر. اور ملازمین کا بٹوارہ بھی اس کمیٹی نے کیا.

میں جب اس کمیٹی میں کام کر رھا تھا، روزانہ مہاتماجی سے صبح ٹہلنے کے وقت ملا کرتا تھا. انھوں نے ھی کہا تھا کہ روز آجایا کرو. اس لئے مجھے موقع ملتا تھا کہ کمیٹی میں جو باتیں ھوتیں میں انہیں روزانہ بتا دیتا تھا. میں دیکھتا کہ وہ اس کے سننے سے بیچین ھوتے تھے. ساتھ ھی وہ کوئی رکاوٹ ڈالنی نہیں چاھتے تھے. وہ کہا کرتے تھے کہ دیکھو جہاں تك ھوسکے نقصان نہ ھونے پائے. ملازموں کو ھدایت دی گئی تھی کہ وہ اپنی خدمت ھندوستان یا پاکستان جس سرکار کو چاھیں دے سکتے ھیں. یہی بات فوج کے ساتھ تھی. اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ تقریباً سبھی مسلمان ملازموں نے پاکستان کی خدمت پسند کی اور دوسروں نے

هندوستان کی. اسی اصول پر زیادہ تر فوج کا بھی بٹوارہ ہوگیا. لیکن یہ بٹوارہ حکومت ہند نے اپنے ملازمین کے متعلق کیا. صوبے کی حکومتوں نے بھی، یعنی جن جن صوبوں کا بٹوارہ ہوا جیسے پنجاب بنگال اور آسام، اپنے ملازموں کا اس طرح بٹوارہ کیا. لیکن جو صوبے بٹوارے سے اچھوتے رہ گئے تھے ان میں نہ مال کا نہ سامان کا کسی قسم کا بٹوارہ ہوا اور نہ ملازمین کا. بٹوارے کا کام بڑی تیزی کے ساتھ پورا کیا گیا. ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ع سے قبل ھی یہ کام ختم ہوگیا. اگرچہ ابھی فوج کا بٹوارہ پورا نہیں ہوسکا. اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ فوج کے علاوہ اور سب جگہوں سے انگریز ہٹ کر زیادہ تر ہندوستان سے چلے گئے، ان میں سے بہت تھوڑے تھے جو رہ گئے. لیکن پاکستان میں ہندوستان کی نسبت سے ان کی تعداد زیادہ تھی. اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ھے کہ ایسے ملازمین کی اکثریت ایسی تھی جن کی ہمدردی مسلم لیگ اور پاکستان کے ساتھ تھی. فوج کا بٹوارہ ہونے پر بھی انگریز افسر پاکستان کے مقابلہ میں ہندوستان میں بہت کم رہ گئے تھے. اس طرح ملازمین کے بٹوارے کا

ایک خوفناک نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں ہندو اعلی افسر نفی کے برابر رہ گئے. وہاں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ زیادتیاں ہونے لگیں، کیونکہ وہاں ان کی بات کا پوچھنے والا کوئی نہ رہ گیا. دہلی میں بیٹھے بیٹھے بٹوارے کا کام خاموشی کے ساتھ ختم ہوا. اسی طرح لاہور اور کلکتہ میں بھی ١٥ اگست سے پہلے ہی مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کی حکومتیں کانگریسی وزارت نے اپنے ہاتھ میں لے لی. پاکستانی صوبوں میں لیگی اور ہندوستان کے صوبوں میں کانگریسی وزارت، جو پہلے سے وہاں کام کر رہی تھی، حکومت چلاتی رہی. پوربی اور پچھمی پنجاب اور پچھمی اور پوربی بنگال اور آسام کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں. اس جگہ پر ٹھیک ہندوستان و پاکستان کی سرحد ملتی ہے. یہ واضح ہونے پر بھی کچھ غیر متعین سا تھا، اس لئے پانچ آدمیوں کی کمیٹی بنی جس میں دو کانگریس کی طرف سے اور دو لیگ کی طرف سے پنچ مقرر کئے گئے. اور ان چاروں پر ایک انگریز سرپنچ شری «سر ریڈ کلف». لیکن ١٥ اگست سے پہلے یہ پنچ اپنا فیصلہ نہ دے سکے. چند دنوں کے بعد جب ان کا فیصلہ

معلوم ہوا تو یہ پتہ چلا کہ کچھ حصے ادھر سے ادھر کر دئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں اور خاصکر ان جگہوں کے لوگوں میں، جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کو ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہئے۔ لیکن پنچایت کے فیصلے کے مطابق وہ پاکستان میں ڈال دئے گئے ہیں۔ بڑا شور مچا۔

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ع کے پہلے سے ہی ہند و پاکستان کی سرحدوں پر انگریزوں کی ماتحتی میں فوج رکھی گئی تھی۔ اور یہ امید کی جاتی تھی کہ سرحد پر اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو وہ فوج جنتا کی حفاظت کریگی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب پچھمی پنجاب اور پاکستان کے دوسرے حصوں میں ہندوؤں اور سکھوں پر زیادتیاں ہوئیں اور بہت سے مارے گئے۔ اسکے بعد تقریباً سب مال و دولت لٹ گئی۔ اس وقت اس فوج سے ہندوؤں کو کوئی مدد نہ ملی۔ ادھر دھلی میں ہم لوگ ۱۵ اگست کو آزادی پانے کی دھوم میں خوشیاں منا رہے تھے۔ ادھر مغربی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کو مار کر پاکستان کو ہندوؤں سے بالکل صاف کرنے کی تدبیر ہو رہی تھی۔ اس کی خبر دھلی تک تو کچھ دیر میں پہونچی لیکن پنجاب کے

لوگوں کو جلد پتہ چل گیا. انھوں نے پوربی پنجاب اور آس پاس کے رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ بدلہ لینا شروع کیا. دھلی بھی نہ بچ سکی. تھوڑے ھی دنوں بعد وھاں بھی بڑے پیمانے پر فساد شروع ھوا. سارے بلوے اور فساد کا نتیجہ یہ ھوا کہ مغربی پاکستان سے ھندو اور سکھ بے پناہ ھوکر، اپنی ساری دولت و جائداد کو چھوڑ کر. الگ الگ منتشر جماعتوں میں پوربی پنجاب کی طرف یا اس سے اور آگے پورب میں نکل کر، اپنی جانیں بچانے کے لئے ھندوستان کی طرف چلے آئے. اسی طرح اس طرف سے مسلمان بھی پاکستان کی طرف چل پڑے.

١٥ اگست سے پہلے ھی مہاتماجی دھلی سے چلے گئے، اور نواکھالی کے راستہ میں کلکتہ میں ٹھہر گئے. وھاں بھی خوفناک فسادوں کا سامان ھوگیا تھا. مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے ھندو تیار ھوگئے. مہاتماجی نے ایسی حالت دیکھ کر وھاں ٹھہر جانا مناسب سمجھا جہاں مسلمانوں کی آبادی ھی زیادہ تھی. بہت سختی کے ساتھ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر انھوں نے بلوہ نہ ھونے دیا اور ایسی فضا پیدا کی کہ بلوہ ایک طرح

سے ناممکن سا ہوگیا. اس واقعہ کو سبھی لوگوں نے نہایت بلند آواز سے ان کی شخصیت کی ایک کرامت اور ان کی اہنسا کے جادو کے نام سے مشہور کیا. ان کی اہنسا اور ان کے مضبوط عہد نے مسلمانوں کی حفاظت کر دی. لیکن مغرب میں انسانیت سوز زیادتی ہو ہی گئی. کسی ذات کے لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ذات کے لوگ اپنے کو ان برے اعمال سے الگ رکھ سکے.

دھلی میں حالت بگڑنے کی خبر پاتے ہی مہاتماجی دھلی چلے آئے. آتے ہی یہاں بھی فساد روکنے میں پوری طاقت کے ساتھ کھڑے ہوگئے. دھلی میں یہ خبر ہوگئی تھی کہ پاکستان میں یہ سب کچھ جان بوجھ کر کرایا گیا ہے، اور پاکستان کی خواہش ہے کہ وہ دھلی میں بھی کانگریس وزارت کو برباد کرکے یہاں کے سکریٹریٹ پر قبضہ کرکے اور اسطرح سارے ہندوستان پر اپنا راج قائم کرے، اور کم سے کم ہلچل تو مچا ہی دے. ہندو اس پر تیار ہوگئے کہ اب مسلمانوں کو یہاں سے نکال دینا چاہئے. لیکن مہاتماجی نے دھلی پہونچتے ہی حالت کو سمجھ لیا جو فساد دھلی میں چل رہا تھا. ان کے

بیچ میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے کا ارادہ یا خیال چھوڑ دیا. لیکن اس سے پہلے ہی بہت سے مسلمان ملازم یا تو پاکستان چلے گئے تھے یا کسی نہ کسی طریقہ سے ہندوستان میں رہ گئے تھے. یہ سب کچھ ہونے پر بھی ہندو اور سکھ مغربی پنجاب سے بے گھر ہوکر نکل گئے. اسی طرح پوربی پنجاب اور کچھ ریاستوں سے مسلمان بھی نکل گئے.

یہ مہاتماجی کی روحانی طاقت تھی جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو مارے جانے یا نکالے جانے سے بچالیا. آپس کا نفاق اس درجہ بڑھتا گیا تھا کہ کہیں بھی کسی وجہ سے یا بغیر وجہ سے بلوہ یا فساد ہوسکتا تھا. مسلمانوں کی بھی ادھر وہی حالت ہوئی جو ہندوؤں اور سکھوں کی ادھر ہوئی.

دھلی کے کونے کونے میں فساد پھیلتا جا رہا تھا. پولیس اور فوج مستعدی سے امن قائم کرنے کے لئے متعین کر دی گئی تھی مگر بلوائیوں پر وہ قابو نہ پاسکی. پنڈت جواھر لال جی اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر خبر ملتے ہی، چاھے دن ہو یا رات، ہر جگہ دوڑ جاتے تھے. انھوں نے گورنمنٹ کی

طرف سے پولیس اور فوج کو حکم دے دیا تھا کہ بلوہ کو جلد سے جلد اور سختی سے روکا جائے. مہاتماجی نے بھی آتے ھی اپنی ساری طاقت اس میں لگا دی تھی، اس لئے تھوڑے ھی دنوں میں حالت پرامن ھو چلی تھی.

مہاتماجی ھندو اور مسلمان کو ان کی مذھبی تقسیم کے ھوتے ھوئے بھی ایك ھی قوم مانتے تھے. وہ مانتے اور کہتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہ فرض ھے کہ وہ سبھی لوگوں کو، چاھے کسی ذات کے ھوں، بچانے کی انتھك کوشش کرے، اور سب کے جان مال کی حفاظت بھی. ان کی خواھش تھی کہ اگر موقع ملے اور پاکستان سرکار منظور کرے تو وہ مغربی پاکستان کا بھی دورہ کریں گے. لیکن ان کو اس کا موقع ھی نہ ملا. گورنمنٹ نے جب یہ دیکھ لیا کہ ھندو اور سکھ پاکستان میں نہیں رہ سکتے تو اس نے پاکستانی سرکار سے مل کر اس بات کا انتظام کیا کہ دونوں طرف سے سبھی لوگوں کو چلے جانے کا موقع دیکر آسانی دی جائے اور راستہ میں بھی ان کی حفاظت کی جائے. اس طرح پچاس یا ساٹھ لاکھ کے قریب ھندو اور سکھ مغربی پاکستان سے ھندوستان چلے آئے اور

اتنے ھی مسلمان ھندوستان سے وھاں چلے گئے. یہ سب کے سب اپنی جائدادیں چھوڑ کر ھی آئے اور گئے. راستہ میں بہت سے لوگوں پر حملے بھی ہوئے اور وہ مارے اور لوٹے بھی گئے. بہت سے لوگ تو لمبے سفر کی دشواریوں کو برداشت نہ کرسکنے کی وجہ سے راستہ ھی میں چل بسے. اور بہت سے گورنمنٹ کے انتظام کے ذریعہ ریلوں میں لائے اور پہونچائے گئے. لیکن زیادہ تر لوگ اپنی اپنی گاڑیوں یا اپنے گھوڑے اور اونٹوں یا پیدل ھی سامان کے ساتھ چلے آئے، جو بچا کھچا وہ لاسکتے تھے.

ھندوؤں نے کئی کروڑ روپیہ لگا کر لاھور میں انجمنیں قائم کی تھیں، چنانچہ ان کی عمارتیں اور ان کا سامان وھیں کا وھیں رہ گیا. تعداد میں قریب قریب جتنے ھندو اور سکھ پچھم سے پورب آئے اتنے ھی مسلمان پورب سے پچھم گئے. لیکن ھندو اور سکھ بہت مالدار تھے، ان کی اپنی بڑی بڑی عمارتیں تھیں، زمینیں تھیں اور باغ وغیرہ بھی تھے. لیکن مسلمان اتنے خوشحال نہ تھے، کیونکہ ان کی نہ تو اتنی بڑی بڑی عمارتیں تھیں اور نہ اتنی زمینیں. اس کے علاوہ مغربی

پنجاب میں نہروں کی وجہ سے آبپاشی کا بڑا اچھا انتظام تھا، اسی وجہ سے وہاں کی زمین بھی بہت زرخیز ہوگئی تھی. یہ حالت پوربی پنجاب میں نہیں تھی، اس لئے مالی نقصان تو ہندوؤں نے ھی بہت اٹھایا. جو بہت ھی خوشحال تھے، وہ کسی طرح سے جان بچاکر فقیر اور مفلس بنکر ہندوستان آ گئے.

ان سب واقعات سے مہاتماجی کو بہت دکھ تھا. وہ پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ وہ اس کوشش میں ھیں کہ ایک سو چھبیس برس تک وہ زندہ رھیں. لیکن انہوں نے جب یہ واقعات دیکھے اور سنے، اس کا اثر ان پر اتنا گہرا ہوا اور ان کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ وہ یہ کہنے لگ گئے تھے کہ اس حالت کو دیکھنے کے لئے میں اب زندہ رہنا نہیں چاھتا. انکو اسکا بڑا دکھ تھا کہ اس ھولناک قتل و خون میں ہندو، مسلمان، سکھ سب کے سب شریک ھوگئے. کوئی بھی اپنے تئیں اس پاپ سے صاف نہیں رکھ سکتا. لیکن اس کے باوجود بھی وہ بالکل ناامید نہیں ھوئے تھے. وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک پاگل پن کا لمحہ ھے جو اپنے وقت پر گذر جائے اور اس وقت پھر ایک بار اسی طرح سے آپس میں مل

جل کر رہنے لگ جائیں گے جس طرح پہلے رہا کرتے تھے۔ اس قسم کی فضا کو دوبارہ پیدا کرنا وہ اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ ایسے کسی برے عمل کو پسند نہیں کرتے تھے جس سے اس فضا کے قائم ہونے میں کچھ رکاوٹ ہو۔ ان کو امید تھی کہ اگر اہنسا سے کام لیا گیا اور بدلہ نہ لینے کے جذبہ کا حوصلہ بڑھایا گیا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہندو، مسلم، سکھ دوبارہ اپنے اپنے گھروں میں جاکر بسیں گے اور اپنی بچی کھچی زمین اور جائداد پھر پاسکیں گے۔ اسی اصول کے اعتبار سے وہ ہند سرکار کو کام کرنے کا مشورہ دیتے رہے اور اچھے جذبہ کو وہ پھر سے پیدا کرنے میں مستعد رہے۔

دہلی میں فساد تو جلد ہی رک گیا لیکن فضا ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اچھا جذبہ ابھی نہیں پیدا ہوا تھا جو مہاتماجی چاہتے تھے۔ جو مسلمان وہاں سے چلے گئے تھے ان کے مکان خالی پڑے ہوئے تھے۔ اور گورنمنٹ ان کو خالی رکھے ہوئے تھی کہ ان کے مالک واپس آکر پھر یہاں بسیں گے۔ لیکن اس میں مشکلیں بہت تھیں، کیونکہ لاکھوں

ہندو اور سکھ اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ وہ بغیر گھر اور روزگار کے سڑکوں پر اور گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ اس لئے وہ یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ مکان خالی رہیں۔ بہت سی مسجدیں ایسی تھیں جن پر ہندوؤں نے قبضہ کرلیا۔ فضا پھر ایسی خراب ہوتی جا رہی تھی کہ قدم قدم پر یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پھر فساد نہ ہو جائے۔ مہاتماجی نے اس خراب فضا کو درست کرنے کیلئے روزہ شروع کر دیا۔ اور وہ روزہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو یہ امید دلا کر مطمئن نہ کر دیا کہ وہ اطمینان سے اپنے گھروں میں آ کر رہیں اور اپنی حفاظت کا بار ہم ہندوؤں اور سکھوں پر چھوڑ دیں۔ مسجدوں کا بھی تخلیہ شروع ہوگیا۔ آہستہ آہستہ بہت سی مسجدیں مسلمانوں کو واپس کر دی گئیں۔

مہاتماجی کے روزے کا یہ نتیجہ نکلا کہ فضا بالکل بدل گئی۔ جو برا جذبہ پھیل رہا تھا بڑی حد تک دور ہوگیا۔ اور مسلمانوں کو بھی اطمینان ہوگیا۔ میں اسوقت دھلی میں موجود تھا مگر بیمار تھا۔ لیکن اس کے باوجود روزے کے دنوں میں

جو کمیٹی بنی اسکا صدر لوگوں نے مجھے بنا دیا۔ اس کمیٹی کی
طرف سے جب مہاتماجی کو پوری پوری امید دلا دی گئی تو
اس وقت انھوں نے اپنا روزہ توڑا۔ اب مسلمان سمجھ گئے کہ
مہاتماجی سے بڑھکر کوئی دوسرا آدمی ان کا خیرخواہ اور
محافظ نہیں ھے۔ ان میں سے جو لوگ ان کو اپنا دشمن
سمجھتے تھے وہ بھی ان کو اب اپنا دوست سمجھنے لگے۔
سب جگھوں پر ان کی اھنسا کی طاقت خفیہ طور سے لیکن
بہت زوروں سے کام کر رھی تھی۔ اگر وہ زندہ رہ جاتے
تو اس میں شك نہیں کہ ان کو اور قوم کو ایسا دن بھی
دیکھنے کو مل جاتا کہ سبھی ھندو اور سکھ اپنے اپنے گھروں
کو واپس چلے جاتے اور پاکستان گئے ہوئے سارے مسلمان
ھندوستان آجاتے۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہیں تھا اور ۳۰
جنوری سنہ ۱۹۴۸ع کو ایك ھندو نے ان کی جان لے لی۔

چھتیسواں باب

اوپر کہا گیا ہے کہ ہم لارڈ ویول کی وزارت میں ۲ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ع کو شریک ہوئے. میرے ذمہ غذا اور زراعت کے ڈپارٹمنٹ تھے. اسوقت ملك میں غله کی بہت کمی تھی. اس بات کا خوف تھا کہ کسی نہ کسی حصہ میں زبردست کال پڑ جائے گا. جس طرح بنگال میں لاکھوں آدمی بغیر غله کے بھوکے مرگئے اسی طرح پھر ایك بار یہاں بھی بدترین حالت ہوسکتی ہے. اور سارے ملك میں کہیں کہیں غله تھا تو گورنمنٹ کی طرف سے لوگوں سے لیا جا رہا تھا. ہندوستان کے سبھی شہروں اور بہت سے گاؤں میں، خاصکر دکھن کے علاقہ میں، ہر ایك آدمی کے لئے ناپ تول کر ۵ چھٹانك یا اس سے بھی کم غله دیا جا رہا تھا. اسی طریقه کو راشننگ کہتے تھے. میں تشویش میں تھا کہ کہیں غله گھٹ نہ جائے اور لوگوں کو غله ملے ھی نہیں. اس لئے پوری قوت سے، خواہ دیسی ہو یا بدیسی، سبھی جگہوں میں غله جمع کرنے کا کام کیا جا رہا تھا. لیکن جو غله اس طرح جمع کیا جاسکتا

تھا وہ ھر ایك انسان کے لئے روزانہ پانچ چھ چھٹانك سے زیادہ نہیں ھوسکتا تھا. جہاں کے لوگ جو غلہ ھمیشہ سے کھاتے چلے آرھے تھے ان کو وھی غلہ نہیں دیا جاسکتا تھا. پہلے چاول کی اتنی کمی تھی کہ دکھن کے لوگوں کو بھی، جو چاول ھی بہت کھایا کرتے تھے، باھر سے آئی ھوئی مکا اور گیہوں دئے جانے لگے. ان لوگوں کے گھروں میں، ان غلوں کو کھانے کے قابل بنانے کے لئے، چکی، توا جیسی چیزیں نہ تو موجود تھیں اور نہ ان کے پکانے کا ڈھنگ ھی ان کو آتا تھا. کچھ دنوں بعد دھلی اور مغربی یو.پی میں بھی لوگوں کو گیہوں کے عوض چاول زیادہ دئے جانے لگے، وھی ان کو کھانے پڑے. ان کی یہ حالت تقریباً سنہ ١٩٤٦ع سے سنہ ١٩٤٧ع کے آخر تك، جب تك کہ میں وزارت میں رھا، بنی رھی. کبھی کبھی ایسا وقت بھی آیا کہ کسی مقام پر دو چار دن سے زیادہ کے لئے غلہ نہیں باقی رھا تھا. اسطرح کی خبریں ملك کے کونے کونے سے برابر آیا کرتیں اور ضرورت کے مطابق غلہ پہونچانے کی تدبیر بھی برابر ھوتی ھی رھتی.

نومبر سنہ ١٩٤٦ع میں کانگریس کا اجلاس میرٹھ میں ھوا،

جس کے صدر اچاریہ کرپلانی منتخب ہوئے۔ اب مرکز اور صوبوں میں کانگریس کی حکومت تھی، کانگریسی وزارتیں بن گئی تھیں۔ کانگریس کے اعلان کے مطابق وہ کام چلا رہے تھے۔ جیسا اوپر کہا گیا ہے۔ مرکز میں مسلم لیگ کے جھگڑے کی وجہ کوئی خاص کام ہم نہیں کر پاتے تھے۔ بٹوارے کے بعد جب ہم کچھ کرنے کے قابل ہوئے اس وقت بلوہ اور فساد کی وجہ سے کچھ نہ کرسکے۔ اس کے بعد تو لاکھوں پناہ گزینوں کے انتظام کا اتنا بڑا کام سرکار ہند کے ہاتھوں میں آیا جسے وہ آج تک پورا نہ کرسکی۔ پہلا کام تو یہ تھا کہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد حفاظت اور بہتر طریقہ سے کس طرح پچھم سے پورب لائی جائے اور پورب سے پچھم بھیجی جائے۔ اس کام کو فوج نے بڑی تندھی اور بہتر طریقہ سے پورا کیا۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاھئے کہ سبھی لوگ حفاظت سے پہونچے۔ درمیان میں قافلوں پر حملے ہو جاتے اور بہت سے مارے جاتے، اور جو کچھ تھوڑا بہت ان کے پاس ہوتا وہ لوٹ لیا جاتا۔ ریل کے مسافروں کو بھی اسی طرح لوٹ مار کا شکار بننا پڑا۔ پہلے جو لوگ آئے ان کو

چھاؤنیوں میں رکھنے اور ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا. اب آھستہ آھستہ ان کو جگہ جگہ بسانے کا کام کیا جا رہا ھے، جو ابھی پورا نہیں ھوا. گورنمنٹ اس کام کے لئے کروڑوں روپے صرف کر رھی ھے. نئے گاؤں اور نئے شہر بسائے جا رھے ھیں، لاکھوں کی تعداد میں ان کے لئے جگہ جگہ نئے مکان بنائے جا رھے ھیں، جس جگہ جو زمین خالی پڑی ھے وہ ان کو دی جا رھی ھے. لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ ھے اور زمین اتنی کم. غیر آباد زمین یا پاکستان گئے ھوئے مسلمانوں کی زمین ملا کر بھی اس زمین کے مقابلہ میں بہت کم ھوتی ھے جو ھندو اور سکھ پاکستان میں چھوڑ آئے ھیں، اسلئے ھر ایك کسان خاندان کو اس زمین کے مقابلہ میں جو اس کے پاس پہلے تھی بہت کم زمیں دی جاسکتی ھے. وہ بھی نہری زمینوں اور اس زمین کے مقابلہ میں بہت کمزور ھے جن میں دوسرے طریقوں سے آبپاشی کی جاتی ھے.

کسانوں کے علاوہ ایك بڑی تعداد اس وقت کے ھندوستان میں ایسے لوگوں کی ھے جو دوسرے روزگار کیا کرتے تھے. جیسے بیوپار، سرکاری و غیر سرکاری نوکری، کارخانوں میں

مزدوری وغیرہ۔ غلہ کا بیوپار زیادہ تر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں ہندوستان کے اس حصہ میں تھا جو پاکستان میں چلا گیا۔ ہندو اور سکھ کی دوکانیں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ ہی سامان نہیں بیچا کرتی تھیں بلکہ مسلمان بھی خریدار تھے۔ وہ لوگ وہاں چلے آئے جہاں کافی دوکاندار پہلے ہی سے موجود ہیں۔ کیونکہ ادھر بھی بہت زیادہ غلہ کا بیوپار ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ اور جو مسلمان پاکستان گئے وہ دوکاندار نہیں تھے بلکہ خریدار تھے۔ اسطرح تجارت پیشہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آ گئی ہے جو پہلے خوشحال تھے لیکن ان کو یہاں کوئی روزگار نہیں ملتا۔ اسی طرح بہت ایسے کام کرنے والے، جو زیادہ تر دیہاتی زندگی کے مسلمان تھے، ادھر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج بہت سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان آ گئی ہے جن کو کسی قسم کا دھندا یا روزگار دینا مشکل ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگوں کی تعداد وہاں چلی گئی جو مزدور تھے۔ اس کے برعکس پاکستان کو اس ہلچل سے نفع ہی نفع رہا۔ ایک تو اس کے قبضہ میں بہت اچھی زمین آ گئی۔ ادھر سے گئے ہوئے مسلمانوں ہی کو

نہیں بلکہ وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو بھی وہ تمام زمینیں بانٹ دی گئیں. اس طرح پناہ گزینوں اور بہت سے دوسروں کو بھی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اور کافی زمینیں مل گئیں. ہندوؤں کے بڑے بڑے عالیشان محل ان کے قبضہ میں آ گئے. دوکانداری اور تجارت کا نیا روزگار وہاں کے باشندوں کو، خواہ وہ پناہ گزین ہوں یا دوسرے، مل گیا. اسلئے پاکستان کی گورنمنٹ کے سامنے پناہ گزینوں کا مسئلہ بہت ھلکا اور سیدھا رھا. شاید انھوں نے پناہ گزینوں کو بسانے کا کام پورا بھی کرلیا ھے.

بٹوارے کے تھوڑے ھی دنوں کے اندر کشمیر کا بڑا مسئلہ ہندوستان کے سامنے آیا. انگریزوں نے اپنے جانے کے وقت سبھی رجواڑوں کو ان تمام معاھدوں کی شرطوں سے نجات دے دی جو دونوں کے درمیان ہوئے تھے. اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ھر ایك رجواڑے کو اس بات کی آزادی مل گئی کہ خواہ وہ پاکستان کے ساتھ رھے یا ھندوستان کے ساتھ. ١٥ اگست سنہ ١٩٤٧ع تك ھی کچھ ریاستوں کے سوا تقریباً سبھی رجواڑے جن کی ھندوستان سے حدیں ملتی تھیں

ہندوستان میں شامل ہو گئے۔ جب تک سب باتیں آئین بنانے
والی کونسل کے ذریعہ اور آپس کی گفتگو سے طے نہ ہو جاویں،
اس وقت تک کے لئے انہوں نے حکومت ہند کے ساتھ وہی
تعلق برقرار رکھنے کا عارضی صلحنامہ کرلیا جو ان کا انگریزوں
کے ساتھ تھا۔ صرف کشمیر اور حیدر آباد نے عارضی صلحنامہ
نہیں کیا۔ اور ہندوستان میں شامل نہیں ہوئے۔ کشمیر میں
ہندو مہاراج لیکن رعایا کی اکثریت مسلمان۔ حیدر آباد میں
مسلمان نظام اور رعایا کی اکثریت ہندو۔ رجواڑوں میں یہی
دو ریاستیں سب سے بڑی بھی تھیں۔ کشمیر، ہندوستان و
پاکستان دونوں کی سرحدوں سے ملا ہوا ملک اور حیدر آباد
ہندوستان کے بیچ میں ہے۔ کشمیر کے مسلمانوں میں بہت
سے ایسے تھے جو ہندو راجہ کو تو نہیں پسند کرتے ہیں
لیکن ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ حیدر آباد کے بہت
سے مسلمان اس کو ایک آزاد ملک بنا کر پاکستان کے ساتھ
اتحاد رکھنا چاہتے تھے۔ پاکستان بھی اس کی طرف لالچ کی
نگاہیں ڈال رہا تھا۔ شاید پاکستان یہ امید کرتا تھا کہ سارے
ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے میں حیدر آباد سے

اسے پوری مدد ملے گی. لیکن وہاں کی ہندو رعایا، جو ۸۰ فیصد تھی، ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی. اور دوسری چھوٹی موٹی ریاستیں بھی، جن میں کئی ایسی تھیں جو موقع ملنے پر شاید پاکستان کے ساتھ ھی رہنا پسند کرتیں، لیکن اور کچھ ایسی بھی تھیں جنہوں نے کھلے دل سے ہندوستان کے ساتھ ملنا پسند کیا.

کشمیر کے مہاراج اور کشمیر کی مسلمان رعایا کی ایک بڑی تعداد اس دبدھا میں پڑکر وقت گذار رھی تھی که ہندوستان کے ساتھ شامل ھوکر نه تو پاکستان کو ناخوش کریں اور نه پاکستان سے مل کر ہندوستان کو. یه بات پاکستان کو گوارا نہیں تھی. اس نے سرحد کے قبائلی لوگوں کو کشمیر پر چڑھائی کر دینے کے لئے ابھارا. صرف اپنے ملك سے ھوکر ان کو راسته ھی نہیں دیا بلکه ہتھیار اور فوجی مدد بھی دی. لیکن خفیه طریقه سے، تاکه وہ کشمیر پر دھاوا کرکے قبضه بھی کرلیں. حالت بہت نازك ھوگئی تھی. حمله کرنے والوں نے بہت زیادتیاں بھی کیں، جن کی وجه سے وہاں کی جنتا کو بہت تکلیف ھوئی. آخر میں جب کشمیر کی راجدھانی

سری نگر سے تھوڑی ھی دور حملہ آور رہ گئے، اسوقت مہاراج اور رعایا کے نمائندے شیخ عبداللہ دونوں نے ایک ساتھ مل کر ھندوستان کے ساتھ کشمیر کو شریک کر دینے کی تدبیر کی اور ھندوستان سے مدد بھی مانگی. سرکار ھند نے کشمیر کی اس تجویز کو منظور کرکے مدد بھیج دی. اس طرح لڑائی شروع ھوگئی. جو ابھی تک ختم نہیں ھوئی. لڑائی میں ھندوستانی فوج نے حملہ آوروں کو اور پاکستانی فوج کو کشمیر کے بہت بڑے حصہ سے نکال دیا ھے. اب وھاں ھندوستان کی طرح قومی آزادی کا کام جاری ھے. لیکن کشمیر کے کچھ اس حصہ پر جو بالکل مغربی پنجاب سے ملا ھوا ھے اور اس حصہ پر بھی جو پچھم اتر میں پہاڑی علاقہ ھے پاکستانیوں کا قبضہ بھی ھے. معاملہ یو.این.او (انجمن اقوام عالم) کے سامنے پیش ھے. ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ھوا. دونوں طرف کی فوجیں اپنی اپنی جگہوں پر سب طرح سے تیار بیٹھی ھوئی ھیں.

حیدر آباد میں مسلمانوں کی ایک جماعت بنی تھی جو اپنے تئیں رضاکار کہا کرتی تھی اور جو یہ منصوبہ رکھتی تھی کہ

دھلی کے لال قلعہ پر نظام کا آصفیہ جھنڈا لہرائیں گے.
رضا کاروں نے وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کیں.
جو مسلمان ان رضا کاروں کی مخالفت کرتے تھے اور ہندوستان
کے ساتھ مل جانے میں وہاں کی رعایا کی بھلائی سمجھتے
تھے ان کے ساتھ بھی بہت برا برتاؤ کیا گیا. جب یہ ظلم
برداشت سے باھر ہوگیا اور اسکا برا اثر ہندوستان کے دوسرے
حصوں پر بھی پڑنے لگا اس وقت ہند سرکار نے حیدر آباد
جا کر اپنا قبضہ جمالیا. رضا کار بھاگ گئے. نظام نے ہند
سرکار کو خوش آمدید کہا. اب اور راجواڑوں کی طرح
حیدر آباد بھی ہندوستان میں شامل ہوگیا.

ان سب الجھنوں اور غذا کی کمی کی مشکلات اور پناہ گزینوں
کے بسانے کے مسئلہ میں ھی اب تک گورنمنٹ ہند کی طاقت
زیادہ تر صرف ہوتی رھی اور ان کے علاوہ دوسرے معاملے
بھی ان کے سامنے تھے. یہ خدا کا کرم ھے کہ ان آفتوں کے
ہوتے ہوئے بھی ہندوستان اب تک اپنے کو بچائے رکھ
سکا ھے.

اوپر کہا جاچکا ھے کہ آئین ساز مجلس بن چکی تھی. اسکا

پہلا اجلاس یکم دسمبر سنہ ١٩٤٦ع کو ہوا تھا۔ اس کا میں ہی صدر چنا گیا تھا۔ غذائی محکمے کے کام کے ساتھ ساتھ میں یہ کام بھی کرنے لگا۔ جب بٹوارہ کونسل قائم ہوئی تو وہ کام بھی مجھے دیا گیا۔ میں کسی طرح ان کو نباھتا رہا۔ باپو کی دعا مجھے ہمیشہ ملتی رہی۔ جہاں تک اپنے ذمہ کے کام کا تعلق تھا اس سے مجھے اطمینان رہا۔

مہاتماجی کا خیال تھا کہ غلہ پر کنٹرول (پابندی) غیرضروری ھے اس لئے اسے اٹھا دینا چاھئے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے کئی بار ظاہر بھی کی۔ لیکن تقریباً ایك سال تك میں کچھ نہ کرسکا، کیونکہ حالت اتنی نازك تھی کہ اسوقت کوئی تبدیلی کرنی خطرہ سے خالی نہ تھی۔ مجھے سب باتوں کو دیکھ کر اپنی رائے قائم کرنے میں بھی وقت لگا۔ اس لئے جب سنہ ١٩٤٧ع کے شروع میں مہاتماجی نے پابندی اٹھانے کے متعلق زور دیا تو میں نے بھی ارادہ کرلیا کہ اب اسے اٹھا دینا چاھئے۔ لیکن اس میں مشکلات بہت تھیں، ایك مشکل تو یہ تھی کہ وزارت کے ہمارے ساتھیوں میں سے بہت سے متفق نہیں تھے، دوسری یہ کہ غذائی محکمے کے بڑے اور چھوٹے

ملازم تقریباً سب کے سب اس کے مخالف تھے۔ یہاں تک کہ بیشتر صوبوں کی حکومتیں بھی اس کی مخالفت کر رہی تھیں۔ اور جو مخالفت نہیں کرتی تھیں وہ صرف خاموش تھیں، علانیہ طور پر تائید نہیں کرتیں تھیں۔ میں نے پہلے غذائی تیل پر سے پابندی اٹھائی، کیونکہ بہت سی جگہوں پر تیل ملتا ھی نہیں تھا اور جو ملتا بھی تھا وہ مہنگا۔ پابندی اٹھانے کا نتیجہ یہ ھوا کہ تیل ملنے لگا۔ اگرچہ اب بھی وہ سرکاری مقررہ بھاؤ سے مہنگا پڑتا ھے لیکن پھر بھی جس بھاؤ میں وہ چور بازار میں بکا کرتا تھا اس سے بہت سستا اور سب جگہ مل جاتا ھے۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے ایک کمیٹی بنا دی تھی جو غذا کے مسئلہ پر غور کرکے گورنمنٹ کو رائے دے کہ اسے کیا کرنا چاھئے۔ اس کمیٹی کے سامنے دونوں باتیں تھیں، غذائی چیزوں کے ذخیرے اور ان کی پیداوار۔ اس میں ذخیرے کا تعلق پابندی سے تھا۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ پابندی آھستہ آھستہ اٹھائی جائے اور گورنمنٹ اپنے پاس غلہ رکھنے کا انتظام کرے، تاکہ جس جگہ غلہ کی کمی ھو، وھاں آسانی اور جلد سے جلد پہونچایا جاسکے۔ اس سفارش سے

مجھے قوت پہونچی. آخر میں وزارت نے بھی میری سفارش منظور کرلی. پابندی آہستہ آہستہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا. اس میں مجھے مہاتماجی سے مدد لینی پڑی. انھوں نے میرے کہنے سے وزارت کے لوگوں سے باتیں کیں، ان کو اپنا خیال بتلانے اور سمجھانے کی تدبیر کی. اسی طرح انھوں نے صوبائی وزیروں کی کانفرنسوں میں آئے ہوئے لوگوں سے بھی باتیں کیں اور پابندی اٹھانے پر زور دیا. میں نے پابندی اٹھانے کا ارادہ وزیر غذا کی حیثیت سے کرلیا. اب مجھے اس فیصلہ کو عمل میں لانا تھا. کہ اسی زمانہ میں مجھے اچانک اور خلاف امید وزارت سے ہٹ جانا پڑا.

اچاریہ کرپلانی جی کانگریس کے صدر تھے. لیکن گورنمنٹ کے کاموں سے ناخوش تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کی طرف سے وہ وزارت پر اتنا اثر نہیں ڈال سکتے جتنا پڑنا چاہئے. اسی لئے انھون نے اپنے عہدہ کو چھوڑنے کی خواہش کئی بار ظاہر کی. دوسرے لوگوں نے بھی ان کو سمجھا بجھا کر ایسا کرنے سے کچھ دنوں کے لئے روکے رکھا. لیکن اب ایسی حالت میں یہ بات اس حد تک پہونچ گئی

تھی کہ وہ کسی طرح رہنا نہیں چاہتے تھے. آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی دھلی میں ایک بیٹھک ہوئی. اسپیشل ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک بھی ہوئی. وھاں یہ معاملہ پیش ہوا. ایک طرح سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کا استعفاء منظور کرلینے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ھے. اس وقت یہ سوال اٹھا کہ کانگریس کا صدر کون ہو. مہاتماجی کا خیال تھا کہ سوسلشٹ (اشتراکی) جماعت کے لیڈر شری جے پرکاش ناراین یا اچاریہ نریندر دیوجی کو یہ عہدہ دیا جائے. انھوں نے جب دیکھا کہ ورکنگ کمیٹی میں اس بات پر سب ایک رائے نہیں ھیں اور کچھ لوگ اس کے سخت مخالف ھیں تو وہ خاموش ہوگئے. غرض کہ کوئی بات طے نہ ھوسکی. کانگریس ورکنگ کمیٹی برخاست ھوگئی، کیونکہ اسمبلی کے اجلاس کا وقت ھوچکا تھا اور وھاں مجھے صدارت کا کام انجام دینا تھا. وھاں بھی ایک عجیب سوال پیش تھا، جو یہ تھا کہ قانون ساز کونسل کے اصول کے مطابق اس کا صدر ھی وھاں صدر بنکر اجلاس میں بیٹھ سکتا ھے. بٹوارے کے بعد آئین ساز کونسل کے ذمہ دو بڑے کام آگئے، ایک، آئین بنانے کا

جو پہلے ھی سے ھو رھا تھا اور دوسرا یہ کہ اب وھی قانون ساز کونسل کے کام کے لئے بھی ذمہ دار بنا دی گئی. قانون ساز کونسل میں کوئی بھی وزارت کا آدمی صدارت کی جگہ نہیں لے سکتا تھا، کیونکہ اسے وزارت اور دوسرے ممبروں کے بحث مباحثہ میں غیر جانبدار ھوکر کام کرنا پڑتا ھے. اسلئے یہ ضروری ھوگیا کہ میں یا تو وزارت سے ھٹ جاؤں یا آئین ساز کونسل کی صدارت سے. لوگ چاھتے تھے کہ میں آئین ساز کونسل کا بھی صدر رھوں اور وزارت میں بھی رھوں، اس لئے اصول بدلنا ضروری ھوگیا. میں نے اپنے اختیار سے قاعدوں کو بدل دیا، جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ میں اگرچہ آئین ساز کونسل کا صدر ھوں پھر بھی جب اسکا اسمبلی کی حیثیت سے کبھی اجلاس ھو تو میں اس جگہ پر صدارت کی خدمت انجام نہ دوں، اس کے لئے صدر (اسپیکر) چن لیا جائے.

اس دن اسپیکر کے انتخاب کا کام آئین ساز کونسل کے سامنے تھا. شری ماؤلنکر صدر چنے گئے. ان کو میں نے اپنی جگہ پر بٹھا دیا. دو یا تین بیٹھکوں کے بعد ھی آل انڈیا کانگریس

کمیٹی کی بیٹھک دهلی میں سہ پہر کے وقت هونے والی تھی، جہاں اچاریہ کرپلانی کا استعفاء منظور کر کے ان کی جگہ پر صدر منتخب کرنا تھا۔ ورکنگ کمیٹی میں یہ بات طے نہیں هو پائی تھی کہ کون منتخب کیا جائے، حالانکہ اسی میں کسی نے ایک بار میرا نام بھی لیا تھا۔ اس پر نہ تو میں نے دھیان دیا تھا نہ دوسروں نے۔ میں قانون ساز کونسل میں بیٹھا هوا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ پنڈت جواهر لال جی اور سردار ولبھ بھائی مجھے بلا رهے هیں۔ میں وهاں گیا اور گفتگو هوئی۔ ان لوگوں کی رائے هوئی کہ مجھے کانگریس کی صدارت لینی چاهئے۔ میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک تو غذا اور زراعت کا کام تھا، جس میں پابندی اٹھانے کے اصولوں کو جاری کرنا تھا۔ اور دوسرا کام غذا کی پیداوار بڑھانے اور گائے کے نسل کی زیادتی و ترقی کا بھی تھا، جس میں دودھ اور اچھے بیلوں کی کمی کی وجہ سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔ یہ سب میرے هی ذمہ تھا۔ میں دن رات انہیں مسئلوں کے سلجھانے میں لگا رهتا تھا۔ ادھر آئین بنانے کا کام کم اهمیت نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ اب لیجسلیٹو اسمبلی کی صدارت

اور بٹوارہ کرنے کے کام سے فرصت مل گئی تھی، لیکن آئین کا کام کافی سخت اور مشکل تھا اور جن کے لئے کافی وقت اور محنت کی ضرورت تھی. میری تندرستی بھی ٹھیک نہیں تھی اور میں پہلے کی طرح محنت بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا. اس پر کانگریس کا بوجھ جب مجھی کو سنبھالنا پڑے تو یہ سب ناممکن معلوم ہونے لگا. میں نے کہا اگر میں کانگریس کا کام کروں تو مجھے غذا اور رسد کے محکموں سے تو ضرور نجات ملنی چاہئے. اور ممکن ھے کہ شاید مجھے آئین ساز کونسل کی بھی صدارت چھوڑنی پڑے، کیونکہ کانگریس کا کام بھی کافی مشکل تھا اور رایوں کے اختلاف کی وجہ سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا. ایسا خیال ہوا کہ کرپلانی جی کا مقام لینا ھی پڑے گا. میں انکار نہیں کرسکتا تھا. کیونکہ اسکا مطلب یہ نکلتا تھا کہ میں وزارت کو چھوڑنا نہیں چاھتا. مجھے بہت سوچنے کا وقت بھی نہیں ملا.

میں وھاں سے مہاتماجی کے پاس گیا، ان سے میں نے سب باتیں کہیں. ان کا وہ خاموشی کا دن تھا اس لئے وہ جو کچھ کہنا چاھتے تھے کاغذ کے پرزوں پر ھی لکھتے تھے. انھوں

نے لکھ کر بتایا کہ ان کو یہ تجویز پسند نہیں ھے. جب میں نے کہا کہ کانگریس کی صدارت کو منظور کرکے میں وزیر رھنا کیسے پسند کرسکتا تھا اور پسند بھی کرتا تو اسے کہتا کیسے؟ اس وقت انھوں نے میرے پس و پیش کو سمجھ لیا اور اپنی رائے نہیں بدلی. کیونکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کا وقت ھوگیا اس لئے مہاتماجی کو مجھ سے کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں ملا اور میں صدر منتخب ھوگیا. اس وقت اسے منظور کرتے ھوئے میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں وزارت کے عہدے سے الگ ھو جاؤں گا اور وھاں سے نجات پانے کے بعد میں کانگریس کا کام سنبھال لونگا. اس طرح جب تک گورنمنٹ نے دوسرا انتظام نہ کرلیا. مجھے ڈیڑھ ماہ تک وزیر رھنا پڑا. مجھے ١٤ جنوری سنہ ١٩٤٨ع کو وھاں سے نجات ملی. اس وقت سے باضابطہ میں نے کانگریس کا کام سنبھال لیا. اس کے دو ھی تین دن کے بعد مہاتماجی کا روزہ ختم ھوا. اور پندرھویں سولھویں دن ان کی شہادت ھوئی.

اس درمیان میں میری تندرستی کی وجہ سے مہاتماجی سے

جتنا میرا ساتھ رہنا چاھئے تھا وہ نہیں رہا. لیکن پھر بھی میں تقریباً روزانہ ایك بار ان کے پاس ضرور جاتا، کیونکہ تین مخصوص اور بڑے کام میرے ذمہ تھے. ایك تو ھندو اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات بڑھانے کا تھا، جس کا ذکر پہلے آچکا ھے اور جس کے لئے انھوں نے روزہ رکھا تھا. اور دوسرا کام کانگریس کے قواعد کی ترمیم کا تھا. جس کے متعلق گفتگو چل رھی تھی اور جس کے لئے کمیٹی بھی بنی تھی. کمیٹی کے ممبر غور و بحث کے لئے مہاتماجی کے پاس آیا کرتے تھے اور میں بھی ان میں شامل ھوا کرتا تھا. اسی غور و بحث کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی شہادت کے کچھ ھی گھنٹہ پہلے اپنے خیالوں کو لکھ دیا تھا. ان کا خیال تھا کہ کانگریس اب سیاسی کام سے، جس میں وہ علانیہ حصہ لیتی رھی تھی اور اپنی وزارتوں کے ذریعہ کام کرا رھی تھی، الگ ھوکر مخلوق کی خدمت کا کام کرے. مخلوق کی خدمت کے ذریعہ گورنمنٹ پر جو کچھ اثر ڈال سکتی ھے ڈالے. لیکن یہ کانگریس کے بڑے لوگوں کو پسند نہیں تھا، اسلئے اس کے قواعد میں جو ترمیم ھوئی اس کی شکل ایسی نہیں ھوئی کہ

کانگریس ایك انسانی خدمتی جماعت بن جائے. لیکن ان کی وفات کی وجه سے اس مسئله پر اور زیاده زور دینے والا بھی اب کوئی نهیں ره گیا. تیسرا کام، جس میں ان کو بهت دلچسپی تھی، هندو مسلم اتحاد کے علاوه تعمیری کام کا حوصله بڑھانا تھا. اس بات کا بهت دنوں سے چرچا هو رها تھا. خیال هوا که تعمیری کام کرنے والوں کی ایك کانفرنس سیوا گرام میں کی جائے. اس کے لئے فروری سنه ۱۹۴۸ع کے پهلے هفته کی تاریخ بھی طے هوچکی تھی. مهاتماجی کا خیال تھا که اس میں وه شریك هوں اس لئے وه وردها جانا چاهتے تھے. میں بھی کانفرنس میں شریك هونا چاهتا تھا اور دهلی کی سخت سردی سے بچنے کے لئے یوں بھی وردها جانا چاهتا تھا، جس میں ایك پنتھ دو کاج کا موقع ملے، یعنی تندرستی بھی سدهرے اور تعمیری پروگرام پر کام کرنے والوں کی کانفرنس میں شریك بھی هو سکوں.

جب هندو مسلم سوال کچھ الجھتا هوا دکھائی دیا اس وقت انھوں نے روزه رکھا تھا. اور روزه توڑنے کے بعد بھی وه چاهتے تھے که ان شرطوں کو پورا کرادیں جو روزه توڑنے کے

وقت جب لوگوں سے منظور کرائی گئی تھیں. ادھر کانفرنس کے انتظام کرنے والوں کا بہت زور تھا کہ مہاتماجی سیواگرام ضرور آئیں. مہاتماجی نے اپنی مرضی کے ساتھ مجھسے بھی یہ رائے دی تھی کہ میں وردھا جاؤں. لیکن اپنے متعلق انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اسی وقت دھلی چھوڑ سکیں گے جب مسلمان لیڈر ان کو جانے کی اجازت دیں گے. میری بات مسلمان لیڈروں سے ہوئی، انھوں نے اجازت دے دی. میں ۳۰ جنوری سنہ ۱۹٤۸ع کو بہت سویرے ہوائی جہاز سے ناگپور ہوتا ہوا وردھا کے لئے روانہ ہونے سے پہلے ھی مہاتماجی سے ملا. اور میں نے ان سے مسلمان لیڈروں کی اجازت دے دینے کی بات کہدی. انھوں نے مجھ سے وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ دو تین دن میں تعمیری کارکنون کی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے وہاں پہونچ جائیں گے. اس وقت میں آگے جا کر اپنی صحت درست کر لوں اور وہاں کا انتظام بھی دیکھوں. میں اس امید کے ساتھ دھلی سے روانہ ہوا کہ وہاں دو تین دن کے بعد محترم باپو کے درشن ضرور ہوں گے. تعمیری پروگراموں کو بھی، جو کانگریس کا

اصلی پروگرام اور بنیاد ہے، تیزی سے چلانے کی مدد ملے گی اور میں ان کی مدد سے یہ کام آگے بڑھا سکوں گا۔

میں اسی دن ڈھائی بجے کے قریب وردھا پہونچا۔ راستہ کی سردی اور تھکاوٹ سے وہاں پہونچتے ہی کچھ ہلکا سا بخار ہوگیا۔ پانچ بجے کے قریب ڈاکٹر مہادیو دیکھنے آئے۔ وہ میرا حال سن ہی رہے تھے کہ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ مہاتماجی کا انتقال ہوگیا۔ پہلے تو مجھے اس کی بات کا یقین ہی نہیں ہوا، کیونکہ مہاتماجی کو میں نو دس گھنٹہ پہلے تندرست دیکھ آیا تھا۔ لیکن خون کے دباؤ کی بیماری ان کو بہت تھی۔ اگرچہ انھوں نے احتیاط کرکے اس کو دبا دیا تھا پھر بھی مجھے یہ ڈر ہوا کہ شاید موجودہ افکار کی وجہ سے اچانک اس کی زیادتی ہوگئی ہو۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا کہ یہ خبر اسے کس سے ملی، تب اس نے کہا یہ ریڈیو میں آئی ہے۔ لیکن وہ وقت ریڈیو میں خبر آنے کا نہیں تھا، اس سے اور بھی اندیشہ ہوا۔ پھر ہم نے کہا ریڈیو لے آؤ جس میں چھ بجے خبر سن سکوں۔ دوڑ کر لوگ ریڈیو لے آئے۔ لیکن چھ بجے تک انتظار نہیں

کرنا پڑا۔ پہلے ھی معلوم ھوگیا که قدرتی موت نہیں ھوئی ھے بلکه کسی نے گولی مار دی ھے۔ رات کو پنڈت جواھر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی کے اعلانات سے سب باتیں ظاھر ھوگئیں۔ اب میں کیا وھاں رھوں یا دھلی واپس جاؤں؟ ٹیلیفون کے ذریعه سے یہاں سے دھلی ربط قائم کرنا مشکل تھا، لیکن ناگپور سے ھوسکتا تھا۔ وھاں سے پته چلا که اسی رات کو شری رام گاندھی کو لیجانے کے لئے کوئی خاص ھوائی جہاز بمبئی سے ناگپور آئے گا، میں بھی اگر چاھوں تو اس سے جاسکتا ھوں۔ اور یه بھی اطلاع ملی که میرا دھلی جانا اچھا ھوگا۔ میں رات بھر سو نه سکا۔ صبح چار بجے وردھا سے روانه ھوکر سات بجے ناگپور پہونچ گیا۔ وھاں سے شری رام گاندھی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ دھلی پہونچا۔ باپو کا درشن جلوس نکلنے سے قبل کرسکا اور راج گھاٹ کی آخری تقریر میں بھی شریك ھوسکا۔ تعمیری کام کرنے والوں کی کانفرنس کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینی پڑی۔ جو آئنده مارچ سنه ۱۹٤۸ع میں سیوا گرام میں ھوئی۔ جہاں «سر وادے سماج» کے افتتاح کا فیصله کیا گیا۔ تعمیری پروگرام پر مہاتماجی

کو بہت بھروسہ تھا، اس کے ذریعہ وہ ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالنی چاہتے تھے. اب آئندہ اسی کام میں وہ لگنے والے تھے. انھوں نے اسی وقت مجھے اس کام کے لئے دعوت دی تھی جب یہ واقعہ ہوا، جو ہندوستان کی تاریخ میں خاصکر ہندو قوم کے لئے نہ مٹنے والا کلنک کا ٹیکہ رہیگا.

اس جگہ ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے، کیونکہ ایک زبردست غلطی سے، جس کا مطلب ایک طریقہ سے سیاسی زوال ہوسکتا ہے، انھوں نے مجھے بچایا. آئین ساز کونسل کے صدر کے متعلق ایک ایسی حالت پیدا ہوگئی تھی جو مجھے بہت ہی ذلت آمیز معلوم ہوتی تھی. اس لئے میں نے سوچا کہ اس کی صدارت سے استعفاء دے دوں، یہاں تک کہ میں نے اس کا مسودہ بھی تیار کرلیا تھا. لیکن ایک ایسے مسئلہ پر اس طرح کے قدم اٹھانے سے پہلے مہاتما جی سے پوچھ لینا میرے لئے ضروری تھا. چنانچہ میں نے ان کو مسودہ بھی دکھایا. انھوں نے مسودہ کی سب باتوں کو تو پسند کیا لیکن استعفاء دینے کے خیال کو ناپسند کرکے انھوں نے کہا کہ اگر کوئی دوسرا ایسا کرتا تو میں اسے نہ روکتا

لیکن اپنی بے عزتی کی بات کو سامنے رکھ کر استعفاء دینا ٹھیک نہیں ھے جنستا کے کام میں بے عزتی بھی سہنی چاھئے. اور اس کام کو چھوڑنا نہیں چاھئے.

میں ان کی بات کو فوراً سمجھ گیا اور میں نے خیال کیا کہ حماقت میں پڑکر گر رھا تھا جس سے انھوں نے مجھے بچالیا. غرضکہ میں نے وہ کاغذ نہیں بھیجا. غالباً ان لوگوں کو، جن کی وجہ سے میں بدگمان ھوگیا تھا، اس کا آج تک پتہ نہ لگا ھوگا، اور پتہ لگنا ضروری بھی نہیں. یہاں پر میں نے اسکا ذکر صرف اس وجہ سے کیا ھے کہ قومی خادم کو خدمت کے کام میں اپنی عزت و بے عزتی کا خیال نہیں کرنا چاھئے. بلکہ اس کے سامنے صرف خدمت ھی مقصد ھونا چاھئے. ایک دوسرے دوست کو اس بات کا کچھ علم تھا. کیونکہ جب مہاتماجی سے انھوں نے ذکر کیا تو انھوں نے یہی جواب دیا کہ زھر کا پیالہ پینے والا ایک آدمی بھی تو رھے جس کو میں وہ پیالہ دے سکوں. میرے اس دوست نے اس اشارہ کو سمجھ لیا اور کچھ نہ کہا. یہ واقعہ بھی مہاتماجی کے آخری دنوں میں سے ایک دن کا ھے. اس لئے میری زندگی کے لئے یہ ایک طاقت بخش اور پھرتی دینے والی قوت رھے گا.

خاتمہ و خلاصہ کتاب

جسے ہم زندگی اور موت کہتے ہیں، اس میں مہاتماجی کچھ فرق نہیں مانتے تھے۔ روح غیر فانی ہے اور جسم بدل سکتا ہے، اس لئے مرنے سے صرف جسم ہی چھوٹتا ہے۔ اس وجہ سے وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی کو موت کا استقبال کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔ گولی لگنے کے کچھ دن پہلے دعا کے وقت، جن لوگوں نے گولی ماری انہیں میں سے کسی نے ایک زہریلی پھٹنے والی چیز کا دھڑاکا کیا تھا۔ اسی دن ان لوگوں کی تیاری تھی کہ مہاتماجی کو ختم کر دیں۔ لیکن اس بم پھٹنے سے جو ہل چل ہوسکتی تھی وہ، مہاتماجی کی پرارتھنا میں توجہ اور مصروفیت کی وجہ سے، نہ ہوسکتی تھی اور نہ ہوئی۔ ان کی اس دن کی تیاری بے نتیجہ ہوئی۔ شاید مہاتماجی کو اشارہ مل گیا تھا کہ ان کے ختم کرنے کے لئے کچھ لوگ تلے ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی، جو معمولی انتظام حفاظت کا کیا جاسکتا تھا، یعنی دعا میں شریک ہونے والے لوگوں کی تلاشی لے کے دیکھ لینا کہ ان کے پاس

کوئی ہتھیار تو نہیں ہے، یہ بھی انھوں نے نہیں کرنے دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر خدا کو میرے جسم سے کچھ اور کام لینا ہوگا تو وہ اس کی اس وقت تک حفاظت کرے گا جب تک کہ اس کو کام لینا ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی حفاظت کے لئے کوئی خاص انتظام نہ ہونے دیا۔ سب جگہ بے خوف ہوکر وہ اپنا کام کرتے ہی رہے۔ پرارتھنا کے لئے وہ جا رہے تھے۔ کہ قاتل نے بھیڑ کو چیر کر نمسکار کے بہانے سے ان کے سامنے آکر گولی مار دی۔ اور وہ یا خدا کا ورد کرتے ہوئے گرگئے۔ ان کے لئے اس سے زیادہ عمدہ اور اعلی موت نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک تو خدا میں دھیان لگائے ہوئے دعا کے مقام پر جا رہے تھے۔ گولی لگنے پر بھی ان کی زبان سے ہے رام (اے خدا) کا ہی جملہ نکلا۔ دوھا:

جنم جنم منی جتن کراھیں ٭ انت رام کہہ آوت ناھیں

(ترجمہ: رشی منی کی تو کوشش رھی یہی ہر دم
مگر زبان پہ نہ آیا «خدا» بہ آخر دم) مترجم

لیکن مہاتماجی کے منہ میں آخری لفظ خدا ہی کا آیا، اس سے بڑھکر ان کی عبادت کا کونسا اچھا پھل ہوسکتا تھا۔ گولی

بھی ایک ایسی وجہ سے ماری گئی جو ان کی زندگی کا ایک بڑا مقصد اور عہد تھا. انھوں نے ساری زندگی ھندو مسلم ایکتا کے لئے کوشش کی تھی. جب وقت آیا تو مسلمانوں کی حفاظت کے لئے انھوں نے جان کی پرواہ نہ کرکے اپنی ساری طاقت اھنسا کی عزت رکھنے میں لگا دی. جو ان کی زندگی کا مقصد تھا. لهذا وہ خوشی سے گولی کا نشانہ بن گئے.

ان کی موت کی خبر سن کر سارا ملک سناٹے میں آکر بے چین ھوگیا. جو مسلمان ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، وہ بھی سمجھ گئے کہ ان سے بڑھکر کوئی ان کا دوست نہیں ھوسکتا تھا. جسم سے وہ چلے گئے لیکن ان کی نہ مرنے والی روح اپنا کام کر رھی ھے. اب وقت آ گیا تھا کہ ساری دنیا ان کی بات کو سمجھتی، اور ان کے صحیح اھنسا کے اصول کو اختیار کرنے کے لئے اسے دعوت دی جاسکتی تھی. لیکن شاید خدا نے یہ سمجھا کہ روح کو یہ دعوت روح کی طرف سے ملے. یہی ھو بھی رھا ھے. آج اگرچہ دنیا کے سبھی ملک، یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کا ھندوستان بھی، ان کے مقلدین کی حکومت میں ھتھیاروں کا سہارا لے رھے ھیں اور

جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں، پھر بھی دلوں کی گہری ٹٹول سبھی جگہ ہو رہی ہے. سب لوگوں کا دھیان ہتھیاروں کے بےکار اور اھنسا کے باکار ہونے کی طرف جا رہا ہے. روح روح کو پکار رہی ہے. مہاتما گاندھی مرکر بھی ساری دنیا کو زندہ کرنے کے لئے بہتر کام میں مصروف ہیں.

ہندستانیوں کا ایک بڑا فرض ہے. اور وہ یہ کہ مہاتماجی کے ادھورے کام کو وہ پورا کریں. سچائی اور اھنسا کے احترام کے لئے سماج کی تنظیم ایسی ہونی چاھئے جس میں تشدد کرنے والوں کو کم سے کم بڑھنے کا موقع اور عدم تشدد والوں کو مدد ملے. ایسا سماج جبھی بن سکتا ہے کہ جب ہر ایک شخص اپنی زندگی کو ان اصولوں پر ڈھالنا اپنا مقصد مان لے اور اس تدبیر میں لگ جائے. اس لئے مہاتماجی نے گیارہ عہدوں کی تفصیل بیان کر دی تھی، جنہیں دعا کے وقت وہ برابر دھرایا کرتے تھے، وہ عہد یہ ہیں:

"۱- اھنسا ۲- سچائی ۳- جھوٹ ۴- ترک لذات ۵- نفاق ۶- جسمانی محنت ۷- عدم ذائقہ ۸- روحانی ترقی ۹- سب مذھبوں کا ایک ماننا ۱۰- سودیشی ۱۱- اچھوت جذبہ". یہ

زیادہ تر وهی فرض اور اصول هیں جو همارے شاستروں میں بتائے گئے هیں. اس میں وقت اور حالت کا لحاظ کرکے کچھ باتیں زیادہ کی گئی هیں. ان عہدوں کی تفصیل یا تفسیر مہاتماجی نے خود «منگل پربهات» نامی کتاب میں کر دی هے. ان کی تفصیل لفظی اور منطقی نہیں هے بلکه ذاتی تجربه کی بنیاد پر هے، اور ان کی ساری زندگی کے مجموعه کا نچوڑ هے اور انسانیت کے لئے شمع راہ هے. اگر لوگ ان عہدوں کے ماننے والے هوں تو ان کی جماعت بهی، جسے سماج کہتے هیں، انہیں اصولوں کی پابند رهے گی.

انسانوں کو بغیر ان اصولوں کے کبهی سچا سکھ نہیں مل سکتا. جس حد تک هم اپنے اور سماج کے تئیں ان کے مطابق بنا سکتے هیں اسی حد تک هم سکھ میں رہ سکتے هیں، سماج کو آرام مل سکتا هے. لیکن آج سائنس کی چیزوں کے کارناموں نے همیں چکا چوندھ میں ڈال دیا هے. هم ایسا سمجهنے لگے هیں که انسان جیسے قادر مطلق هے. اسے قدرت سے صرف مقابله هی نہیں کرنا هے بلکه قدرت پر فتح بهی پانا هے اور وہ پا سکتا هے. هم یه بهول جاتے هیں که جیسے هم قدرت

پر فتح پانا سمجھتے ہیں وہ قدرت کے قاعدوں کو جان کر ان کے مطابق صرف عمل ہی کرتا ہے۔ یا قدرت کے مطابق اپنے کو صرف بنانا، اس پر فتح پانا نہیں ہے۔

ہمیں دکھ اس بات کا ہے کہ جن اصولوں کی بنا پر گاندھی جی نے اپنی ساری زندگی گزاری اور ہندوستان کو بھی انہیں اصولوں پر ڈھالنے کی تدبیر کی اور ساری دنیا کو ڈھالنے کی خواہش اور امید کرتے رہے، ان اصولوں کو یا تو ہم نہیں سمجھ پائے، یا سمجھ کر ان کو اپنانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے تھے اور جان بوجھ کر انہیں چھوڑ رہے ہیں۔ آج کے ہم ہندوستانی گاندھی جی کے اصولوں پر، جو ہمارے ملک کے ہی پرانے اصول ہیں بلکہ اصولوں کے سرتاج ہیں، نہیں چل رہے ہیں۔ ہم بھی اوروں کی نقل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اعتدال اور پابندی کو، جو ان اصولوں کی جڑ ہیں، ہم چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اور گمراہی میں پڑکر فضول چیزوں کی طرف بھاگتے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ حالت مجبور کرکے ہم کو پھر اس راستہ پر لائے گی۔

ہندوستان آزاد ہوگیا۔ وہ جیسا چاہے اپنے تئیں بنا سکتا

ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے. ہماری آنکھوں کے سامنے دوسرے ملک ہیں، خاصکر یورپ امریکہ. ہم مانتے ہیں کہ وہاں کے لوگ بہت آرام سے ہیں، کیونکہ ان کی آمدنی ہمارے ملک کے لوگوں کی آمدنی سے بہت زیادہ ہے. ان کے پاس آرام دہ زندگی کے ظاہری سامان بہت ہیں. ایسے سامانوں کے مہیا کرنے کی طاقت وہ آئے دن بڑھاتے جارہے ہیں. ہم ان چیزوں کو دیکھ کر اس جہالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم بھی اپنے ملک کو کسی طرح اس قابل بنا دیں کہ یہ بھی اس کے مقابلہ میں آجائے. یہی ہماری کوشش ہے. یہ مثل سچ ہے • بھوکا بھگت اللہ والا نہیں ہوسکتا • مہاتماجی کہا کرتے تھے کہ جس کے پاس کھانے کو روٹی بھی نہیں ہے اسے بڑے بڑے اصول نہیں بتائے جاسکتے ہیں. بھوکے کے لئے خدا روٹی کی شکل میں آسکتا ہے. اس لئے جسمانی زندگی کے لئے کچھ سامان ضروری ہے لیکن اس کیلئے ایک پابندی ہے. جب ہم اس پابندی کو چھوڑ دیتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ چیزوں کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، اس وقت ہم مقصد کو چھوڑ کر سامان کے غلام بن جاتے ہیں.

اس لئے ہمارے سماج کی تنظیم ایسی ہونی چاہئے جس میں
عیش و خوشی تو رہے لیکن ہم اس عیش کے غلام نہ بنیں.
عیش کرتے ہوئے بھی ہم عیش کو ترک ہی کرتے رہیں.
«ایشوب نیشد» کے پہلے ہی منتر میں کہا گیا ہے کہ ترک میں
ہی عیش سمجھیں یا ترک کے جذبہ کو اختیار کرکے ہی عیش
کریں. آج کی دنیا کی سماجی تنظیم اس جذبے سے دور ہٹ
کر اور عیش ہی کو مقصد مان کر بنی ہے. ہم بھی اسی طرف
کھینچے جا رہے ہیں. گاندھی جی نے اپنے عہدوں کے ذریعہ
اس سچے جذبہ کو بیدار کرنیکی تدبیر کی بھی. لیکن اب ہم
فکر میں دن رات لگے رہتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کی طرح
ہمیں بھی آرام دہ زندگی کی ظاہری چیزوں پر اختیار ملنا چاہئے،
چاہے ہم مزدوری کرتے ہوئے اپنی شخصی مزدوری بڑھانے کی
تدبیر کرتے ہوں یا ہندوستان کو دوسرے ملکوں کی برابری
میں لانے کی تدبیر میں ہوں. دونوں میں اصولا ایک ہی جذبہ
کام کررہا ہے. اور وہ ہے ظاہری چیزوں پر بھروسہ. انہیں
کے ذریعہ سے آرام کے اصول کی امید اور ان کی غیر موجودگی
سے ہی دکھ کا تجربہ کرتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ ہر ایک

شخص اپنے سکھ کے سامان جمع کرنے میں لگا ھوا ھے. ایسا کرنے میں وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اسکی تدبیر کا نتیجہ دوسروں پر کیا ھوتا ھے. ایك شخص یا کوئی ملك یا کوئی سماج یا کوئی قوم اپنے آرام کے لئے دوسروں کے سکھ دکھ کی پرواہ نہ کرکے چاھے جس طرح سے ھو اپنے سکھ کا سامان جمع ھی کرتا رھے، وہ خواہ نقب زنی، یا چور بازاری سے ھو یا دوسروں کو ستا کر یا دوسروں کو چوس کرکے ھو، خواہ لوٹ اور چوری سے ھو. کہیں زبردست آدمی کمزور کو دبا رھا ھے تو کہیں زبردست ملك کمزور ملك پر اختیار جمانے کی تاك میں ھے. ھمیں اپنا رخ بدلنا ھوگا اور آرام کے لئے ظاھری چیزوں پر منحصر نہ رہ کر سکھ کو اپنے اندر سے ھی تلاش کرنا ھوگا. اس کا مطلب ظاھری چیزوں کی توھین نہیں ھے. ان پر اختیار اور وہ اختیار، ایك ظاھری چیز کا دوسری ظاھری چیز کے ذریعہ نہیں، بلکہ اپنی پرھیزگاری اور قاعدوں کے ذریعہ سے ھے.

ھم مذھبی اور پرانی کتابوں میں اولیاء یارشی، دیوتا، فرشتہ اور اوتاروں کی تعریفیں کرتے ھیں. ان سے اپنی زندگی کیلئے

بہت کچھ پاتے اور سیکھتے ھیں. جو کوئی ان کی بتائی
ہوئی پرہیزگاریوں اور اعمالوں کو جتنا زیادہ اپنے لئے
اختیار کرتا ھے اس کی زندگی اتنی ھی ترقی کرتی ھے اور ورشن
ہوتی جاتی ھے. اس طرح کی طاقتیں دنیا میں بہت کم دیکھی
جاتی ھیں. اس لئے ان کو ان لکھی ہوئی اور سنی ہوئی باتوں
پر ھی بھروسہ کرکے اپنی زندگی کو ڈھالنے کی تدبیر کرنی پڑتی ھے.
لیکن اگر کسی ایسی طاقت سے ھمارا ربط ھو جائے تو اس
سے بڑھکر دوسری خوش نصیبی انسان کے لئے نہیں ھوسکتی
ھے. مہاتماجی ایسی ھی طاقت والوں میں سے تھے جن
کے دیدار (درشن) اور ملاقات کی خوش نصیبی ھندوستان کے
کروڑوں آدمیوں کو حاصل ہوتی تھی. پچھلے تیس بتیس
سال میں انھوں نے ھمالیہ سے لیکر راس کماری تک اور کوھاٹ
سے لیکر کامکش تک کئی بار دورہ کیا، لا تعداد لوگوں کو اپنے
درشنوں سے فائدہ پہونچایا. ان کی جاترائیں (دورے) مقصد
پورا کرنے کے لئے ھی ھوا کرتی تھیں، صرف دل بہلانے یا
ملک دیکھنے کے لئے نہیں. اسکا مقصد یہ تھا کہ اس محکوم
اور غلام ملک کو جگائیں. یہاں کے مردہ جسموں میں روح

پھونکنی تھی . مردہ دلوں میں نیا جوش اور نئے حوصلے پیدا کرنے تھے ، لوگوں کے کردار کو مضبوط اور مستحکم بنانا تھا . انھوں نے دیکھا کہ یہ کام اسی وقت ھوسکے گا جبکہ ملک والوں کی آنکھیں کھلیں گی ، وہ بیدار ھوکر بے خوف ھو جائیں گے ، اپنے تئیں پہچاننے لگیں گے . اس لئے انھوں نے انھیں جگایا ، بے خوف بنایا ، اپنی طاقت کا پہچاننا سکھایا .

وہ دکھنی افریقہ سے لوٹ کر ھندوستان آئے . وھاں انھوں نے ھندوستانیوں کی تکلیفوں اور ذلتوں کو دور کرنے کے لئے ستیہ گرہ کے ناقابل شکست ھتھیاروں کو ایجاد کیا تھا . اس ملک کی بری حالت ، محکومیت اور بد اعمالیوں کو دور کرنے کے لئے انھوں نے اسی ھتھیار کا استعمال لوگوں کو بہت بڑے پیمانے پر سکھایا . یہ ستیہ گرہ کیا ھے ؟ اسکا مطلب یہ ھے کہ سچائی کا پابند رھنا ، یعنی سچائی کو دل سے ، زبان سے اور عمل سے قائم رکھنا . اگر کوئی انسان خود اس کو قائم رکھنے کی تدبیر میں دوسرے کو ڈرا کر ، دبا کر یا طاقت سے اس کی سچائی میں رکاوٹ ڈالتا ھے تو کیا وہ سچ کا پابند کہا جاسکتا ھے ؟ ھرگز نہیں . سچ کی پابندی کا مطلب سچا کردار

اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک انسان نہ صرف اپنی زندگی ہی میں سچائی کا پابند ہو بلکہ دوسرے کو بھی اسکی پابندی میں مدد دے۔ یعنی سچے عمل میں رکاوٹ نہ ہو. یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ انسان سچے کردار کا خود پابند ہو اور دوسرے بھی اس کی پابندی کریں. اسلئے سچائی کی پابندی میں دوسرے پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا. اگر ہم کو کسی بات سے تکلیف ہوتی ہے تو ہم کو ماننا ہی پڑے گا کہ دوسروں کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے تو وہ بھی اس کا احساس کریں گے. اس لئے کوئی ایسا کام جس سے ہم کو روحانی یا جسمانی تکلیف پہونچتی ہو وہ ہم دوسروں کے لئے بھی نہ کریں. یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اہنسا کی حقیقت یہی ہے۔ ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے دوسروں کو کسی قسم کی تکلیف پہونچے. اس طرح سچ کی پابندی بغیر اہنسا کے ناممکن ہے. مہاتماجی نے سچ اور اہنسا دونوں کو اپنی زندگی کا اصول بنایا تھا. جو صرف منہ سے ہی نہیں بلکہ اپنی ساری زندگی کے ہر ایک کام سے انھوں نے اس کا سبق ہندوستانیوں اور ہر ایک انسان کو سکھایا. اگر سچا کردار

اھنسا کے بغیر ناممکن ھے تو دونوں کا تعلق ٹوٹ نہیں سکتا، اس لئے گاندھی جی نے دونوں کو ایک بتایا ھے اور اھنسا کو سچائی میں موجود پایا. خدا سچ ھے. اسے سب ھی مانتے اور کہتے چلے آئے ھیں. لیکن گاندھی جی نے خدا کو جاننے اور پہچاننے کا صرف ایک ھی راستہ بتلایا اور وہ سچائی کا راستہ ھے. وہ ھمیشہ کہا کرتے تھے کہ عبادت اور معبود میں فرق نہیں ھوتا. اس لئے انھوں نے خدا کو ھی سچ نہیں مانا بلکہ سچ ھی کو خدا کہہ دیا.

بزرگ لوگ بڑے بڑے اصولوں کو بہت آسان بنا کر عام لوگوں کے لئے فائدہ مند کر دیتے ھیں. مہاتماجی نے اس ایک چیز کو لیکر ھماری ساری زندگی کی موج کو بدل دینے کی تدبیر کی. سچ اور اھنسا کی پابندی کے لئے انسان کو سب قسم کی آزادی ھونی چاھئے. اگر وہ کسی قسم کے دباؤ اور بندھن میں ھے تو وہ ان کی پابندی نہیں کرسکتا. وہ بندھن کئی قسم کے ھوسکتے ھیں، کچھ تو ایسے ھیں جن کو انسان خود پیدا کرتا ھے. اگر وہ چاھے تو اپنی تدبیر کے ذریعہ ان سے چھٹکارہ پاسکتا ھے. کچھ لوگ ایسے ھیں جو خود

ان کی پابندی نہ کرکے دوسروں کو بھی ان کی حقارت کیلئے مجبور کرتے ھیں. یا کہیں کہیں حالت ھی ایسی ھو جاتی ھے، خواہ وہ انسان کے کرنے سے ھو یا کسی دوسری طرح سے، کہ انسان کو آزاد نہیں رھنے دیتی. ان سب بندھنوں سے چھٹکارا پانا انسان کے لئے ضروری ھے. جہاں تک وہ ان سے چھٹکارا پاتا ھے وھیں تک وہ سچے مذھب کی پابندی کر سکتا ھے. جو انسان اپنی ضرورتوں کو بیحد بڑھاتا جاتا ھے، وہ اپنے اوپر بندھنوں کی کڑیاں اور مضبوط کرتا جاتا ھے. اس لئے سچی آزادی کے لئے اپنی ضرورتوں کو کم کرنا چاھئے.

دنیا میں جس قدر جھگڑے انسانوں اور جماعتوں میں آج تک ھوئے ھیں اور ھوتے ھیں، وہ اسی وجہ سے ھوتے ھیں کہ ایک آدمی کی ضرورتیں دوسرے آدمی کی ضرورتوں سے ٹکراتی ھیں. دونوں کے لئے چونکہ وہ چیز کافی مہیا نہیں کی جاسکتی ھے اس لئے ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں قوت استعمال کرنی پڑتی ھے، تاکہ اس کو وہ چیز مل سکے، چاھے دوسرا اس سے محروم ھی کیوں نہ ھو جائے. اس طرح سچ

کی پابندی کے لئے دنیا کے تعلقات سے لاپرواہ ہو جانا ضروری ہوتا ہے. اگر انسان یہ سمجھ لے کہ ہماری ضرورتیں ہمارے لئے اتنی ہی ضروری ہیں جتنی دوسروں کی دوسروں کے لئے، تو وہ اپنے کو بھی آزاد بنا سکتا ہے. اور دوسروں کو بھی آزاد چھوڑ سکتا ہے. اس طرح جتنے ہمارے بنیادی فرائض سمجھے جاتے ہیں، اگر خیال کرکے دیکھا جائے تو ان سب کا شمول سچ کی پابندی ہی میں ہو جاتا ہے. کیا ایك انسان دوسرے کی آزادی چھین کر خود آزاد رہ سکتا ہے؟ کیا وہ جس کو خود فرض سمجھتا ہے اسکو دوسروں پر زبردستی لاد کر خود مذہبی رہ سکتا ہے؟ کیا جھوٹ کی زندگی گذارتے ہوئے دوسروں میں سچا کردار پیدا کرسکتا ہے؟ یا اگر واقعی وہ خود سچا عمل کرتا ہے تو کیا دوسروں کو جھوٹ کے عمل پر بھی مجبور کرسکتا ہے؟ کیا وہ بے خوفی سے سچے کردار کا پابند ہوسکتا ہے؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ «نہیں». گاندھی جی نے انہیں باتوں کو، جن کو سبھی مذہبوں نے سکھایا ہے، ہمارے سامنے پھر سے عملی شکل میں پیش کیا.

انھوں نے، ہم کو شخصی سماجی اور قومی آزادی دلانے کی کوشش کرکے، ہم کو سکھایا کہ شخصی، سماجی اور قومی زندگی میں کوئی فرق نہیں ھے. اس لئے جو کچھ ایک شخص کیلئے مضر یا برا ھے وہ سماج اور قوم کے لئے بھی برا ھے. اگر ہم شخصی زندگی اور شخصی نفع کے لئے جھوٹ کے طریقہ کو برا سمجھتے ھیں تو سماج اور قوم کا بھی جھوٹ کے ذریعہ سے بھلا نہیں ھوسکتا. اس لئے جس طرح ھماری انفرادی زندگی میں «کہنا کچھ اور کرنا کچھ» برا مانا جاتا ھے اسی طرح وہ قوم کے لئے بھی برا مانا جاتا ھے. برا طریقہ قومی زندگی میں اتنا ھی نقصان دہ ثابت ھوگا جتنا انفرادی زندگی میں ھوتا ھے. اسی لئے انھوں نے یہ کہا تھا کہ سچ اور اھنسا کو چھوڑ کر اگر ھمیں سواراج ملے بھی تو وہ ھمارے لئے بیکار ھوگا.

اس لئے سوراج کے حصول میں بھی سچ اور اھنسا کو بنیاد مان کر کوشش کرنی فائدہ مند ھے. اگر ھمارا عمل ٹھیک نہیں ھے تو ھماری عبادت بھی ٹھیک نہ ھوگی. ہم یہ اکثر سنتے ھیں کہ اگر ہمارا مقصد اچھا ھے تو اسکے حصول

کے لئے ہم ہر بات کر سکتے ہیں. یہاں تک کہ اگر اس میں
غیر مناسب کام بھی کرنا پڑے تو مقصد کے خیال سے وہ اگرچہ
پسند کے قابل نہیں ہے لیکن قابل معافی ضرور ہے.
گاندھی جی نے نامناسب بیوہار کو ہمیشہ غلط بتایا. کیونکہ
اس سے ایک تو کبھی سچی کامیابی نہیں ہو سکتی. اور اگر
کامیابی کی قسم کی کوئی چیز نظر بھی آئی تو وہ اس مقصد کی
کامیابی نہیں ہو سکتی. کیونکہ عمل کی وجہ سے وہ مقصد ہی
بدل جاتا ہے. اس لئے انھوں نے سچ اور اہنسا کی پابندی
ہر حالت میں اور ہر موقع کے لئے ضروری اور لازمی بتائی.
جب تک ہم دوسروں کو آزاد رہنے کے لئے نہ چھوڑ دیں
اس وقت تک ہم اپنے تئیں آزاد نہیں بنا سکتے. حالانکہ ایسے
ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کے لوگ مختلف زبانیں بولیں
اور جہاں مختلف ذاتیں بھی بستی ہوں، ان میں سے ہر ایک کا
فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا ہی مذہب اور
خیال، نیز اپنی ہی ذات اور زبان قبول کرنے پر مجبور نہ کریں.
اس کے معنی یہ ہیں کہ سبھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسا
برتاؤ کریں جس میں سب لوگ اپنی خواہش اور مرضی کے

مطابق اپنے مذہب کی پابندی کرسکیں اور اپنی اپنی زبان کو ترقی بھی دے سکیں۔ فرقہ وارانہ جھگڑے ذاتی جھگڑے کی طرح ھی سے دباؤ ڈالنے سے ھوا کرتے ھیں۔ انھوں نے سب مذھب والوں کو ایك دوسرے کے ساتھ، یہاں تك کہ ھر انسان کو ھر انسان کے ساتھ، برابری کے برتاؤ کے لئے پوری قوت سے آمادہ کیا۔ یہاں تك کہ آخر میں اسی کی خاطر ان کو اپنا جسم بھی چھوڑنا پڑا۔

ان کی نیکی کو سامنے رکھ کر ھم سب ان کے بتائے ھوئے اصولوں کی پابندی کے لئے اپنے دلوں کو ٹٹولیں، اور ان سے پوچھیں کہ آیا ھم دوسرے کے بارے میں پریم کا جذبہ رکھتے ھیں یا نفرت کا؟ کیا ھم جو کچھ کر رھے ھیں وہ شرمناك خیال سے صرف اپنے لئے کر رھے ھیں، یا کم سے کم اس سے دوسروں کو بھی نقصان پہونچ رھا ھے یا نہیں؟ کیا ھمارا کام ایسا ھے جس کو ھم علانیہ طور پر کرسکتے ھیں؟ یا اس میں کوئی ایسی بات بھی ھے کہ دنیا کی شرم یا خوف کی وجہ سے ھمارے لئے اسکا چھپانا ضروری ھے، کیا ھمارے سامنے ملك کی محبت ھے یا صرف ذاتی فائدہ؟ کیا ھم اپنی زندگی کو

سدھار رہے ھیں یا بگاڑ رہے ھیں؟ گاندھی جی کی ترازو پر ہم اپنے تئیں تلوانے کے لئے تیار ھیں یا نہیں؟ کیا دوسرے مذھب والوں کو ہم ان کے مذھب پر چلنے دینے کے لئے تیار ھیں یا نہیں؟ خفیہ یا علانیہ طور پر ان کے ساتھ زبردستی کرکے ان کی اپنی خواھش کے مطابق ان کو چلانا چاھتے ھیں یا نہیں؟ کیا ہم واقعی سچ اور اھمسا کی پابندی کر رہے ھیں یا نہیں؟

آج ہم اپنی زندگی جبھی مفید بنا سکتے ھیں جبکہ ہم اپنے دل کے ھر کونے کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ اس میں کہیں گاندھی جی کی تعلیم کے خلاف کوئی چھپی ہوئی گمراھی تو نہیں کام کر رھی ھے؟

علی گڈھ

مورخہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۵۰ع

روز سہ شنبہ

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٤	١	تائـ	تائید
١٦	١١	موٹی	کونٹی
١٧	٩	ے	کے
١٨	١٢	برج پرشاد	برج کشور پرشاد
٤٦	٨	کرنا چاھتے	کرنا نہیں چاھتے
٤٧	٣	کی	تھی
٥٠	٤	بونہی	یونہی
٥٠	١٥	زوکو	رولو
٥١	١١	تك	تك کو
٥٨	٦	برانی	برائی
٥٩	٤	ملك	قانون
٦٢	٥	درگاه	دُرگا
٦٣	٣	ھی	بھی
"	١١	اعلانیه	علانیه
"	١١	ظلم و	ظلم اور
٦٤	٣	رعایا	رعایا نے
٦٩	٢	اینڈریوز	چارلی اینڈریوز
٧١	١	"	"
٧٤	٢	بہترے	بہتیرے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١٧٧	١٤	اگر کوئی پہنچا	کوئی پہنچتا
١٨١	١٦	کر سکتا	کہہ سکتا ،
١٨٢	٩	مونٹینگ	مانٹیگو
١٨٥	آخری	پہ	پر
١٨٦	١٤	حوصلے	حوصلوں
١٨٧	٩	کچھ	جو
"	٩	کھلوانے	کھلوانے ھیں
١٨٤	١٤	کاوبار	کاروبار
١٩٥	آخری	جوان	جوان اور
١٩٦	١	اعلانیہ	علانیہ
"	١٣	"	"
١٩٨	١	مسلمانوں	مسلمانوں نے
"	٣	ھوتے	ھوئے
٢٠٠	٤	گئے تھے	گئے
"	٥	سوچ کر	سوچ کر کہ
٢٠٢	١	کب کرنا	کب کیا کرنا
"	٩	وعدہ خلافی سے	وعدہ خلافی نے
٢٠٤	١٠	لیگ انڈیا	ینگ انڈیا
٢٠٥	١	اس کے	ان کے
٢٠٦	١٠	سجدانند	سچدانند
"	١١	بہت دل	دل
"	١٢	بھی	دی
٢٠٨	١٥	بنایا	بنا

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۰۹	۱۳	هو گیا	هو گیا که
۲٦۳ کے بعد صفحه نمبر ۳٦٤، ۳٦٥، ۳٦٦			۲٦٤، ۲٦٥، ۲٦٦
۲۷۸	۹	رنگ آئنگر	رنگا آئنگر
۲۸٤	٦	آنکھ	آنکھیں
۲۹٦	۹	همارے	همارا
۳۰۸	۹	جیسے کے	جیسا که
۳۱۰	۱۰	میں اور	میں
۳۱٤	۱٥	وجه	وجه سے
۳۱٥	۹	پرواه	پروا
۳۲۰	۱٤	"	"
۳۲۹	٥	کپڑے	کپڑا
۳۲۹	٦	بکری بڑھانے کے لئے اور پرچار کے خیال سے . . . . تیار هوتا تھا	—
"	۱۲	کتائی	کتائی
۳۳۰	۲	هوتی	هوتی تھی
"	٤	کافی و	کافی اور
۳۳۲ الف	۱۲	اعلانیه	علانیه
۳۳۳	۳	دات	ذات
۳۳٤ الف	۱٤	هوتی تھیں	هوتی هیں
۳۳٥ الف	۱٥	عورتیں	عورتوں
۳۳۷	۲	بےکالی	بے باکی
۳٤٤	۹	دستور	دستور تیار
۳٥٤	۳	چلاتیں	چلاتی

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٣٦١	١٠	پهندیوں	پهونگیوں
٣٦٦	٨	بعد جین دهرم کے	—
٣٦٧	١١	پهندیوں	پهونگیوں
٣٦٨	٧	طور	طور پر
٣٧٥	١٤	کیا	کیا که
٣٨٢	٩	آراز	آواز
٣٨٣	٤	اگر هزار	هزار
٣٨٦	٨	سڑك	سڑك پر
٣٨٧	آخری	نوجوان	نوجوانوں
٣٨٩	١٠	چاهیں	چاهے
٣٩٠	آخری	چهوڑے	چهوڑیں
٣٩٢	٩	داڑهی	ڈاڑهی
٣٩٣	١٠	نوجوان	نوجوانوں
٤٠٧	٧	چلاتے هوتے	چلاتے هوے
٤١٧	٦	میرا مقدمه دهلی میں هوا	—
٤٢١	٦	پرواه	پروا
٤٢٢	٣	وه نہیں	نہیں
٤٤٩	٤	کرنے لگے	کرنے گئے
٤٥٣	٧	ڈالتے	ٹالتے
«	٨	پیش هوا	پیش آیا
٤٥٧	٨	اس پر که	اس پر مصر تھے که
«	١٠	کیونکه	چونکه
٤٥٨	٦	کی حالت	حالت

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٤٦٥	۹	افرادی	انفرادی
٤٦٧	۳	ایسی	ایسی هی
٤٧١	١٥	طے کریں گے	کریں گے
٤٧٢	۲	لوگ هی	لوگ
"	٦	مدعی علیه	مدعا علیه
٤٨٢	١٣	تهیں	هیں
٤٨٤	۹	اتنی	اتنی هی
"	١٤	پا جائے گی	پا جائے گا
"	آخری	پرواه	پروا
٤٨٥	١٣	حکومت	حکومت کے
٤٨٦	آخری	کئے هوا تها	کئے هوے تها
٤٨٧	١١	مشهور	مسموم
٤٨٨	١٥	وه همیشه	همیشه
"	آخری	وه	تو
٤٩٣	١٥	کرگے	کرگهے
٤٩٤	٦	کارگاه	کرگهے
٤٩٥	٧	"	"
٤٩٨	۹	ونیز	نیز
"	۲	تهی	هے
٥٠٢	۹	اور	تو
٥٠٣	٧	اپنا	اپنی
٥٠٤	٤	ونوبا بهاو	ونوبا بهاوے
٥١٣	١٣	بات	بات هے

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٥١٦	آخری	کرتی	کرتی ہے
٥١٧	٥	تو بھی	—
٥٢١	٣	قائم کر کے وہ ایك	قائم کیا اور
»	٤	پیشه	پیشوں
»	١٥	طرح سے	طرح کا
»	١٦	اس وقت تك	—
٥٢٣	٢	رہتے ہیں	رہتے تھے
»	١٥	اس استعمال کا نتیجه	اور اس کا استعمال
٥٢٨	٢	سکتی ہے	سکتی ہیں
٥٢٩	١٢	بڑھ جاتا	بڑھا دیتی
»	١٥	آ کھاتا	آتا کھا
٥٣١	٦	تھی	ہے
٥٣٢	١	چاول آٹے	چاول کے آٹے
»	٨	جو ایك	ایك
»	٩	دھوئے	ہوئے
»	١٥	گڑ اور چینی	گڑ سے چینی
٥٣٥	١٣	دنٹھل	ڈنٹھل
٥٣٦	٤	ہوتا ہے	ہونا ہے
٥٣٩	٩	ملے گا	ہونگے
»	١٦	پڑتا تھا	پڑتا
٥٤٠	٢	اور	—
»	٣	تو	اور
٥٤٢	٧	ہو جاتی	ہوتی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٥٤٣	١٢	سکتا تھا	سکتا ہے
"	"	ساتھ	ساتھ ہی
٥٤٤	٣	ہوتے ہوئے	جوتے ہوئے
٥٥٣	٢	ان کے	اس کے
٥٥٤	٣	گاؤں	جگہ دی جائے
"	٥	شاید	بھی
٥٥٥	٤	جاتی	گئی
٥٦٤	٥	لگے گا	لگے
"	١٣	جائیں گے	جائیں
٥٦٥	١	ہو جائے	ہو جائے گی
٥٦٦	١٢	کہ بہتر	بہتر
٥٦٧	١	غذائیں	غذائی
٥٧١	١١	بڑھاوے	بڑھانے
٥٨٠	٩	چبھے،	چبھے ہوئے،
٥٨١	٦	شاشتری	شاستری
٥٨١	١٦	قدموں پر	قدموں میں
٥٨٧	١٦	لا پرواہی	بے پروائی
٥٩٢	١٠	افظ کا	لفظ کی
"	١١	پروگرام کا	پروگرام کی
٥٩٦	١٠	بے بنیادی	بے بنیاد
٥٩٧	٩	تگنے	تگنے ہیں
٥٩٨	١	بہت جھوٹے	بہت سے جھوٹے
٥٩٩	٩	مسلمانوں کی	مسلمانوں کو،

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٥٩٩	١٢	اقلیت ھی	اقلیت
٦٠٣	١٥	چاھتی ھے	چاھتی تھی
٦٠٥	٣	علاوہ اور	علاوہ
٦٠٦	٦	چہاں	جہاں
٦٠٨	١٠	کیونکہ	چونکہ
٦١٣	٥	نہیں تھا	نہیں
٦٢٠	١٦	کر لیا تھا	کر لیا
٦٢٤	١٤	لگائے	لگاتے
٦٢٩	٨	بجھ	کچھ
٦٣١	آخری	برطانوی	برطانوی حکومت
٦٣٣	٧	کہا	کہنا
"	"	اگر	اگرچہ
٦٣٥	٨	جٹیوں	جیٹیوں
٦٣٨	١٠	نہیں دی	نہیں تھی
٦٣٩	آخری	بہ	یہ
٦٤٢	١٢	جیل کے	جیل سے
٦٤٣	٦	جائےگا	جانے لگا
"	٦	بیمار ھی تھی	بیمار تھا
٦٥٠	١٤	اپنی	اتنی
٦٥٣	٣	باتوں	ناموں
٦٥٦	١٦	پرواہ	پروا
٦٥٨	آخری	ووکنے	روکنے
٦٥٩	٨	تھا کہ	تھا

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٦٦١	٩	تقرر	تقرر کے
٦٦٢	٩	ایڈمنس ٹریس ایکٹ	ایڈ منسٹریشن ایکٹ
"	١٠	کر دیا ہے	کر دیا
٦٦٤	٨	پرواہ	پروا
"	١٢	ان میں	ان میں تو
٦٦٥	١٤	ہو رہا ہے	ہو رہا تھا
٦٦٧	٤	اس طرح	اسی طرح
"	١٤	ایسے ملازمین	انگریز ملازمین
٦٦٨	٧	لے لی	لے لیں
٦٦٩	١٢	گئی	گیا
٦٧١	١٣	قبضه کر کے	قبضه کر لے
"	١٤	اور	ورنه
٦٧٥	آخری	جائے	جائے گا
٦٨١	٥	وجه	وجه سے
٦٨٧	٩	کچھ	—
"	١٢	قبضه بھی ہے	قبضه ہے
٦٨٨	١٤	بھی ان	بھی اس
٦٩١	١٥	دوسرے	مگر دوسرے
"	"	نے بھی	نے
٦٩٦	١٦	ہوئی	ہو گئی
٦٩٩	١	وقت جب	وقت
٧٠٠	١	بنیاد ہے	بنیاد ہیں
٧٠١	١٦	سروادے	سروودے

صفحه	سطر	غلط	صحیح
٧٠٤	١٤	پرواه	پروا
٧٠٦	٤	"	"
"	١٢	جا سکتی تھا	جا سکتی
٧٠٧	٧	وه پورا	پورا
"	١٥	جھوٹ	جھوٹ نه بولنا
٧٠٩	٢	کرتا ھے	ھے
"	٩	رکھتے تھے	رکھتے ھیں
٧١٢	٣	پرواه	پروا
"	٥	"	"
"	٧	کر کے ھو	کر، ھو
"	١٦	یا رشی	رشی
٧١٣	٣	ورشن	روشن
٧١٨	١	لا پرواه	بے پروا
٧٢٢	٦	اھمسا	اھنسا

اشاریہ

الف

ب

پ

ت

ج

چ